مدیراعلیٰ : سردار محمود
مدیر : سردار طاہر محمود
نائب مدیران : تسنیم طاہر
ارم طارق
ربیعہ شہزاد
عاصمہ راشد
مدیرہ خصوصی : فوزیہ شفیق
قانونی مشیر : سردار طارق محمود (ایڈووکیٹ)
آرٹ اینڈ ڈیزائن : کاشف گوربجہ
اشتہارات : خالدہ جیلانی
0300-2447249
برائے لاہور : افراز علی نازش
0300-4214400
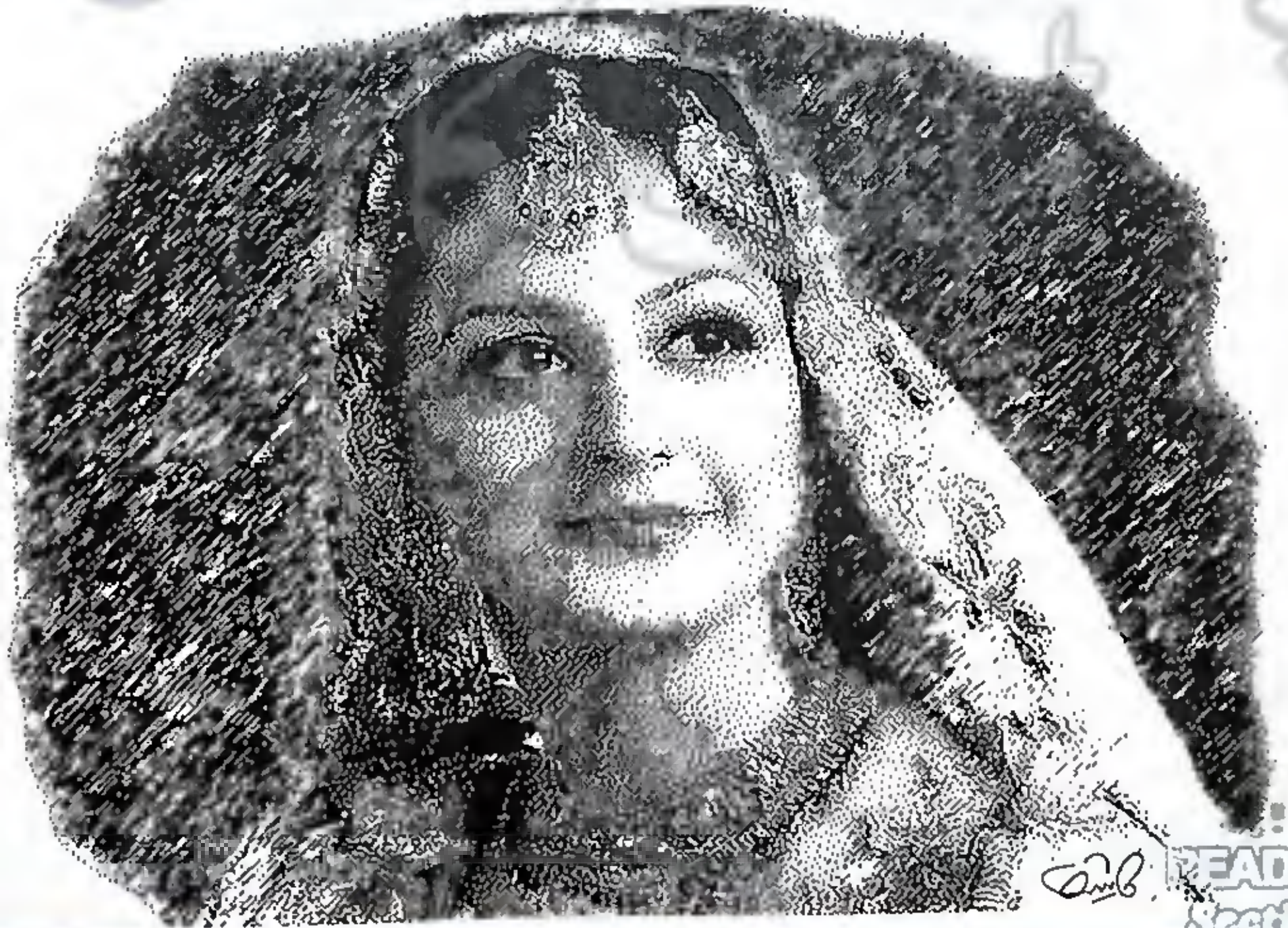
ہر گھر کے لیے

جلد 37 شمارہ 12
دسمبر 2015ء
قیمت -/60 روپے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامیات

انشاء نامہ

افسانے

انٹرویو

سلسلے وار ناول

مکمل ناول

ناولٹ

سردار طاہر محمود نے نواز پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ حنا 205 سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا۔
خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ، **ماھنامہ حنا** پہلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرکلر روڈ
اردو بازار لاہور فون: 042-37321690, 042-37310797 ای میل ایڈریس،
monthlyhina@hotmail.com, monthlyhina@yahoo.com

مستقل
سلسلے

☆☆☆

قارئین کرام! دسمبر 2015ء کا شمارہ پیش خدمت ہے۔

اسلام امن وسلامتی کا دین ہے۔ اس میں اپنے پرائے، مرد، عورت، معاشرے کے ہر طبقے کے حقوق کا نہ صرف اقرار کیا گیا ہے بلکہ ان کی ادائیگی پر زور بھی دیا گیا۔ ان حقوق کو حقوق العباد کہتے ہیں اور ان کی ادائیگی کو عبادت کا درجہ دیا گیا ہے۔ انسان اپنی ابتدا سے ہی اپنی بقاء کے لئے دوسروں کی مدد پر انحصار کرتا ہے۔ ماں باپ سے لے کر عزیز واقارب، ہمسائے اردگرد اور دنیا میں رہنے والے تمام لوگوں کے ساتھ باہمی تعلقات نسل انسانی کی بقاء کی ضمانت ہیں۔ اسلام کی تعلیم ہے کہ اگر ہم اپنے عزیزوں کے حقوق ادا کرتے ہیں تو اس کے ساتھ غیروں کے حقوق بھی ادا کریں۔ حقوق العباد میں سب سے پہلے والدین کے حقوق کا درجہ آتا ہے پھر ان سے متعلق اعزہ واقارب کے حقوق کا درجہ ہے اس کے بعد جیسے جیسے انسانی معاشرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ ویسے ویسے انسانی تعلقات وسیع ہوتے جاتے ہیں اور دنیا میں موجود تمام مخلوقات سے اس کے خوشگوار تعلقات کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہر ایک کے لئے کم از کم حق جو اللہ کے رسولؐ نے بتایا ہے وہ میٹھا بول ہے۔ آپؐ نے تمام انسانوں کی بہتری اور بقاء کے لئے اپنے کردار سے ایسا نمونہ پیش کیا ہے جو تا قیامت نسل انسانی کی رہبری کرتا رہے گا۔ آپ کو دونوں جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کوئی بھی طبقہ آپ کی توجہ اور حسن سلوک سے محروم نہ تھا۔ آپ سب سے پہلے خود حقوق العباد ادا کرتے اور پھر دوسروں کو ان کی تاکید کرتے۔ ہم آپ کے اُمتی ہیں۔ آپؐ کے اسوہ حسنہ کی پیروی ہمارے لئے لازم ہے۔ آیئے دعا کریں کہ ہم اپنے کردار سے ایسا نمونہ پیش کریں تاکہ مسلمانوں کو دہشت گرد کہنے والوں کے منہ بند ہو جائیں گے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں نیک نیتی سے حقوق العباد کی ادائیگی کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

سالگرہ اور سال نو:۔ جنوری کا شمارہ حسب سابق ''سال نو'' اور ''سالگرہ نمبر'' ہوگا مصنفین سے گزارش ہے کہ اپنی تحریریں دس دسمبر تک بھیج دیں تاکہ جنوری کے شمارے میں شائع ہوسکیں۔

اس شمارے میں:۔ ایک دن حنا کے ساتھ میں مہمان فرزانہ حبیب، صاعقہ عاطف اور سعدیہ عابد کے مکمل ناول، فرح طاہر اور مبشرہ ناز کے ناولٹ، سباس گل، شبانہ شوکت، سونیا چوہدری، عالی ناز اور سیما بنت عاصم، اُم مریم، سدرۃ المنتہیٰ اور نایاب جیلانی کے سلسلے وار ناولوں کے علاوہ حنا کے سبھی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی آرا کا منتظر
سردار محمود

میں نے تری آنکھوں میں پڑھا اللہ ہی اللہ
سب بھول گیا یاد رہا اللہ ہی اللہ

پھول میں بسی چاندنی راتوں کی نمازیں
خوشبو ہی ستاروں کی دعا اللہ ہی اللہ

پیڑوں کی صفیں پاک فرشتوں کی قطاریں
خاموش پہاڑوں کی ندا اللہ ہی اللہ

بادل کی عبادت ہے برستا ہوا پانی
آنسو کی غزل حمد و ثنا اللہ ہی اللہ

بشیر بدر

تو جو اللہ کا محبوب ہوا خوب ہوا
یا نبیؐ خوب ہوا خوب ہوا خوب ہوا

شب معراج یہ کہتے تھے فرشتے باہم
سخن طالب و مطلوب ہوا خوب ہوا

اے شہنشاہ رسل فخر رسل ختم رسل
خوب سے خوب خوش اسلوب ہوا خوب ہوا

فخر آدم کو نہ ہوتا جو فرشتہ ہوا
بنی آدم سے جو منسوب ہوا خوب ہوا

داغ ہے روز قیامت مری شام اس کے ساتھ
میں گناہوں سے جو محجوب ہوا خوب ہوا

داغ دہلوی

سید اختر ناز

جب برائی زیادہ ہو جائے

ام المومنین زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیند سے جاگے اور فرمایا۔

''لا الہ الا اللہ خرابی ہے عرب کی اس آفت سے جو نزدیک ہے آج یاجوج اور ماجوج کی آڑ اتنی کھل گئی۔''

اور (راوی حدیث) سفیان نے دس کا ہندسہ بنایا، (یعنی انگوٹھے اور کلمہ کی انگلی سے حلقہ بنایا)

میں نے عرض کیا ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کیا ہم تباہ ہو جائیں گے، ایسی حالت میں جب ہم میں نیک لوگ موجود ہوں گے؟''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''جب برائی زیادہ ہو گی۔'' (یعنی فسق و فجور یا زنا یا اولاد زنا یا معاصی)

(صحیح مسلم)

فتنوں کا نزول

سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ کے محلوں میں سے ایک محل پر چڑھے پھر فرمایا۔

''تم دیکھتے ہو جو میں دیکھتا ہوں؟ بے شک میں تمہارے گھروں میں فتنوں کی جگہیں اس طرح دیکھتا ہوں جیسے بارش کے گرنے کی جگہوں کو۔'' (یعنی بہت ہوں گے بوندوں کی طرح مراد جمل اور صفین اور فتنۂ عثمان اور شہادت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے سوا بہت سے فساد جو مسلمانوں میں ہوئے)

(صحیح مسلم)

فتنوں کا بیان

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے کہا۔

''تم میں سے کس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فتنوں کا ذکر کرتے ہوئے سنا ہے؟''

بعض لوگوں نے کہا کہ۔

''ہاں ہم نے سنا ہے۔''

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔

''شاید تم فتنوں سے وہ فتنے سمجھے ہو جو آدمی کو اس کے گھر بار اور مال اور ہمسائے میں ہوتے ہیں۔''

تو انہوں نے کہا کہ۔

''ہاں۔''

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ ''ان فتنوں کا کفارہ تو نماز اور روزے اور زکوۃ سے ہو جاتا ہے لیکن تم میں سے ان فتنوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کس نے سنا ہے جو دریا کی موجوں کی طرح امڈ کر آئیں گے؟''

سیدنا حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ

لوگ خاموش ہو گئے، میں نے کہا کہ میں نے سنا ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔

''تو نے سنا ہے تیرا باپ بہت اچھا تھا۔''

سیدنا حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ۔

''فتنے دلوں پر ایسے آئیں گے ایک کے بعد ایک، ایک کے بعد ایک جیسے بوریئے کی تیلیاں ایک کے بعد ایک ہوتی ہیں پھر جس دل میں فتنہ رچ جائے گا اس میں ایک کالا داغ پیدا ہو گا اور جو دل اس کو نہ مانے گا تو اس میں ایک سفید نورانی دھبہ ہو گا یہاں تک کہ اسی طرح کالے اور سفید دھبے ہوتے ہوتے دو قسم کے دل ہو جائیں گے، ایک تو خالص سفید دل چکنے پتھر کی طرح جس کو کوئی فتنہ نقصان نہ پہنچائے گا جب تک کہ آسمان و زمین قائم رہیں، دوسرے کالا سفیدی مائل یا الٹے کوزے کی طرح جو نہ کسی اچھی بات کو اچھی سمجھے گا، نہ بری بات کو بری مگر وہی جو اس کے دل میں بیٹھ جائے۔''

سیدنا حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ پھر میں نے سیدنا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث بیان کی کہ۔

''تمہارے اور اس فتنے کے درمیان میں ایک دروازہ ہے جو بند ہے مگر نزدیک ہے کہ وہ ٹوٹ جائے۔''

(صحیح مسلم)

شیطان کا فتنہ ڈالنا

سیدنا جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ۔

''ابلیس اپنا تخت پانی پر رکھتا ہے پھر اپنے لشکروں کو دنیا میں فساد کرنے کو بھیجتا ہے، پس اس سے مرتبہ میں زیادہ قریب وہ ہوتا ہے کہ جو بڑا فساد ڈالے، کوئی شیطان ان میں سے آکر کہتا ہے کہ میں نے فلاں فلاں کام کیا، (یعنی فلاں سے چوری کرائی، فلاں کو شراب پلوائی) تو شیطان کہتا ہے کہ تو نے کچھ بھی نہیں کیا، پھر کوئی آکر کہتا ہے کہ میں فلاں کو نہ چھوڑا یہاں تک کہ اس میں اور اس کی بیوی میں جدائی کرا دی تو اس کو اپنے پاس کر لیتا ہے کہ ہاں تو نے بڑا کام کیا ہے۔'' اعمش نے کہا کہ۔

''اس کو چمٹا لیتا ہے۔''

(صحیح مسلم)

فتنے مشرق کی طرف سے ہوں گے

سیدنا سالم بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ وہ کہتے تھے۔

''اے عراق والو! میں تم سے چھوٹے گناہ نہیں پوچھتا، نہ اس کو پوچھتا ہوں جو کبیرہ گناہ کرتا ہو، میں نے اپنے والد سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا، وہ کہتے تھے۔

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ فتنہ ادھر سے آئے گا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے مشرق کی طرف اشارہ کیا جہاں شیطان کے دونوں سینگ نکلتے ہیں اور تم ایک دوسرے کی گردن مارتے ہو (حالانکہ مومن کی گردن مارنا کتنا بڑا گناہ ہے) اور موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی قوم کا ایک شخص مارا تھا اور وہ غلطی سے مارا تھا (نہ بہ نیت، قتل کیونکہ گھونسے سے آدمی نہیں مرتا) اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ۔

''تم نے ایک خون کیا پھر ہم نے تجھے غم

سے نجات دی اور تجھ کو آزمایا جیسا آزمایا تھا (طہ ۴۰)"

قیصر اور کسریٰ کے خزانے

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
"جب کسریٰ (ایران کا بادشاہ) مر گیا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہ ہو گا اور جب قیصر (روم کا بادشاہ) مر جائے گا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہ ہو گا، (اور یہ دونوں ملک مسلمان فتح کر لیں گے) قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ ان دونوں کے خزانے اللہ کی راہ میں خرچ کیے جائیں گے۔"

(صحیح مسلم)

امت کی تباہی

سیدنا ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
"اللہ تعالیٰ نے میرے لئے زمین کو لپیٹ لیا (یعنی سب زمین کو لپیٹ کر میرے سامنے کر دیا) تو میں نے اس کا مشرق اور مغرب دیکھا اور میری حکومت وہاں تک پہنچے گی جہاں تک زمین مجھے دکھلائی گئی اور مجھے دو خزانے ملے ایک سرخ اور سفید اور میں نے اپنے رب سے دعا کی کہ میری امت کو عام قحط سے ہلاک نہ کرے اور ان پر کوئی غیر دشمن ایسا غالب نہ کرے کہ ان کا جتھا ٹوٹ جائے اور ان کی جڑ کٹ جائے، (یعنی بالکل نیست و نابود ہو جائیں)
میرے پروردگار نے فرمایا۔
"اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! جب میں کوئی حکم دیتا ہوں پھر وہ نہیں پلٹتا اور میں نے تیری یہ دعائیں قبول کیں اور تیری امت کو عام قحط سے ہلاک نہ کروں گا نہ ان پر کوئی غیر دشمن جو ان میں سے نہ ہو ایسا غالب کروں گا جو ان کی جڑ کاٹ دے، اگرچہ زمین کے تمام لوگ (مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لئے) اکٹھے ہو جائیں، (مگر ان کو تباہ نہ کر سکیں گے) یہاں تک کہ خود مسلمان ایک دوسرے کو ہلاک کریں گے اور ایک دوسرے کو قید کریں گے۔"

(صحیح مسلم)

تم اگلی امتوں کی راہوں پر چلو گے

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
"البتہ تم اگلی امتوں کی راہوں (یعنی گناہوں میں اور دین کی مخالفت میں) پر چلو گے (نہ یہ کہ کفر اختیار کرو گے) بالشت برابر بالشت کے اور ہاتھ برابر ہاتھ کے، یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے سوراخ میں گھسے تو تم بھی گھسو گے۔"
ہم نے عرض کیا۔
"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اگلی امتوں سے مراد یہودی اور نصاری ہیں؟"
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ (اگر یہ نہیں تو) اور کون ہیں؟"

(صحیح مسلم)

قریش تباہ کرے گا

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
"لوگوں کو قریش میں سے یہ خاندان (یعنی بنی امیہ) ہلاک کرے گا۔"
صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔
"پھر ہمیں کیا حکم ہوتا ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ۔
''اگر لوگ ان سے الگ رہیں تو بہتر ہے۔''

(صحیح مسلم)

فتنے میں حصہ لینا

سیدنا ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''بے شک کئی فتنے ہوں گے، خبردار ہو، وہاں کئی فتنے ہوں گے، بیٹھنے والا ان میں سے چلنے والے (لوگوں سے) سے بہتر ہو گا اور بھاگنے والے (لوگوں سے) چلنے والا بہتر ہو گا، خبردار رہو، جب فتنہ اور فساد اترے یا واقع ہو تو جس کے اونٹ ہوں، وہ اپنے اونٹوں میں جا ملے اور جس کی بکریاں ہوں وہ اپنی بکریوں میں جا ملے اور جس کی (کھیتی کی) زمین ہو، وہ اپنی زمین میں جا رہے۔''
ایک شخص نے کہا۔
''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! جس کے اونٹ نہ ہوں اور نہ بکریاں اور نہ زمین ہو وہ کیا کرے۔''
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''وہ اپنی تلوار اٹھائے اور پتھر سے اس کی باڑھ کو کوٹ ڈالے، (یعنی لڑنے کی کوئی چیز باقی نہ رکھے جو لڑائی کا حوصلہ ہو) پھر اپنے بچاؤ میں جتنی ہو سکے جلدی کرے، الٰہی! میں نے تیرا حکم پہنچا دیا، الٰہی میں نے تیرا حکم پہنچا دیا، الٰہی میں نے تیرا حکم پہنچا دیا۔''
ایک شخص بولا۔
''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! بتلایئے کہ اگر مجھ پر زبردستی کریں یہاں تک کہ مجھے دو صفوں میں سے یا دو گروہوں میں سے ایک لے جائیں پھر وہاں کوئی مجھے تلوار مارے، یا تیر آئے اور مجھے قتل کرے؟''
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''وہ اپنا اور تیرا گناہ سمیٹ لے گا اور دوزخ میں جائے گا۔''

(صحیح مسلم)

مسلمانوں کی لڑائی

سیدنا احنف بن قیس کہتے ہیں۔
''میں اس ارادہ سے نکلا کہ اس شخص کا شریک ہوں گا (یعنی سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سیدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقابلے میں شریک ہوں گا) راہ میں مجھ سے سیدنا ابو بکر ملے کہنے لگے کہ۔
''اے احنف تم کہاں جاتے ہو؟''
میں نے کہا۔
''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچازاد بھائی کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔''
سیدنا ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔
''اے احنف! تم لوٹ جاؤ، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ جب دو مسلمان اپنی تلوارے لے کر لڑیں تو مارنے والا اور جو مارا جائے دونوں جہنمی ہیں۔''
میں نے عرض کیا یا کسی اور نے کہا کہ۔
''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! قاتل تو جہنم میں جائے گا لیکن مقتول کیوں جائے گا؟''
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ۔
''وہ بھی تو اپنے ساتھی کے قتل کا ارادہ رکھتا تھا۔''

(صحیح مسلم)

دو مسلمان گروہوں میں لڑائی

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''قیامت قائم نہ ہو گی یہاں تک کہ (مسلمانوں کے) دو بڑے بڑے گروہ لڑیں گے، ان میں بڑی لڑائی ہو گی اور دونوں کا دعویٰ ایک ہو گا۔'' (یعنی دونوں کا دین ایک ہو گا اور دونوں یہ دعویٰ کریں گے کہ ہم اللہ کے دین کے لئے لڑتے ہیں۔'')

(صحیح مسلم)

فتنہ کا بیان

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، دنیا فنا نہ ہو گی یہاں تک کہ آدمی قبر پر گزرے گا پھر اس پر لیٹے گا اور کہے گا کاش میں اس قبر والا ہوتا اور اس کے ساتھ دین نہ ہو گا مگر بلا......''

(صحیح مسلم)

ہرج کا بیان

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ۔
''قیامت قائم نہ ہو گی یہاں تک کہ ہرج بہت ہو گا۔''
لوگوں نے عرض کیا۔
''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہرج کیا ہے؟''
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''قتل، قتل'' (یعنی خون بہت ہوں گے)
(صحیح مسلم)

قاتل و مقتول کا بیان

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ۔
''قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ دنیا ختم نہ ہو گی یہاں تک کہ لوگوں پر ایک دن آئے گا کہ مارنے والا یہ نہ جانتا ہو گا کہ اس نے کیوں مارا اور جو مارا جائے گا وہ نہ جانے گا کہ کیوں مارا گیا؟''
لوگوں نے کہا۔
''یہ کیسے ہو گا؟''
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''کشت و خون ہو گا، قاتل اور مقتول دونوں جہنمی ہیں۔''

(صحیح مسلم)

زمین حجاز کی آگ

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''قیامت قائم نہ ہو گی یہاں تک کہ ایک آگ حجاز کے ملک سے نکلے گی اور وہ بصرہ کے اونٹوں کی گردنوں کو روشن کر دے گی۔'' (یعنی اس کی روشنی ایسی تیز ہو گی کہ عرب سے شام تک پہنچے گی، حجاز مکہ اور مدینہ کا ملک اور بصرہ ایک شہر کا نام ہے)

(صحیح مسلم)

☆☆☆

ابن انشا

راہوں میں پتھر
جلسوں میں پتھر
سینوں میں پتھر
عقلوں پہ پتھر
آستانوں پہ پتھر
دیوانوں پہ پتھر
پتھر ہی پتھر

یہ زمانہ پتھر کا زمانہ کہلاتا ہے۔

دیگیں ہی دیگیں
چمچے ہی چمچے
سکے ہی سکے
پیسے ہی پیسے
سونا ہی سونا
چاندی ہی چاندی

یہ زمانہ دھات کا زمانہ کہلاتا ہے۔
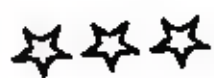
لوگ سونے چاندی کو زنجیریں بناتے ہیں
ہمیں اور آپ کو پہناتے ہیں
ہم اور آپ پہن کر خوش رہتے ہیں
بلکہ تھینک یو بھی کہتے ہیں

ایک اور زمانہ ہے آئرن ایج

یعنی لوہے کا زمانہ
لوہا وہ دھات ہے
جس کا سب لوہا مانتے ہیں
ہل کا پھل بھی لوہا
کارخانے کی کل بھی لوہا
لوہا مقناطیس بن جاتا ہے
تو چاندی تک کو کھینچ لاتا ہے
سو سنار کی ایک لوہار کی
سونے والے لوہے والوں سے ڈرتے ہیں
لیکن کوئی کہاں تک رکوائے گا
ہمارے ہاں بھی لوہے کا زمانہ آئے گا
کچا لوہا اور کسی کام نہیں
بس اس سے آدمی بناتے ہیں
جو مرد آہن کہلاتے ہیں
ان کو زنگ لگ جاتا ہے

بلکہ کھا جاتا ہے
پھر بھی لوگ گھوڑے پر سے اٹھالاتے ہیں
زندہ باد کے نعروں سے جلاتے ہیں

....

یہ اور دور ہے
لوگ ننگے گھومتے ہیں
کاغذ کا آدمی
کاغذ کے جنگل
کاغذ کے شیر
ذرا نم ہو تو سب کے سب ڈھیر
کاغذ کے نوٹ
کاغذ کے ووٹ
کاغذ کا ایمان
کاغذ کا مسلمان
کاغذ کے اخبار
اور کاغذ ہی کے کالم نگار
یہ سارا کاغذ کا دور ہے

ننگے ناچتے ہیں
ننگے کلبوں میں جاتے ہیں
ایک دوسرے کو جلسوں میں ننگا کرتے ہیں
عوام تک کے کپڑے اتار لیتے ہیں
بلکہ کھال کھینچ لیتے ہیں
کھالوں سے زرمبادلہ کماتے ہیں
گوشت کچا کھا جاتے ہیں
نہ چولھا ہے نہ تیغ ہے
یہ زمانہ قبل از تاریخ ہے

ملاوٹ کی صنعت
رشوت کی صنعت
کرسی کی صنعت
پگڑی کی صنعت
حلوے کی صنعت
مانڈے کی صنعت
بیانوں اور نعروں کی صنعت
تعویذوں اور گنڈوں کی صنعت
یہ ہمارے ہاں کا صنعتی دور ہے

کاغذ کے کپڑے
کاغذ کے مکان
اب اس آخری دور کو دیکھیے
پیٹ روٹی سے خالی
جیب پیسے سے خالی
باتیں بصیرت سے خالی
وعدے حقیقت سے خالی
دل درد سے خالی
دماغ عقل سے خالی
شہر فرزانوں سے خالی
جنگل دیوانوں سے خالی
یہ خلائی دور ہے

لوگ تو ہم کے غبارے پھلاتے ہیں
معجون فلک سیر کھاتے ہیں
رویت ہلال کمیٹیاں بناتے ہیں
آسمان کے تارے توڑ لاتے ہیں
ڈٹ کے ڈبے نوش فرماتے ہیں
بیت الخلا میں مدار پر پہنچ جاتے ہیں
ہمارے ہاں کا خلائی دور یہی ہے

☆☆☆

ایک دن حنا کے ساتھ

فرزانہ حبیب

سب سے پہلے حنا اسٹاف اور تمام قارئین کو محبت بھرا اسلام۔

میرا اسم گرامی شاید اب اتنا نامانوس نہ رہا ہو، قلمی سفر طے کرتے مجھے پورے تین سال مکمل ہو چکے ہیں مگر خود کو ابھی بھی طفل مکتب اور ادب کے سمندر میں ایک معمولی سا قطرہ سمجھتی ہوں، مجھے مطالعے کا شوق بچپن ہی سے تھا مجھے یاد ہے وہ پل جب امی بازار سے کوئی سودا سلف لانے کے لئے کہتی تو اخبار کے ٹکڑے میں لپٹے حرف پہلے میرے ذہن میں اترتے پھر وہ مطلوبہ شے امی تک رسائی حاصل کرتی جب اپنی سینئرز مصنفات کو پڑتی تھی تو حیران رہ جاتی تھی کہ ایسا لگتا تھا جیسے یہ کوئی کتاب نہیں بلکہ طلسماتی دنیا ہے جہاں ہماری رائٹرز اپنی ساحرانہ شخصیت سے لفظوں کا ایسا طلسم پھونکتی ہیں جو ہمارے اذہان اور دل کو ایک ان دیکھی محبت کی زنجیر میں جکڑ لیتے ہیں اور آج فوزیہ جی کی اپنائیت بھری فرمائش نے مجھے بھی حوصلہ ہوا کہ ایک دن حنا کے ساتھ ساتھ اپنی قارئین کے ساتھ بھی گزاروں۔

جی جناب! میں بھی ایک عام سی لڑکی ہوں عام سی سوچ، پسند و ناپسند ہیں صبح کا آغاز اذان کی خوبصورت سحر انگیز آواز سے ہوتا ہے نماز فجر کے بعد کچھ وظائف وغیرہ پڑھتی ہوں پرسکون ٹھنڈی ہوا میں چہل قدمی اچھی لگتی ہے اس کے بعد سورج بابا جب تھوڑا بیدار ہو جاتا ہے تو ناشتہ (امی یا بہن کے ہاتھ کا بنا ہوا) کرتی ہوں پھر اسکول جانے کی تیاری کرتی ہوں (اب [illegible] نہ ہو پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ میں MSC اور MED کے بعد تین سال سے درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوں) اسکول سے واپس آ کر نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد لنچ کرتی ہوں پھر کچھ دیر آرام کر کے نماز عصر کی ادائیگی کے بعد نہم اور دہم کے طالبات کو ٹیوشن پڑھاتی ہوں، نماز عشاء تک فراغت نصیب ہوتی ہے تو کچن کا رخ کرتی ہوں (آہم میں تھوڑی بہت سگھڑ بیٹی بھی ہوں جناب) رات کی روٹیاں اور کھانا بنانا میری ذمہ داری ہے رات کے کھانے سے فارغ ہو کر اگر موڈ ہوا تو ٹی وی دیکھتی ہوں مگر ہمارے گھر کیبل جیسی خرافات نہیں صرف پی ٹی وی اور پاکستانی ڈرامے دیکھتی ہوں، فلموں سے کوئی لگاؤ نہیں، اس کے بعد میرا اپنا وقت ہوتا ہے فیس بک اور ای میلز ضرور چیک کرتی ہوں اگر اپنا آفیشل کام ہو تو وہ مکمل کرتی ہوں یا پھر کوئی نیا ناول یا افسانہ لکھنے بیٹھ جاتی ہوں، پھر میرا قلم ہوتا ہے اور صفحہ قرطاس پر بکھرتے لفظوں کا ذخیرہ ساتھ ساتھ ایف ایم سننا پسند ہے، تقریباً گیارہ بجے سونے کے لئے لیٹتی ہوں مگر مطالعہ کے بغیر نیند نہیں آتی، لہٰذا نیند کی وادی میں جانے سے پہلے کوئی نہ کوئی کتاب ضرور ہاتھ میں ہوتی ہے اس کے بعد نیند کی دیوی ہم پر مہربان ہو جاتی ہے، آیۃ الکرسی اور درود شریف کا ورد کرتے خود کو پرسکون نیند کے آغوش میں دے دیتی ہوں۔

اس طرح رب کے فضل سے ایک مصروف ترین مگر خوبصورت دن کا اختتام ہو جاتا ہے۔

اس دعا کے ساتھ اجازت خوش رہیے خوشیاں بانٹیں کیونکہ یہ زندگی بہت حسین مگر مختصر ہے لہٰذا اس کے ہر پل کو دل سے انجوائے کریں۔

☆☆☆

دل گزیدہ

ام مریم

رات گھپ تاریک اور خاموش تھی، بلکہ پرہول تھی، فضا پہ سناٹا طاری تھا جب ہوا چلتی تو درختوں کے پتے ایسے شور مچانے لگتے گویا اس سنسان جگہ آسیب بھٹک رہا ہو، مگر اس ٹائم پہ اس جگہ اگر وہ بلا جھجک آ گئی تھی تو اس تبدیلی کی وجہ بھی وہی شخص تھا جسے اس نے خود یہاں کا مکین بننے پہ مجبور کر ڈالا تھا، یہ وہی شخص تھا، جس کے متعلق اس پہ بھی انکشاف ہوا تھا اس کے بغیر نہیں رہ سکتی، یہ احساس دیرپا نہیں تھا، جبھی خود ہی اسے خود سے توڑ کر یہاں پھینک دیا، مگر پھر کیا ہوا؟ سکون تو پھر بھی نہ ملا، اس کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی اسی ویرانے کی باسی بنتی گئی، دن تو جیسے تیسے گزر جاتا، رات گزارنی مشکل تھی، خشک پتوں کی اس کے قدموں تلے دم توڑتی آواز اس کی اپنی سسکیوں میں گھٹ گئی، قبرستان اس وقت بھی ہمیشہ کی طرح تاریک اور سنسان تھا، برگد کا قبروں پر چھایا ہوا سایہ اور بھی ماحول کو ہیبت ناک بنا رہا تھا، تاریک آسمان پہ بادل اکٹھے ہونا شروع ہوئے تو ہواؤں میں تیزی آ گئی، جبھی برگد کی بوڑھی شاخیں جھولنے لگیں، اس کا سسکیوں سے لرزتا وجود برگد کی شاخوں سے ٹوٹ کر بکھرتے پتوں کی مانند ڈولنے لگا، معاً وہ یکدم گھٹنوں کے بل زمین پہ گر گئی، اس کے دونوں ہاتھ قبر کی پائنتی کی جانب باہم جکڑے لرز رہے تھے، آنسو تسلسل سے بہہ رہے تھے۔

''مجھے معاف کر دو پلیز۔'' وہ گویا سسکی، تیز ہواؤں نے اس سرگوشی کو بکھیر دیا، بجلی وقفے وقفے سے چمکنے لگی تھی، اس کی پوزیشن میں فرق نہیں آیا، یہاں تک کہ ہوائیں تیز ہوئیں اور بوندا باندی شروع ہو گئی۔

''سلیمان!'' وہ بے قراری سے سسکی اور قبر پہ اوندھی گر گئی۔

''تمہیں یاد ہے...... تم نے...... تم نے کہا تھا، سلیمان کسی کو اپنی طرف مائل نہیں کرتا، متوجہ نہیں کرتا، کھینچتا نہیں۔'' اس کی آواز غم کی شدتوں سے ٹوٹ رہی تھی، بے حد بوجھل تھی۔

''لوگ خود ہی کھینچے چلے آتے ہیں (اس نے شاید احتیاطاً لڑکیاں نہیں کہا، کہ اس کا دل نہ ٹوٹے) لوگ سلیمان کے ساتھ چلنا چاہتے ہیں، سلیمان کا ہاتھ تھامنا چاہتے ہیں، سلیمان انہیں ساتھ تو چلنے دیتا ہے، مگر ہاتھ کسی کو نہیں تھماتا، اگر ہاتھ تھمائے گا تو لوگ جب بچھڑیں گے ان کا دل بھی ٹوٹے گا اور سلیمان دل توڑنے کے کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے ڈرتا ہے، وہ لوگوں کو اپنے ساتھ چلنے دیتا ہے، آخر کتنی دیر وہ اس کے ساتھ لمبے راستے پہ چلتے جائیں گے؟ سلیمان کو تو بہت دور جانا ہے، راستہ بھی بہت الگ بہت جدا، وہ کتنی دیر اس کے ساتھ چلیں گے؟ کیا فرق پڑ جائے گا؟ سلیمان تو اک دن اڑنے لگے گا، تب وہ کیا کریں گے؟ اڑنے کے لئے پر کہاں سے لائیں گے؟ سلیمان تو کسی کو ہاتھ نہیں دیتا، پر کہاں سے دے گا؟'' وہ اس کا ہاتھ نہ تھام سکی۔

وہ اس کے ساتھ اڑ نہ سکی
تو اس کے بھی پر کاٹ دیئے
اسے زمین پہ گرا دیا
اسے زمین میں دبا دیا
اب وہ کہاں جا سکتا تھا

اب وہ کہیں نہیں جا سکتا تھا، اب وہ صرف اس کا تھا، صرف اس کی ملکیت، اس کی آنکھ سے بکھرتے آنسو تھمے اور چہرے کی یاس مسرت میں بدلنے لگی، سسکیاں مسکراہٹ میں مسکراہٹ ہنسی سے قہقہوں میں ڈھل گئی۔

قبرستان میں چھایا سناٹا نسوانی سسکیوں کے بعد بتدریج قہقہوں سے ٹوٹتا چلا گیا، سناٹا تاریکی اور بہت گہرا احساس، لمحے خاموشی سے سرکتے رہے، آدھے چاند کے اوپر بادل تیر رہے تھے، کبھی وہ ان میں چھپ جاتا کبھی نکل آتا، درخت دم سادھے کھڑے تھے معمول کے مطابق، یہ منظر یہ آہٹیں یہ آوازیں، کچھ بھی ان کے لئے غیر معمولی نہ ہو، وہ عادی تھے ان سب کے۔

☆☆☆

محبت تو بارش ہے
جسے چھونے کی خواہش میں
ہتھیلیاں تو گیلی ہو جاتی ہیں
مگر ہاتھ ہمیشہ خالی رہتے ہیں

گاڑی کو پھر زوردار جھٹکا لگا تو اونگھتی ہوئی غانیہ کی آنکھ پوری طرح کھل گئی، اس نے لیٹے لیٹے

بازو پھیلا کر انگڑائی لی اور چہرے پہ بےزاری و اکتاہٹ سجائے اٹھ کر بیٹھ گئی، گاڑی کے شیشے تاریک ہونے کے باوجود باہر اٹھنے والا گردوغبار کا طوفان وہ دیکھ کر اندر انڈلی ناگواری کے باعث ہونٹ باہم بھینچ ڈالے، بالوں کو سمیٹ کر خوب صورت سے بینڈ میں جکڑ رہی تھی جب گاڑی نے ایک بار پھر غوطہ سا کھایا، کچھ اس طرح کہ وہ کسی طور بھی اپنے سر کو چھت سے ٹکرانے سے نہ بچا سکی، ایک لمحے کو صرف تاریکیاں ہی اس کی آنکھوں میں نہیں چھائیں، اسے لگا اس کی گردن کی ہڈی بھی چٹخ گئی ہو، دونوں ہاتھوں سے گردن سہلاتے اس نے سخت احتجاجی انداز میں پاپا کو دیکھتے بھیگتی آنکھیں کرب بھرے انداز میں جھپکی تھیں، ڈرائیونگ میں مصروف پاپا نے کچھ کہا بھی تھا، شاید اسی حوالے سے کیئرفل رہنے کی تاکید، جسے سمجھنے کے وہ اب قابل نہیں رہی تھی، اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑتے محسوس ہوئے پہلے سے برہم موڈ کچھ اور بھی بگڑ گیا ہوا۔

''ابھی اور کتنی دور ہے گاؤں پاپا......؟'' خاصی تاخیر سے یہ سوال کیا تو گردن کی تکلیف میں کمی ضرور آئی تھی موڈ میں برہمی کا ناگواری کا نقطہ عروج پہ ہی پہنچا ہوگا۔

''بس بیٹے! چند منٹ اور ہے انتظار کے، آپ نے تو ویسے بھی سارا سفر سو کے کاٹا۔'' انہوں نے اس کا بےزار کن خفا خفا سا چہرہ بیک ویو مرر سے جانچا اور شفقت سے مسکرائے، ان کی مسکراہٹ بہت تروتازہ تھی، حالانکہ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے مسلسل ڈرائیو کر رہے تھے، ان کی تازگی کی وجہ اسے معلوم تھی، یہ اپنوں سے ملنے کی خوشی تھی جو فرصت کا احساس بن کر انہیں سرشار اور ہشاش بشاش ظاہر کر رہی تھی۔

''آپ کافی پئیں گے پاپا؟'' اس نے تھرموس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے انہیں مخاطب کیا، تھکان کا گہرا احساس اس کے اعصاب کو شدید قسم کے تناؤ سے لبریز کرتا جا رہا تھا۔

''نو مائی چائلڈ! کافی بلکہ چائے میں اب گھر پہنچ کے پیوں گا اماں اور بھائی جان کے ساتھ، چند منٹ کی بات ہے اب تو۔'' بات کے اختتام تک وہ بےساختہ مسکرائے تھے، غانیہ نے کوئی تبصرہ کیے بغیر ہاتھ کھینچ لیا، اس کا ارادہ بھی بدل گیا تھا، توجہ گاڑی کے ساتھ لگ کر بھاگنے والے بچوں نے کھینچ لی، جو کہ نائی لباس میں ملبوس موسم کی سختی سے بےنیاز شور مچاتے مگن نظر آ رہے تھے یہ بڑی سی چمکتی مگر دھول میں اٹی گاڑی ان کے لئے اتنی دلچسپی کا باعث تھی کہ کھیل چھوڑ چھاڑ ساتھ ہو لئے تھے، جیسے ہی پاپا نے بریک لگایا، بچوں کا قافلہ خود بخود تھم گیا، اب وہ کچھ فاصلے پر ٹھہرے اپنی معصوم آنکھیں پٹپٹا کر پچھلے دروازے سے برآمد ہونے والی لڑکی کو دیکھ رہے تھے، جس کے کٹے ہوئے بال شانوں پر لہراتے تھے اور لباس جینز شرٹ پہ مشتمل تھا، بھلا دیکھا گیا تھا آس پاس اس سے قبل کوئی ایسا عجوبہ، وہ سب ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشیاں کرتے اور دبی دبی ہنسی ہنستے اس کی جانب اشارے کرنے میں مصروف تھے، غانیہ نے اک سرسری نگاہ ان پہ ڈالی اور جھک کر اپنا شولڈر بیگ گاڑی کی سیٹ سے اٹھانے لگی، سورج اپنے سفر کے آخری مرحلے پہ آ پہنچا اور تھکا تھکا تھا، آگ کا یہ نارنجی گولہ پردہ مغرب میں ڈوبنے کی مکمل تیاری کر چکا تھا، ماحول میں نارنجی رنگ اپنی تمام تر یاسیت سمیت جلوہ گر تھا، کچے پکے نیم پختہ مکانات اور درخت اسی رنگ کی لپیٹ میں آئے خاموش اور ملول نظر آتے تھے، گرد کا ہلکا غبار اور دور کہیں چلتی پن چکی کی آواز کا تاثر قائم ہوا

ہوا تھا۔

پپا نے گاڑی کا دروازہ لاک کرنے کے بعد غانیہ کو اپنے ہمراہ آنے کا اشارہ کیا، غانیہ کے قدم اٹھے تو کتنی ہی نظریں بھی ساتھ عازم سفر ہوئی تھیں، یہ گلی محلے کی وہ خواتین تھیں جو گاڑی کی آواز سن کر تجسس کے ہاتھوں مجبور دروازوں سے جھانکنے لگیں تھیں مگر اس الٹرا ماڈل لڑکی کو دوپٹے سے بے نیاز اتنے اعتماد سے چلتے پا کر ان کی آنکھیں بھی حیرت سے ابل پڑی تھیں، جبکہ غانیہ ان سب نظروں سے بے نیاز پپا سے مخاطب تھی۔

''آپ نے دادو کو فون کر کے اطلاع تو دے دی تھی نا پپا؟''

''نہیں...... فون تو نہیں کیا تھا، مگر اماں کو میری آمد کی خبر ہو گی یقیناً۔'' وہ جتنے اعتماد سے مسکرائے غانیہ اسی قدر جھلاہٹ سے بھر گئی، اسے یہ بات بہت چڑاتی تھی کہ بنا اطلاع اچانک کسی کے سر پہ سوار ہو جایا جائے، ہر ایٹی کیٹس کے خلاف ہونے والا کام اسے ہرگز پسند نہیں آ سکتا تھا۔

''اک کال کرنے میں کیا حرج تھا پپا؟ نہیں کر سکتے تھے تو مجھے کہا ہوتا۔'' وہ کسی طور بھی اپنی ناگواری نہیں دبا سکی، پپا کھنکارے تھے، کہ ابھی وہ لوگ گھر سے کچھ فاصلے پہ تھے مگر تاؤ جی دروازے سے نکلتے انہیں دیکھ کر ٹھٹکے اور ایک دم جیسے خوشی سے نہال ہوتے بانہیں پھیلا کے ان کی جانب تیزی سے بڑھ آئے۔

''جی آیاں نوں، جی آیاں نوں، میری سوہنی دھی وی آئی ہے، بھئی بلے بلے، یار جمال تو نے زندگی میں پہلی واری کوئی ڈھنگ کا کم کیا ہے قسم سے۔'' بھائی کے ساتھ غیر متوقع طور پہ بھتیجی کو دیکھ کر وہ کچھ اس طور مسرت سے لبریز ہوئے کہ بھائی کو بھی بھول گئے، اسے بازو کے حلقے میں لے کر ساتھ لگایا، ماتھا چوما سر پہ بوسہ لیا اور اسی طرح نہال نظر آتے پلٹ کر اندر آوازیں دینے لگے۔

''اماں تیرا یقین پھر جیت گیا، آ گیا تیرا پتر اور نال تے ویکھ ہور کون آیا۔'' وہ خوشی سے لرزتی آواز سمیت کہتے غانیہ کو اپنے ہمراہ لئے اندر بڑھنے لگے، پپا بھی تفاخر بھری مسکان کے ہمراہ ساتھ تھے، آن کی آن میں سب ان کے گرد اکٹھے ہو گئے، کنیز، سہیل تائی ماں اور دادو، وہی والہانہ انداز وہی بھرپور استقبال، غانیہ ایک کے بعد دوسرے معانقے سے سٹپٹائی ہوئی نظر آ رہی تھی، کہ سہیل پہ نگاہ پڑی، جس کا چہرہ ہنسی روکنے کی کوشش میں سرخ ہوا جا رہا تھا، وہ مزید کنفیوژ ہوئی۔

''بے فکر رہیں، ہمارے ہاں لڑکوں کا لڑکیوں سے گلے ملنے کا رواج نہیں ہے۔'' وہ ہنسی ضبط کرتا چھیڑنے سے باز نہیں آیا، غانیہ نے ترچھی نگاہوں سے اسے دیکھا اور مصافحے کو بڑھا اس کا ہاتھ نظر انداز کر دیا۔

''معذرت، ہمارے ہاں اس رواج کے ساتھ لڑکوں سے ہاتھ ملانے کا بھی رواج نہیں ہے۔'' اس کے انداز میں محسوس کی جانے والی ناگواری کے ساتھ تیکھا جتلاتا انداز بھی نمایاں تھا، جہاں سہیل کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑا، وہیں تاؤ جی کی اطلاع پہ مہمانوں کی آمد کی اطلاع پا کر چھت سے اتر کر اسی جانب آتا منیب ضرور طیش سے بھر گیا۔

''ظاہر ہی باطن کا آئینہ قرار پاتا ہے بی بی! متضاد باتوں پہ اعتبار تو نہیں ہنسی ضرور آ سکتی ہے۔'' زمانے بھر کی خشک سرد اور پھنکارتی آواز لب و لہجہ دھیما مگر اپنے اندر طیش کا اک طوفان

سموئے ہوئے غانیہ کو پہلے ششدر پھر اشتعال سے بھی بھر گیا جبکہ وہ اپنے الفاظ کی سنگینی سے بے نیاز سپاٹ انداز میں پاپا سے ملنے میں مصروف ہو چکا تھا، غانیہ اس کی محض ایک جھلک ہی دیکھ سکی۔

''بہت معذرت! دراصل یہ کچھ خفا سے رہتے ہیں سب سے، الفاظ بے شک سخت استعمال کرتے ہیں مگر دل.....''

سہیل صورت حال کی گمبھیرتا سے خائف وضاحت وصفائی پیش کرنے میں مصروف ہوا تھا کہ غانیہ جو خفت وسبکی کے ساتھ تضحیک کے احساس سمیت جھلستی لب بھینچے گھر سے باہر جاتے شخص کی چوڑی پشت کو گھورے جاتی تھی، نگاہ کا زاویہ بدل کر سہیل کی جانب متوجہ ہوئی۔

''کون تھے یہ حضرت اور انہیں اتنی جرأت کس نے دی کہ.....''

''بڑے بھائی ہیں، بلکہ بڑے سے چھوٹے۔'' سہیل پہلی بات کا ہی جواب دے سکا، دوسری بات کا جواب بھلا کیا بنتا تھا، غانیہ نے ہونٹ سختی سے بھینچ لیئے، پہلا تجربہ ہی تلخ اور ناگوار رہا تھا، وہ ایک دم مزید بدگمان مزید بددل ہوئی، تائی جان دادو اور دیگر افراد کی محبت اہمیت اور توجہ بھی اس سلگتے سبکی کے احساس کو ختم نہیں کر سکی تھی، جو اس شخص کے الفاظ کے نشتر اسے چبھو چکے تھے، پپا نے اس کے لباس پہ دبے انداز میں خود بھی تنقید کی تھی۔

''بیٹے کوئی اور ڈریس پہن لو۔'' اور وہ اتنی سی بات کہہ کر فارغ ہو گئی تھی۔

''پپا میں کسی کی خاطر خود کو نہیں بدل سکتی۔''

اور اب اسے لگ رہا تھا یہ الفاظ اسے نیزے پہ گاڑھ گئے ہیں، اسے کوئی غلط کیسے بلکہ جتلا بھی دے ثابت بھی کر دے، ایسا آج تلک نہیں ہوا تھا، اسے پہلی بار کسی بات نے ایسے ڈس ہارٹ کیا تھا، اضطراب کسی خنجر کی مانند اندر گڑھ گیا، جبھی نہانے کو گئی تو اکلوتا شلوار سوٹ ہی اٹھا سکی جو پپا نے ہی آتے ہوئے اس کے بیگ میں خود ملازمہ سے کہہ کر رکھوایا تھا۔

(بے تہذیب..... پینڈو کے پینڈو ہی رہتے ہیں، یعنی جہالت کی حد ہو گئی، ایسی بھی کیا بے لحاظی کہ منہ پہ کہہ ڈالا، پتا نہیں خود کو کیا سمجھتے ہیں، مولوی کہیں کا) نہانے اور کپڑے پہننے کے دوران وہ خود ہی کلستی رہی تھی۔

''غانیہ!'' کنیز دروازہ سے باہر ہی پکار رہی تھی، اس نے ہیئر برش پٹخ دیا۔

''سب چائے پہ تمہارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔'' وہ اس کی ہم عمر لڑکی جھجکے شرمیلے انداز میں اس سے مخاطب تھی، غانیہ نے بیڈ کی پائنتی پہ دھرا دوپٹہ اٹھا کر کاندھے پہ ڈال لیا۔

''چلو۔'' اس کے انداز میں بے دلی تھی، کنیز اس کے ہمراہ ہو لی، دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی بڑا سا آنگن سامنے تھا، اس نے اکتاہٹ آمیز نگاہ اطراف میں ڈالی اور جی بھر کے بے زار ہو گئی۔

یہاں دلچسپی کے قابل کچھ بھی نہیں تھا، بے حد وسیع وعریض کچا صحن، جس میں جا بجا چارپائیاں بچھی تھیں، ہر لحہ بڑھتی تاریکی کو نگلنے کی سعی میں مصروف بلکہ ہلکان سو واٹ کا مریل سا بلب جس پہ ماہ وسال کی گردش نے اپنا اثر چھوڑا تھا، جبھی اس کا شیشہ دھندلا چکا تھا مکمل طور پہ۔

یہ زرد روشنی غانیہ کی آنکھوں کے لیئے نامانوس ہی نہیں چبھن اور عجیب سی وحشت جگانے کا بھی

باعث بن رہی تھی، اسی زرد نا کافی روشنی میں اسے آنگن میں کھڑے سکھ چین اور بیری کے درخت جن بھوتوں سے مشابہہ لگنے لگے تھے، جن کی ہوا سے ڈولتی شاخوں کا عکس دیواروں اور فرش پہ لرزاں مزید بے چینی اور خوف کا باعث تھا۔

''چائے لے نا پتری۔'' تاؤ جی نے اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے مخاطب کیا، دادی پہلے ہی اسے آتے پا کر اپنے پہلو میں جگہ دے چکی تھیں، اس کے نم بالوں پہ شفقت بھرا ہاتھ پھیرا اور خواہ مخواہ مسکرائے گئیں۔

''میری دھی کتنی سوہنی ہے۔''

غانیہ کو کچھ بھی اچھا نہیں لگا، نہ چاہت نہ چائے پہ اصرار، اس نے یہاں آنے کے بعد بالخصوص درزیدہ نگاہ سے اس شخص کو کھوجا تھا جو نظر نہیں آسکا، تائی جان نے خود پیالی اٹھا کر محبت سے اسے پیش کی، وہ انکار نہیں کر سکی تو ایک گھونٹ سے زیادہ بھی نہیں لے سکی، لکڑی کے ایندھن پہ پکنے والی چائے میں موجود دھوئیں کی مہک اس کے نازک مزاج پہ گراں گزری تھی۔

''چائے بھی پسند نہیں آسکی آپ کو۔'' سہیل کے سوال پہ وہ اچھا خاصا چونکی، یقیناً اس کے چہرے کے تاثرات ہی ایسے تھے کہ وہ بالکل درست قیافہ لگا چکا تھا۔

''بھی'' سے کیا مراد ہے آپ کی؟'' اس کا مزاج تو برہم تھا ہی، سوال تیکھا بھی کر گیا، سہیل آہستگی مگر شائستگی سے ہنس رہا تھا۔

''سمجھدار کو تو اشارہ کافی ہوتا ہے ڈیئر کزن۔'' اس کا انداز ہلکا پھلکا تھا، غانیہ ہونٹ بھینچے اسے دیکھے گی۔

''جانے بھی دیں ناں اب پیاری لڑکی، کسی فرد واحد کی وجہ سے اپنا موڈ خراب نہیں کرتے، ویسے اس لباس میں آپ بہت بہت زیادہ اچھی لگ رہی ہیں۔'' اس نے ہاتھ سے پسندیدگی کا اشارہ دیا تھا، غانیہ کے سپاٹ چہرے پہ یکلخت تلخی چھاتی چلی گئی۔

''اگر آپ کو یہ خوش فہمی ہے کہ میں لڑکوں سے تعریف کروا کے خوش ہونے والوں میں شامل ہوں تو......'' اس کی بات سہیل کے بلند ہوتے قہقہے میں دب گئی تو لب باہم بھینچتی وہ خفا نگاہوں کا زاویہ بدل گئی تھی۔

''اتنی بدگمان تو نہ ہوں اب، بھئی ایک بندے کی وجہ سے آپ سب کو اسی لپیٹ میں لے لیں گی تو زیادتی ہوئی ہم سب سے، ویسے بھی میں تعریف اپنی بہن کی کر رہا ہوں، سمجھیں۔'' وہ اس کا سر تھپک کر کہہ دیا تھا، غانیہ اب کے واقعی ریلیکس ہوئی تھی، اپنی باتوں میں مگن تینوں بزرگوں نے لمحہ بھر کو توقف کرتے ہوئے انہیں دیکھا مسکرائے اور پھر سے مصروف ہو گئے۔

''میں اور چائے بنواتا ہوں کنیز سے کہہ کر۔'' وہ اٹھتا ہوا بولا، غانیہ بے اختیار بوکھلا اٹھی۔

''نہیں...... پلیز نہیں، اس زحمت میں نہ ڈالیں انہیں۔''

''مہمان باعث رحمت ہوا کرتے ہیں یہاں، ہمیشہ کو نوٹ کر لیں۔'' وہ انگلی اٹھا کر بڑا مدبر بنا، غانیہ کھسیا سی گئی۔

''چلیں آپ کے لئے کچھ ٹھنڈا لاتا ہوں، ٹھیک ہے۔'' وہ اٹھ تو چکا تھا، مسکراتا ہوا پلٹ گیا،

غانیہ منع بھی نہیں کر سکی۔

''اووف۔'' مچھر نے اس کے پیر پہ کاٹا تھا، وہ بلبلا کر نیچے جھک گئی، اندھیرا چھاتے ہی مچھروں کی اجارہ داری قائم ہو چکی تھی، وہ کبھی ہاتھ مسلتی کبھی تڑپ کر بازو سہلانے لگی، پاپا پتا نہیں اپنے خاندان کی کون سی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھے، وہ بالآخر بے زار ہو کر انہیں ٹوک گئی۔

''واپس کب چلنا ہے پپا؟'' وہ ان کے پاس آ کر ضدی بچی کی مانند مچلی، تو حاضرین نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''صبح چلیں گے نا بیٹے، اب رات ہو چکی ہے۔'' پپا کے لہجے میں جتنا رسان تھا وہ اس قدر ششدر رہ گئی، دم بخود انہیں دیکھنے لگی۔

''واٹ، مگر جب آ رہے تھے تو آپ نے نہیں بتایا تھا کہ۔'' وہ روہانسی ہوتی بات ادھوری چھوڑ گئی۔

''پتری اک رات تے رکو ناں ادھر ہمارے پاس۔'' تاؤ جی نے پہلے کنیز کو بلا کر مچھر بھگانے والی دوا لانے کا کہا پھر اسے دلار سے مخاطب کیا، وہ کچھ نہیں بولی۔

سہیل کی لائی بوتل بھی اس نے اصرار کے باوجود نہیں چھوئی، نہ کھانا کھایا، دادی جان سمیت سبھی میزبان متفکر اور بے چین نظر آنے لگے۔

''میری دھی رانی روٹی کھا لے پہلے، پھر سو جانا، میں منیبے سے کہتی ہوں، اج اپنا کمرہ خالی کر دے، وہاں ٹھنڈی مشین لگی ہے، ویسی ہی جیسی شہروں میں لگی ہوتی ہیں گھروں میں۔'' تائی ماں کے لہجے میں اطلاع بہم فراہم کرتے تفاخر سا اتر آیا، غانیہ کچھ نہیں بولی، یہ بات اس کے لئے بھی اطمینان کا باعث تھی کہ اس قدیم نظر آتے صدیوں پرانے گھر میں ایئر کنڈیشنر جیسی سہولت بھی میسر آ سکتی ہے، سب کے اصرار پہ اس نے کھانا بھی بس زہر مار کیا تھا۔

اسے پھر وہی دھوئیں کا مسئلہ درپیش ہوا تھا، عجیب سی بے بسی نے اس کا احاطہ کر لیا تھا۔

''مجھے پتا ہے تم نے کھانا نہیں کھایا۔'' کنیز نے جس پل دودھ کا بڑے سائز کا گلاس پیش کیا، اس کی نظروں کی حیرت کے جواب میں وہ مسکرا کر بولی تھی، غانیہ کے لبوں پہ تشکرانہ مسکان اتر آئی۔

''تھینکس۔'' وہ واقعی ممنون ہوئی، ورنہ خالی پیٹ تو شاید وہ سونے سے بھی قاصر رہتی۔

''تم دودھ پی لو تو میں تمہیں ویرے کے کمرے میں چھوڑ آتی ہوں، چاچے نے تو دادی کے ساتھ ساری رات جاگ کے گلاں باتاں کرنی ہیں، سالوں بعد ملنے پہ اتنا تو ان کا حق بنتا ہے۔'' کنیز کی مسکراہٹ بتا رہی تھی مہمانوں کی آمد سے کتنی خوشی حاصل ہوئی ہے، غانیہ خاموشی سے دودھ کے گھونٹ بھرتی اسے کچن کے کام نپٹاتے دیکھتی رہی، اس وقت وہ جہاں موڑھے پہ بیٹھی تھی، وہ غالباً کچن تھا، لکڑی کے چار ستونوں کے آسرے کھڑی چھت کے نیچے مٹی کا چولہا تھا، جس کی پچھلی پکی دیوار دھوئیں سے مکمل طور پہ سیاہ پڑ چکی تھی، کھانے پینے سے متعلق سبھی سامان بہت سادہ انداز میں وہیں رکھا تھا، چولہے میں آگ روشن تھی اور بڑے سے پتیلے میں ابھی بھی کچھ ابل رہا تھا، شاید دودھ یا پانی۔

معاً کنیز نے ڈھیر ساری پتی اور چینی ابلتے دودھ میں جھونکی تو اسے اندازہ ہوا، کنیز سب کے لئے دودھ پتی بنانے میں مصروف ہے، شاید گاؤں کے لوگ رات کو چائے پینے کے عادی تھے۔

''تم یہاں پھر آؤ گی غانیہ؟'' جلتی ہوئی لکڑی کو چولہے سے کھینچ کر اس پہ پانی کے چھینٹے ڈال کر بجھاتی ہوئی کنیز ایکدم سے اسے مخاطب کر گئی تھی، غانیہ کی ساری توجہ بجھتی ہوئی آگ اور گیلی لکڑی سے اٹھتے دھویں کی جانب تھی، اس سوال پہ چونک گئی۔

''بالکل نہیں، خدا نہ کرے کہ میں یہاں دوبارہ آؤں، آئی مین یہاں رہنا بہت مشکل ہے، سہولیات کے بغیر زندگی کا تصور ہی محال لگتا ہے اب تو۔'' اس نے خالی گلاس واپس کرتے ہوئے صاف گوئی سے انکار کر ڈالا تو ایک لمحے کو نگاہ کنیز کے بجھتے چہرے پہ بھی چلی گئی، جو بالکل پھیکا پڑ گیا تھا، اسے خفیف سی شرمندگی نے آن لیا۔

''آئی ایم ساری فار دیٹ، اگر تمہیں برا لگا مگر۔''

''کوئی بات نہیں، ویسے جتنی پیاری تم خود ہو، تمہارا دل بھی بہت صاف ہے۔'' کنیز نے مسکرا کر گویا اس کی خفت کم کرنا چاہی تھی، غانیہ بے ساختہ ہنس دی۔

''کیا اس کے جواب میں، میں تمہاری تعریف کروں؟'' اس کا انداز خفیف سی شرارت لئے بہت شوخ تبسم کا تھا، کنیز بے اختیار جھینپ کر سرخ پڑنے لگی۔

''ہرگز نہیں، بس پھر سے یہاں آنے کا وعدہ کر لو کافی ہے، دراصل اماں ابا کے ساتھ ساتھ دادی بھی بہت خوش ہیں تمہیں یوں اپنے درمیان دیکھ کر، ہم سب کی یہ شدید خواہش ہے کہ تم ہمارے ساتھ گھلو ملو۔'' کنیز کے لہجے میں جو انوکھا اصرار تھا اسے سمجھے بغیر وہ اسے اس کی محبت سے تعبیر کرتی محجوب سی ہو گئی تھی۔

''سفر بھی بہت لمبا تھا، پھر اتنا خوفناک بھی، میری ہڈیاں پسلیاں ہل گئی ساری۔'' اس نے منہ بسورا، معاً کنیز کے منہ پہ بجھتی روشنی کو محسوس کرتی گہرا سانس بھر کے جیسے کسی منطقی فیصلے پر جا پہنچی تھی۔

''بھئی اس کا ایک آسان حل ہے، تم لوگ وہاں شہر آ جاؤ۔'' وہ اپنے تئیں گویا اسے بہلا رہی تھی، کنیز محض رسمی سا مسکرائی۔

''تھکی ہو گی تم، آؤ تمہیں کمرے تک چھوڑ آؤں۔'' کنیز نے چائے ڈھک دی تھی، غانیہ نے کاندھے اچکا دیئے، تھک تو وہ واقعی بہت گئی تھی، اٹھتے ہوئے اس نے دوپٹہ کھینچ کر کاندھے پہ درست کیا، برآمدے سے اتر کر کمرے میں جانے کو صحن میں قدم رکھا ہی تھا کہ بیرونی دروازہ دھماکے سے کھول کر جو لوگ اندر داخل ہوئے ان میں سب سے آگے دس گیارہ سال کا شکل سے ہی بدتمیز نظر آنے والا وہ بچہ تھا جس نے غانیہ کو دیکھ کر بے اختیار سیٹی بجائی تھی۔

''اوئے ہوئے، کڑی تے بالکل میم لگتی ہے۔'' وہ اس کے گرد باقاعدہ گھوم کر چہکا تھا، غانیہ ٹھٹک سی گئی۔

''چپ بدتمیز، پھپھی ہے تیری، سلام کر۔'' ایک موٹی کسی قدر بھدی عورت نے بچے کو دھپ رسید کرتے کھسیانی ہنسی ہنستے اصلاح کی، ساتھ ہی اپنا موٹا سانولا ہاتھ مصافحے کو اس کی جانب بڑھا

دیا۔

''یہ بڑا بدتمیز ہو گیا ہے، آپ غصہ نہ کرنا۔'' غانیہ کیا کہتی، محض اسے دیکھ کر رہ گئی، مرد نے غانیہ کے سر پہ ہاتھ رکھا، خیریت دریافت کی، کنیز نے ان لوگوں کا تعارف بڑے بھائی حبیب ان کی مسز اور بیٹے ہمایوں کے طور پہ کروایا۔

''یہ بھا ہیں ہمارے، منیب ویرے سے بڑے، ہمایوں کے علاوہ ان کی ایک بیٹی اور بھی ہے۔'' کنیز کے تعارف کروانے پہ وہ کھینچ تان کر مسکراہٹ لبوں پہ لانے میں کامیاب ہو رہی گئی۔

''ہم چاچے سے ملنے آئے ہیں، آؤ نا تم بھی بیٹھو ہمارے ساتھ۔'' کنیز کے اشارے پہ وہ جیسے ہی آگے بڑھی، بھرجائی نے ارادہ بھانپ کر ہی بڑے خلوص سے دعوت دی تھی، غانیہ بے ساختہ جزبز ہوئی اور یوں کنیز کو دیکھا گویا اسی کو اس مشقت میں نجات دہندہ سمجھتی ہو۔

''سفر کی تھکان ہے، غانیہ آرام کرنا چاہتی ہے بھرجائی۔'' کنیز کی نرمی سے کی گئی مداخلت بھی بھرجائی کو خار بن کر چبھی تبھی چہرے پہ کرختگی کے ساتھ تلخی و ترشی کا تاثر گہرا ہوتا چلا گیا۔

''تو چپ ای رہ کنیزو! تجھے اتنا تو معلوم ہوگا کہ ہم چاچے اور اس کی دھی کا سن کر ہی ملن واسطے آئے ہیں، ورنہ ادھر ایسی بھی کوئی محبت نئیں امنڈی پڑ رہی کہ دوڑیں لگانے کی ضرورت پڑے آ۔'' جاہلانہ انداز کے تیکھے پن سمیت انہوں نے بلاتامل کنیز کو جھاڑ کر رکھ دیا، کنیز کا رنگ یکا یک کتنا پھیکا پڑ گیا تھا، غانیہ حیران و ششدر اور خائف نظر آنے لگی، اس نے لاتعلق نظر آتے بھا حبیب کی جانب دیکھا، جن پہ بیوی کے ہاتھوں بہن کے ذلیل ہونے کا ذرہ برابر بھی اثر دکھائی نہیں دیتا تھا، اسے یہ سب بے حد آکورڈ لگا، اتنی معمولی بات پہ ایسی بدتمیزی کی کیا تک بنتی تھی بھلا؟

''کنیز صحیح کہتی ہے، میں واقعی تھکی ہوئی ہوں۔'' وہ نا چاہتے ہوئے بھی تڑخ کر کہہ گئی، بھرجائی جو کنیز کی مزید خاطر داری کا ارادہ باندھے ہوئے تھیں، اچھا خاصا چونک کر اس کی سمت متوجہ ہوئیں تو آنکھوں میں تحیر ہی تحیر نظر آتا تھا، معاً انہوں نے خود کو سنبھالا اور چاپلوسانہ انداز میں قدرے مسکرائیں۔

''اچھا اچھا..... کوئی بات نہیں، تم سو جاؤ، پر صبح ہمارے گھر ضرور پھیرا مارنا، تیرے وڈے پرا کا گھر ہے، اپنا ہی سمجھو۔'' اس کا گال سہلا کر کہتی ہوئیں وہ اپنا سابقہ تاثر مٹانے میں کوشاں تھیں، غانیہ کچھ نہیں بولی، وہ بدتہذیب تھی نہ ہی اس قدر بداخلاق، اس وقت جو بھی تلخی یا ناگواری اس کے اندر اتری تھی وہ کنیز کے ساتھ بھرجائی کے اہانت آمیز سلوک کا ہی ردعمل تھا، اس کا یہ مطلب بھی نہیں لیا جا سکتا تھا کہ محض چند گھنٹوں میں ہی اسے کنیز سے جذباتی یا دلی وابستگی ہو گئی تھی البتہ بھرجائی کا متکبرانہ انداز ضرور سہہ نہیں پائی، کنیز کا ہاتھ پکڑ کر قدم بڑھاتے اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔

''ارے..... ارے..... بھئی رکو..... یہی ہے ویر کا کمرا۔'' قطار میں بنے کمروں میں سے ایک کے آگے پہنچ کر کنیز کے قدم رکے وہ البتہ ضرور آگے بڑھ گئی تھی، تب کنیز نے ہی اسے روکا تھا، غانیہ نے پلٹ کر پیچھے دیکھا، پکی لکڑی کا براؤن دروازہ نیم وا تھا، جس کا رنگ موسم کی شدتوں

کا مقابلہ کرتا جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا اڑا ہوا تھا، اس کے باوجود اس کی حالت یہاں کے دیگر کمروں کی نسبت قدرے بہتر تھی، کہ غسل کے لئے بھی کنیز اسے یہیں لا چکی تھی، وہ امید رکھ سکتی تھی کمرے کی حالت اس کی شاہانہ فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق نہ سہی مگر گزارا بہر حال ہو سکتا تھا، نیم وا دروازے پہ خوبصورت پرنٹ کے گرے پردے سے روشنی چھن کر باہر آتی تھی، پر وہ اندر چلنے والے پنکھے کی ہوا کے دوش پہ دھیرے دھیرے لرزتا جا رہا تھا، کنیز نے آگے ہو کر دروازے پہ آہستگی سے دستک دی۔

''ویر میں آ جاؤں؟'' جواب میں مردانہ بھاری آواز کا محض ہنکارا ابھرا گیا، کنیز نے دروازہ دھکیل کر پورا وا کر دیا، اب اندرونی منظر کی راہ میں پردے کی دیوار تھی، جو ہولے ہولے لہراتی آگے پیچھے جاتی تو اندر کا منظر ذرا سا وا ہو جاتا کنیز نے اس نرم دیوار کو ہاتھ سے ہٹا کر پرے کرتے ہوئے اندر قدم رکھ دیا، غانیہ ہچکچاہٹ آمیز گریز سمیت وہیں چوکھٹ پہ کھڑی رہ گئی، نرم دیوار لہراتی ایک مرتبہ پھر درمیان میں حائل ہو گئی۔

''تم یہاں اگر اپنی معزز مہمان کو لائی تھیں تو انہیں یہ بھی بتایا ہوتا کہ کسی غیر مرد کے ذاتی استعمال کے کمرے کو اتنی بے تکلفی سے استعمال نہیں کرتے، اگر کر بھی لیا ہے تو کم از کم آثار مٹا دینے چاہیے، اتنی تمیز تو کسی بھی باشعور انسان کو ہونی چاہیے۔''

وہ جیسے کنیز کا ہی منتظر تھا، اس کی شکل دیکھتے ہی برس پڑا، جہاں کنیز بوکھلائی باہر کھڑی غانیہ کی پیشانی الگ تپ اٹھی، مخاطب کا سرد سنجیدہ لہجہ رہانت آمیز انداز اس پہ تضحیک و توہین کے لاتعداد نئے باب وا کر گیا، وہ جہاں جیسے تھی کھڑی کی کھڑی رہ گئی، غلطی تو اس کی واقعی تھی، عادت کے مطابق اس نے باتھ لینے کے بعد واش روم سے اپنے کپڑے نہیں اٹھائے تھے، اس کا اسٹائلش سا بیگ جس میں اس کے مزید کپڑے اور دیگر سامان تھا وہ بھی وہ کھلا ہوا ہی بستر پہ چھوڑ گئی تھی، یہ سوچے بنا کہ یہاں نہ تو ماما تھیں نہ اس کی ملازمہ کو جو اس کے لباس کے انتخاب سے لے کر باتھ لینے کے بعد تک کا بکھیرا سمیٹتی، کتنی خراب عادت تھی اس کی جسے مما نازک مزاجی گردانتیں اور نرمی سے ٹوکا کرتی تھیں آج اس کی شدید سبکی کا باعث بن چکی تھی۔

''مم...... میں ابھی اٹھا لیتی ہوں ویر۔'' کنیز بوکھلائی جا رہی تھی اور شاید عجلت میں کپڑے سمیٹ بھی رہی تھی۔

''ظاہر ہے تم ہی سمیٹو گی۔'' وہ تنک کر کڑواہٹ سے کہتا اٹھا اور اپنے سامنے کھلی ہوئی فائل زور سے بند کر دی۔

''وہ...... وہ یہاں غانیہ کو سونے کو بولا ہے اماں نے۔'' اسے باہر جاتے پا کر کنیز نے خائف ہوتے پھنسی پھنسی آواز میں کہا، منیب کو جیسے دھچکا لگا تھا، وہ یکدم رک کر جھٹکے سے مڑا اور اسے بے دریغ گھورا۔

''دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟'' وہ جیسے خود پہ ضبط کھو کر دھاڑا۔

''میں ایک مرد ہو کے پسند نہیں کرتا کہ میرے بستر پہ کوئی انجان خاتون شب بسری کریں، وہ محترمہ انہیں اس بات کا خیال نہیں ہے اور ہاں یہ بستر کی چادر تبدیل کر دینا، الجھن ہو رہی ہے

مجھے۔'' بے لچک تنفر بھرے انداز میں کہتا وہ اگلے لمحے دروازے سے باہر تھا اور سناٹے کی زد پہ آئی ہوئی سب کچھ سنتی غانیہ کا سکتہ اسے روبرو پا کے ہی اک چھناکے سے ٹوٹا، وہ اگر بروقت سرعت سے پیچھے نہ ہٹ جاتی تو یقیناً وہ اپنے دھیان میں اس سے ٹکرا جاتا، ایک لمحے کو تو منیب بھی اس صورتحال سے ساکن سارہ گیا، اس کے کہاں گمان میں تھا کہ وہ یہاں باہر کھڑی ہوگی، اس کے چہرے سے بھاپ نکل رہی تھی اور رنگ بالکل سرخ تھا، محض اک نظر کا تصادم تھا، اگلے لمحے وہ پلٹ کر تیزی سے وہاں سے بھاگ گئی، منیب پھر بھی اپنی جگہ پہ کھڑا رہا، اس کی آنکھوں سے بہنے کو تیار آنسو وقتی سہی مگر ندامت کا باعث ضرور بن گیا، مگر یہ لمحاتی احساس ہی تھا، اگلے لمحے وہ پھر اسی حد تک سفاک ہو چکا تھا، مشتعل ہو چکا تھا۔

''اگر یہ موصوفہ اتنی ہی سہل پسند اور عیش و آرام کی عادی تھیں تو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔'' وہ سر جھٹکتا ہوا باہر چلا گیا۔

غانیہ واپس اسی جگہ آ کے تھم گئی جہاں کچھ دیر قبل وہ کنیز کے ساتھ موجود تھی، برآمدہ لمبا اور سنسان تھا، آخری سرے پہ ایک چارپائی بھی موجود تھی، جس پہ بستر ڈھیر تھے، شاید یہ اتنی سی جگہ اسٹور کا کام دیتی تھی، وہ بے دم سی اسی چارپائی پہ ڈھے گئی، اس کی سماعتوں میں ابھی تک اس شخص کی سرد پھنکاروں کی دھمک اتر رہی تھی، بغیر وجہ کے اس طرح معتوب و ذلیل ہونے کا تو اس کے پاس تصور تک نہیں تھا، جبھی شدید احتجاج اس کے اندر پھیل چکا تھا، وہ اتنی مضطرب اور وحشت زدہ تھی کہ جب تک کنیز اسے ڈھونڈتی وہاں تک پہنچی، شدید غیض اور اضطراب کی کیفیت میں وہ اپنے ہونٹ کچل کچل کر زخمی کر چکی تھی، محض اک نظر میں کنیز اس کے اندر کی کیفیت جان کر بے تحاشا بے چینی محسوس کرتی اس کے پاس آ بیٹھی۔

''ویر کے رویے کی میں معافی مانگتی ہوں غانیہ، وہ دل کا برا نہیں ہے، بس جب بھی کبھار جب بہت پریشان ہوتا ہے تو اسے خود بھی پتا نہیں چلتا اس نے کس سے کیا کہا؟''

کچھ دیر تک بے قرار نظروں سے اسے دیکھتے رہنے اور ہاتھ مسلنے کے عمل سے گزرنے کے بعد وہ بالآخر ہمت مجتمع کر کے بول پڑی، غانیہ کو شدید اختلاف ہوا تھا، جیسے اس بیان سے، جبھی حلق میں بے تحاشا کڑواہٹ گھل گئی، اس نے بولنے سے قبل گلے میں اتری نمی کو اندر اتارا پھر تنک کر بولی تھی۔

''تمہیں معذرت کرنے کی ضرورت نہیں ہے کنیز، ہر انسان اپنے ظرف اور نیچر کے مطابق ہی کسی کے ساتھ برتاؤ کیا کرتا ہے، بیشک تم برا مناؤ مگر میں کہنا چاہوں گی کہ مجھے تمہارا بھائی ہرگز نارمل شخصیت نہیں لگا، بغیر وجہ کے کسی کو اپنے کسی نقصان یا انتقام کا نشانہ بنانا اور ایذا دینا بنکی پن کی علامت ہی سمجھا جائے گا، بہرحال تم ٹینشن فری رہو، رویوں کی پرکھ مجھے بھی ہے، جو کچھ ہوا اس میں تمہارا قصور نہیں میں جانتی ہوں اور پلیز کمرے سے میرا بیگ ضرور ابھی لا دو۔'' اپنی بات مکمل کر کے اس نے ایسے آنکھوں پہ بازو دھر لیا گویا اب مزید بات نہیں کرے گی، کنیز جواب تک بے بس نظر آتی تھی بالکل روہانسی ہو گئی۔

''ارے...... یہاں کیوں...... تم اندر چلو ناں، میں تمہیں پنکھا چلا دیتی ہوں۔'' کنیز بوکھلا کر

بولی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں، تم جاؤ۔'' اب کے اس کا لہجہ اس کی آواز میں رکھائی تھی، اس کا گلا ہر گزرتے لمحے کے ساتھ آنسوؤں سے بھرتا جارہا تھا، کنیز مضمحل سی پلٹ گئی، کچھ دیر بعد لوٹی تو بازوؤں کے حلقے میں صاف ستھرا بستر تھا۔

''غانیہ...... اٹھو...... پلیز بستر تو بچھانے دو مجھے۔'' غانیہ جس کی آنکھوں کی بے تاب نمی کنپٹیوں سے بہہ کر گردن تک اتر چکی تھی پھر سے اس کی موجودگی محسوس کرتی ساکن ہو کر رہ گئی، غیر محسوس انداز میں اس نے نمی کو آستین سے پونچھا اور قدرے تاخیر سے اٹھی، نیم تاریکی کے باوجود کنیز اس کی نم بھیگی پلکوں کو محسوس کرتی دل کو کتنا بوجھل پا رہی تھی، اس کا بس نہ چلا خود سے نظریں چرائی اس میدے جیسی اجلی چاندنی جیسی شفاف نازک لڑکی کو اپنے بازوؤں میں بھر لے، کتنی دلربائی تھی اس کے ہر نقش میں، کیسی سحر انگیزی تھی اس کی سیاہ گھور آنکھوں میں، خمیدہ دراز پلکیں جو اضطرابی کیفیت میں بار بار اٹھتی گرتی تھیں اور اس نیم اندھیرے میں جگمگ جگمگ کرتا ہوا اس کا جھلملاتا ہوا چاندی جیسا سراپا گویا دنیا کی ساری خوبصورتی اور حسن سمٹ کر یہیں آ گیا تھا۔

لیکن اک وہ ویرمنیب تھا جسے شاید اب کچھ نہیں بھاتا تھا، پتا نہیں وہ لڑکیوں سے اتنا بدکنے کیوں لگا تھا، کیوں اتنی خار کھانے لگا تھا، وجہ تو واضح تھی، وہ جانتی بھی تھی، مگر یادداشت پہ ٹھہری گرد کی طرح اس وقت کی ناخوش گوار یت کو جھاڑ کر پھر سے اٹھانا پھیلانا نہیں چاہتی تھی، جبھی بستر بچھا کر پیڈسٹل فین چلا کر وہاں سے بوجھل قدموں سے لوٹ گئی، ویرانی ویر کے کمرے سے ہی نہیں اس کے دل سے بھی لپٹی ہوئی تھی۔

☆☆☆

انہوں نے نماز کے بعد سلام پھیرا اور دعا کو ہاتھ بلند کر دیئے، دل بھاری تھا غم سے پھٹنے کو تیار...... آنکھ کی نمی بے قراری سے پلکوں کی دہلیز پھلانگتی گالوں پہ اتر آئی، ان کی ہر دعا کا مرکز ان کا راج دلارا ان کا بھائی ہی ٹھہر رہا تھا، معاً راہداری کے آخری سرے پہ ہونے والی آہٹ جس پہ ان کے کان ہمہ وقت لگے رہتے تھے انہیں چونکا گئے، منہ پہ عجلت میں ہاتھ پھیرتے وہ جائے نماز تہہ کیے بغیر اٹھی تھیں اور لپک کر دروازے تک آئیں۔

سیاہ شکن آلود لباس میں دراز قامت ان کا بے حد وجیہہ و شکیل بھائی کی محض ایک جھلک ہی نظر آ سکی، وہ تڑپ کر پیچھے لپکی تھیں۔

''مون...... مون...... میری بات سنو۔'' وہ بھاگ کر ان کے پیچھے پورٹیکو تک آئیں مگر تب تک وہ گاڑی میں بیٹھ کر جا چکا تھا، وہ سخت روہانسی ہوئیں وہیں سیڑھیوں پہ بیٹھ کر سر تھام گئیں، اتنے دنوں بعد وہ کمرے سے نکلا تھا، وہ بھی اس طرح کہ وہ اس کی شکل دیکھ سکیں نہ آواز سن پائیں، دکھ کی شدتوں کے باعث ان کے رکے ہوئے آنسو پھر سے بہہ نکلے۔

''بی بی جی؟ آپ کے لئے فون ہے۔'' ملازمہ اطلاع سمیت حاضر تھی، انہوں نے بے دلی سے سر اٹھایا تو چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

''کون ہے؟''

''تحریم بی بی ہیں۔'' ملازمہ کے جواب پہ وہ یکدم اٹھ گئیں، تیز تیز چلتیں فون اسٹینڈ تک آئیں، جہاں ریسور کریڈل کے ساتھ الٹا رکھا ہوا تھا۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام آپا! بھائی جان کا بتائیں مجھے، سخت پریشانی ہو رہی ہے ان کی طرف سے۔'' تحریم چھوٹتے ہی بولی تھیں، انداز میں فکرمندی بھی تھی اضطراب بھی۔

''کیا بتاؤں بہن؟ ہنوز یہ صورتحال۔'' ان کی گلوگیر آواز مزید بھرا گئی۔

''کیا مطلب؟'' تحریم ٹھٹکیں۔

''بھائی کہاں ہیں؟''

''چلی گئی۔'' وہ سسکیں۔

''بچے؟'' تحریم کی آواز پھنس سی گئی، انہوں نے سرد آہ بھری۔

''لے گئی ساتھ ہی ڈائن۔'' وہ مزید خود پہ ضبط نہ کر سکیں اور بے ساختہ پھپھک کر رو پڑیں، دوسری جانب تحریم پہ جیسے غم و غصے کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، بولنے کے قابل بھی نہ رہی۔

''بھائی جان کیا کر رہے تھے؟ بچوں کو کیسے جانے دیا؟'' تحریم بپھر سی گئی تھی اس اطلاع پہ۔

''بیٹا ماں کے بغیر نہیں رہتا تم جانتی ہو، اتنا سمجھدار تو ہے، دوسرا بچہ کیا وہ بیچارا اس منحوس کا پیٹ پھاڑ کر نکال لیتا۔'' وہ کلس کر بولی تھیں، تحریم یوں خاموش تھیں جیسے کچھ کہنے کو باقی نہ رہا ہو۔

''اب کیا ہوگا آپا، ہمارا ایک ہی بھائی ہے، یہی بچے ہمارا کل اثاثہ تھے، ہر صورت بچے واپس لائیں، ہماری نسل ہے وہ۔'' تحریم ضبط گنوا کر رو پڑیں، ان کے آنسو تو بدستور بہہ رہے تھے۔

''آج تین دنوں کے بعد نکلا ہے مون کمرے سے، نہ کچھ کھایا نہ پیا گھر سے چلا گیا، اللہ جانے کیا ارادے تھے۔'' ان کے اندر کا تہم ان کی آواز سے عیاں تھا۔

''ضدی تو اتنے ہیں لالہ، ہزار لڑکیاں تھیں جو آپس مند تھیں، مگر شادی اپنی مرضی سے کی، انجام دیکھ لیا؟ ایسی عورتیں گھر نہیں بسایا کرتیں۔'' تحریم بیک وقت غم و غصے کا شکار تھی۔

''اچھا چھوڑو، اللہ سے دعا کرو بہتری کی، میں کب تک اپنا گھر بار چھوڑے یہاں بیٹھی رہوں گی، مون کوئی حتمی فیصلہ کرے تو میں بھی واپس سدھاروں ان کا روز فون آتا ہے۔'' انہوں نے شوہر کا حوالہ دے کر بات سمیٹی، تحریم محض سرد آہ بھر کے رہ گئی۔

☆☆☆

اگلی صبح اس کی آنکھ گھر میں گونجتے مختلف شور اور آوازوں سے کھلی، ساری رات مچھروں کی یلغار اور گرمی کی شدت کے باعث وہ بہت بے چین رہی تھی، ایک لمحے کو بھی مجال ہے آنکھ لگی ہو، حالانکہ بیچاری کنیز نے تو اپنے تئیں اسے آرام فراہم کرنے کی پوری کوشش کی تھی، مگر وہ سہولیات کی عادی تھی، یہاں بے آرام رہی تھی تو کچھ ایسا عجیب بھی نہیں تھا، اس نے کسلمندی سے کروٹ بدل کر آنکھیں کھولیں تو گاؤں کے مخصوص ماحول کی نکھری ستھری خوش گوار صبح اپنی تمام تر تازگی کے ساتھ مسکرا رہی تھی، بیری کے درخت کے چھوڑے تنے سے اسی پل ایک گلہری منہ میں روٹی کا ٹکڑا دبائے بھاگتی دیوار پار غائب ہو گئی۔

''کنیز بیٹے غانیہ کو جگا دیا ہوتا۔'' اس نے صحن سے پپا کی آواز سنی، مگر خفگی اتنی شدید تھی کہ گردن موڑ کر اس جانب نہیں دیکھا۔

اس کے خیال میں کل شام سے رات تک جتنی بھی اس کی ذلت ہوئی اس میں سارا ہاتھ ہی پپا کا تھا، انہیں ہی شوق تھا اسے اپنے رشتوں سے ملانے کا، نہ وہ رات رکتے نہ وہ کم ظرف انسان اتنی معمولی بات پہ اسے دو کوڑی کا کر کے رکھتا، اس نے لیٹے لیٹے یونہی نگاہ کا زاویہ بدل کر بیری کے درخت کی شاخوں کو کھوجا، جن سے چھنتی سورج کی شفاف روشنی بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی، پر اب رات دمکنے والے جگنوؤں کا کہیں نشان تک نہیں تھا، منڈیر پہ بیٹھا کوا اپنی کریہہ آواز سے فضا کے خاموش سینے پہ سلوٹیں ڈالنے لگا، اس نے بوجھل سانس کھینچا اور اٹھ کر بیٹھتے ہوئے ہاف سلیوز سے جھانکتے اپنے بازوؤں پہ نگاہ کی، سفید مخملیں بے حد شفاف و گداز مرمریں کلائیوں پہ جگہ جگہ مچھر کے کاٹے کے سرخ نشان نمایاں تھے، جنہیں سہلاتے اس کے چہرے پہ کدورت اور بے بسی پھیل گئی، کیچر کی گرفت سے آزاد شانوں پہ بکھرے بالوں کو خفیف سے جھٹکے سے پیچھے گراتے اس نے کس احساس کے تحت بے اختیاری کی کیفیت میں پلکیں اٹھائی تھیں، مگر دل تلخی و تنفر سے بھر گیا، تنے ہوئے نقوش اور سلگتی آنکھوں میں ناگواریت کا گہرا تاثر لئے وہ اپنے کمرے کی دہلیز پہ کھڑا اس کی سمت ہی متوجہ تھا، بلکہ باقاعدہ گھور رہا تھا، انداز کی حقارت اتنے فاصلے سے بھی محسوس کی جانے والی تھی، غانیہ سے نگاہ چار ہوتے ہی اس نے بے حد تنفر سے نگاہ کا زاویہ بدلا اور جھٹکے سے پلٹ کر وہاں سے چلا گیا، غانیہ کو ایک بار پھر شدید دھچکا لگا تھا جیسے، وہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی، اس درجہ کدورت کی وجہ کا سرا ڈھونڈتی ہوئی جو ظاہر ہے ملنے سے رہا تھا تبھی جھنجھلا گئی۔

(لگتا ہے پاگل ہے، جاہل انسان، کیوں پیچھے پڑ گیا ہے میرے، بس چلے تو شاید زبان کے نشتروں اور نظر کے تیروں سے مار ڈالے)

کنیز اسے جاگتے پا کر اس کے پاس آ کر خفیف سا مسکرائی، صحن کے کونے میں موجود واش روم میں جانے اسے بہت الجھن بہت خفت محسوس ہوئی تھی، باہر آئی تو کنیز ہاتھ میں صاف ستھرا تولیہ اور صابن لئے اس کی منتظر تھی، اسے دیکھ کر ہنڈ پمپ کی طرف اشارہ کیا۔

''وہاں آ جاؤ منہ ہاتھ دھلوا دوں۔'' اس کے انداز میں جو پذیرائی و محبت تھی وہ اب غانیہ کو گزشتہ رات کا ازالہ محسوس ہوئی بوجھ لگنے لگی۔

''رہنے دو، میں خود کر لوں گی۔'' غانیہ نے صابن اس کے ہاتھ سے لیتے نلکے کی ہتھی سے کنیز کا ہاتھ ہٹانا چاہا، تو کنیز نرمی سے مسکرا دی۔

''تم سے نہیں چلے گا۔''

''کیوں نہیں چلے گا؟'' غانیہ نے صاف صاف برا منایا اور زبردستی اس کا ہاتھ ہٹا کر نلکے کی ہتھی کو پکڑ کر زور زور سے اوپر نیچے کیا، پائپ کے منہ سے پانی کی دھار دو جھٹکے کھا کر چھوٹے سے پختہ فرش پہ گری جس کے اطراف پڑھی اینٹ کی حد بندی کر کے اسے کھرے کی شکل دے دی گئی تھی۔

چھینٹے دور تلک اڑے، غانیہ نے جیسے اس پہ جتلاتی نگاہ ڈالی، گویا اپنے کارنامے پہ داد چاہی،

جواباً کنیز بے ساختہ ہنس دی تھی، یونہی ہنستے ہوئے وضاحت بولی تھی۔

''لیکن تم اسے چلانے اور منہ دھونے کا کام اک ساتھ نہیں کر سکتیں۔'' وہ گویا اس کی ناتجربہ کاری پہ محظوظ ہو رہی تھی جو غانیہ کو بالکل اچھا نہیں لگ سکا۔

''کیوں نہیں کر سکتی آخر؟ تم جاؤ خود ہی کروں گی میں۔'' وہ خفیف سی جھلاہٹ سمیت خود سری سے بولی، اس سے قبل کہ کنیز کچھ کہتی تب سے یہ بے کار بحث سنتا ہوا منیب برہم و درشت انداز میں مداخلت کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''تمہیں خدمت خلق کے اس شوق سے فی الحال ہاتھ ضرور کھینچ لینا چاہیے کنیز فاطمہ! وہ بھی اس صورت میں جبکہ سامنے والا نہ صرف بدمزاج بلکہ کسی کا احسان بھی قبول کرنے پہ آمادہ نہ ہو۔'' سرد سنجیدہ لہجہ ترچھا کاٹ دار انداز اہانت و تضحیک تو جیسے لازم و ملزوم تھے اس کے لہجے میں پھندنے ٹانکنے کے لئے، غانیہ کی پشت اس جانب تھی جبھی وہ اسے دیکھنے سے قاصر رہی تھی، مگر ایک بار پھر بغیر کسی قصور یا غلطی کے ہونے والا حملہ اسے ضرور شل کر کے رکھ گیا۔

وہ جیسے کرنٹ کھا کر پلٹی تو نگاہ اس کے سرد چہرے سے جا ملی، جہاں تاثرات میں امنڈنے والی حقارت کے سوا اور کوئی جذبہ نہیں تھا، اس نے کچھ بولنا چاہا، مگر غم و غصے رنج کی شدید کیفیت کا ایسا شدید اثر تھا کہ زبان جیسے گنگ محسوس ہوئی، کنیز البتہ بہت گھبرا گئی تھی۔

فی الفور پلٹی تو چہرے پر بے بسی رقم تھی، یوں جیسے جانا نہ چاہتی ہو مگر اس شخص کے سامنے انکار کی تاب بھی نہ ہو، اس کی نگاہ غانیہ سے ملی تو آنکھوں میں خفت کے ساتھ معذرت اور نمی بھی صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

''مجھے کتنی دیر ہو رہی ہے، اندازہ ہے تمہیں؟'' وہ کنیز پہ برسا تھا، کنیز نے اک نظر اسے دیکھا، اس نگاہ میں شکوہ رنج خفگی کیا کچھ نہ تھا، مان رکھنے والے اگر مان توڑنے لگیں تو انہیں کیسے روکا جا سکتا ہے، وہ جانتی تھی ایسا وہ کب کرتا ہے، وہ اس سے خفا نہیں تھی، شاید ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

''آپ کی روٹی پکا کے رکھی ہے میں نے۔'' وہ محض منمنائی۔

''صرف پکانے سے کیا ہوتا ہے، نکال کر دو گی تو کھاؤں گا ناں۔'' وہ پھر بلاوجہ بھڑکا، کنیز اب کے کچھ نہیں بولی، اس کی روٹی جو گھی سے تر بتر تھی چنگیر میں رکھی، کٹوری دہی سے لبریز کی ساتھ میں اچار نکال دیا، سلور کا بڑا گلاس چاٹی سے لسی کا بھرا اور ناشتہ اس کے سامنے پیش کر دیا، اب وہ چائے گرم کرنے کو رکھ چکی تھی، ساتھ ابلے ہوئے انڈے چھیل رہی تھی۔

''تمہیں میں نے وہ کاٹھ کباڑ کمرے سے لے جانے کو کہا تھا، ابھی تک وہیں دھرا ہے۔'' وہ شریں ناشتہ کرتا بھی زہر ہی اگل رہا تھا، کنیز چونک سی گئی۔

''کون سا کاٹھ کباڑ؟'' جواب میں منیب نے کچھ کہنے کے بجائے محض اسے گھورا۔

''وہ...... غانیہ کا سامان۔'' وہ کھسیانی، منیب نے بے بسی کے ساتھ غصے کا بھی گھونٹ بھرا۔

''وہ بیگ میں ڈال تو دیا تھا میں نے۔'' کنیز کے جواب پہ اس نے گلاس پٹخ دیا۔

''اور وہ بیگ ابھی تک وہیں پڑا ہے، خدمتوں سے فرصت ملے تو اور بھی کہیں جھانکو۔'' وہ بدمزگی و بداخلاقی کی انتہا پہ تھا۔

''چائے تو پی لو دیر۔'' اسے اٹھتے پا کر کنیز بوکھلائی۔

''پورے دس منٹ برباد کرائے تم نے، اب وقت بالکل نہیں ہے میرے پاس۔'' وہ اسی ناراضگی سے کہتا باہر نکل گیا، غانیہ خاصی تاخیر سے خود کو سنبھال کر اس قابل ہو سکی تھی کہ کنیز کو دیا چیلنج قبول کر سکے، مگر اس کام میں وہ جتنا تنگ ہوئی پھر ہی جان سکی تھی کنیز نے کچھ غلط بھی نہ کہا تھا، صابن لگے ہاتھوں سے نلکا چلانا کم از کم اس کے لئے اک دشوار مرحلہ ضرور تھا، جب کر بھی لیتی تو پانی تک جب رسائی حاصل کرتی وہ اسے اپنی پہنچ میں آنے کی اجازت دیئے بغیر کھرے کی پختہ زمین پہ گر کر اپنی حیثیت کھو بیٹھتا اور غانیہ محض جھنجھلاتی رہ جاتی۔

''چیلنج قبول کرنا آسان مگر اسے اچیو کرنا اسی قدر دشوار ہوا کرتا ہے بی بی، مگر آپ غالباً جوش میں حواس کو رخصت کرنے کے قائل ہیں۔'' جھلائے ہوئے انداز میں پاؤں پٹختے اس نے زہر میں بجھی یہ ملامتی آواز سنی اور اسی زاویے پہ جامد ہو کر رہ گئی، معاً تحیر کے عالم میں نا چاہتے ہوئے بھی پلٹ کر دیکھا، نک سک سے درست تاؤ جی کا یہ سپوت اک نئے مگر دلکش اور چھا جانے والے روپ میں روبرو تھا، مگر بات کرنے کے طریقے سے دیکھنے کا انداز تک وہی بے رحم سفاک اور جارح تھا، غانیہ نے اندر اٹھتا طیش دبا لیا، وہ لب بستہ کھڑی رہی تھی، اپنی ضد یا بھرم کو قائم رکھنے والی اس کوشش نے اسے خاصے بے ڈھنگے انداز میں بھگو ڈالا تھا، جبھی اس بدمزاج غصیلے آدمی کو پھر سے اس پہ طنز کا موقع ہاتھ لگا، وہ جا چکا تھا، غانیہ اسی پوزیشن میں کھڑی تھی، وہ یہ نہیں سوچ رہی تھی وہ شخص ایسے کیوں کر رہا تھا، وہ یہ سوچ رہی تھی صرف اسی کے ساتھ کر رہا تھا؟

☆☆☆

رات تاریک اور سرد تھی، اتنی سرد کہ آتش دان میں دہکتی آگ اور وجود پہ لپٹا دبیز کمبل بھی اس سرد پن کو ختم کرنے سے قاصر تھا، اس نے کروٹ پھر بدلی اور منہ تکیے میں دے لیا۔

نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی، بس کچھ آہٹیں تھیں، کچھ آوازیں تھیں اور کچھ سرگوشیاں بھی، پیار بھری سرگوشیاں، وہ اتنی بے قراری محسوس کر رہی تھی کہ اٹھ کر بستر چھوڑ دیا، اس کا شب خوابی کا لبادہ سرسرایا اور ریشمی پنڈلیوں تک ڈھلک گیا، لمبے گھنیرے سنہرے بال نازک پشت پہ آبشاروں کی مانند گرے تھے، کھڑکی کے نزدیک آ کر اس نے پردہ سرکایا، گلاس ونڈو باہر پھیلے دھند لے غبار سے دھندلایا جا رہا تھا۔

''کس قدر تاریک رات ہے۔'' اس کا دل بھر آیا، اس نے سر اٹھا کر آسمان سے کوئی تارہ کھوجنا چاہا، آسمان پہ چاند نہیں تھا۔

''زندہ رہنے کے لئے چاند کتنا ضروری ہے، چاند نہ ہو تو۔'' اس نے سر یخ بستہ گلاس ونڈو سے ٹیک دیا، اک آنسو ٹپکا اور دور تلک پھیل گیا۔

''اگر کوئی چاند کو خود ہاتھوں سے نوچ کر پھینک دے تو؟ میں نے خود تمہیں نوچ کر پھینکا، میں نے خود.....'' اس کی سسکیاں بڑھی تھیں، وہ بے ساختہ رو دی۔

''میں نے خود کو خود اندھیروں کے حوالے کیا، یہ جانے بغیر کہ چاند کے بغیر گزارہ ممکن نہیں۔'' وہ اب شدتوں سے رو رہی تھی، اسے گنوا کر اس نے اب تک ایک ہی کام ڈھنگ سے کیا تھا،

رونے کا کام، یہ ہی کام وہ ابھی پوری دل جمی سے کر رہی تھی۔

عین عشق کمائی وچ نشر ہوئی
ردی گئی میں دین ایمان وچوں
شام ویکھدیاں شام قضا ہوئی
بھل گئی نماز دھیان وچوں
چڑھی شوق شراب دی آن مستی
کلمہ پڑھاں میں کیڑی زبان وچوں
محمد بوٹیا یار دی ویکھ صورت
گئیاں سورتاں بھل قرآن وچوں

وہ انہی اشعار کی زندہ تفسیر تھی، وہ واقعی عتاب زدہ تھی۔

☆☆☆

کل شب گلی میں میں نے
موت کو دیکھا
وہ بالکل اس زندگی جیسی تھی
جیسی زندگی میں
تمہارے بغیر جی رہا ہوں

اس کے کمرے میں بے حد اندھیرا تھا، قبر جیسا اندھیرا، گمبھیر، ہولناک، جہازی سائز بیڈ پر وہ بالکل ساکن لیٹی تھی، مگر اس کے دل و دماغ میں ویسا ہی اضطراب تھا جیسا گاؤں میں گزاری اس شب اس کے اندر سرسراتا رہا تھا، حالانکہ یہ اس کے تمام تر جدید سہولیات سے مزین لگژری بیڈ روم تھا، جس میں اے سی کی کولنگ سے لے کر فضا میں پھیلا ایئر فریشنر تک سب کچھ اس کی پسند اور ذوق کے عین مطابق تھا، مگر سکون پھر بھی وہیں رہ گیا تھا، وہیں اسی پسماندہ گاؤں کے بے حد پسماندہ سے گھر میں، کتنے دن ہو گئے تھے اسے گاؤں سے لوٹے۔

کتنے ہی دن ہو گئے تھے، اس جان لیوا وحشت میں مبتلا کر دینے والے انکشاف کو سہتے، جسے وہ خود بھی قبول کرنے میں متامل رہی تھی، مگر کب تک؟

اس نے جانا تھا وہ اس شخص کی بد مزاجی سے لے کر ہر طنزیہ جملے کو اگر وہاں خاموشی سے سہہ آئی تھی تو اس کے پیچھے بھی اس جذبے کا آغاز کارفرما تھا۔

اسے اعتبار نہ آتا تھا وہ اس شخص سے محبت کر بیٹھی ہے، جو اس سے اللہ واسطے کا کوئی بیر باندھ چکا ہے، جس کی بد مزاجی سے غرور و تکبر تک کا ہر احساس اسی کے لئے وقف تھا، کیوں؟

یہ کیوں ایسا جال تھا جس میں وہ اس کھوج میں پھنس گئی تھی، جس سے نکل نہیں پا رہی تھی کہ اتنا ہی سوچا تھا اس نے اسے کہ بس اس کو سوچنے کے قابل رہ گئی۔

یہ بھی نہیں تھا کہ اس شخص میں محبت کے قابل کچھ نہیں تھا، وہ تو تھا ہی ایسا کہ اسے دیکھا جائے اور محبت ہو جائے، یہ اس کا رعب حسن ہی تو تھا کہ وہ ہر بار اس سے سامنے اپنی زبان کو گنگ ہوتا

محسوس کرنے لگتی تھی، عجیب یہ ہوتا کہ اسے دیکھا جائے اور پھر بھی محبت نہ ہو، یہی ممکن نہ تھا، حالانکہ اس شخص کے کسی رویئے میں بھی ایسی گنجائش نہ نکلتی تھی کہ کسی ایسے احمقانہ جذبات کی آبیاری کا امکان پیدا ہوتا، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ محبت ہی وہ سرکش و بے لگام جذبہ ہے جو اختیار سے ہمیشہ باہر رہا ہے اور ہمیشہ وہیں نمو پاتا ہے جہاں سے بدلے کی گنجائش نہ نکلتی ہو، وہ اس تلخی کی حد تک سفاک حقیقت کو پا گئی، تو ہار گئی، یہ سوچ اسے رلانے کو کافی تھی آیا وہ اس شخص کے کس انداز پہ خود کو لٹا آئی۔

ایک اور بھی تکلیف دہ پہلو تھا کہ اس سفر پر خار کا انجام کیا ہونا تھا، اذیت انگیز بات یہ تھی کہ وہ بہر حال اس شخص کے آگے پسپا ہو گئی تھی جس کے دل میں محبت تو دور کی بات وہ اسے عزت کی نگاہ سے بھی نہیں دیکھتا، بلاشبہ محبت ازل سے مشکل راستوں کو ہمسفر کرتی آئی ہے مگر اس کے نصیب میں شاید کچھ اضافی کٹھنائیاں تھیں، صرف اس شخص کے مزاج کے رنگ ہی انوکھے نہیں تھے، اس کی قسمت کہ اس کے اپنے گھر میں بھی اس کے خلاف اک محاذ کھل جانا تھا، لیکن ان گزرنے والے دنوں نے اسے اس کی شدت نے یہ ضرور جتلا دیا تھا کہ اسے ہر صورت یہ کٹھنائیاں طے کرنی ہیں، ہر رکاوٹ کو عبور کرنا ہے اور ہر مشکل کو سہہ جانا ہے، کچھ بھی ہو جاتا مگر...... منیب چوہدری سے دستبرداری کو دل آمادہ نہ تھا، نہ ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

شام دھیرے دھیرے ڈھلنے لگی، افق کے پار سورج ڈوب رہا تھا، آتشی گلابی رنگ کی ایک واضح لکیر گاڑی کے ساتھ ساتھ بہت دور تک دوڑتی رہی، صحرا جیسے وسیع آسمان پر قدرت نے چراغ جلا دیا تھا، جو افق کے پار دور تک آسمان کو جلا دینا چاہتا تھا، مغرب کا وقت تھا، اس نے اپنی جلتی ہوئی آنکھیں رگڑ ڈالیں، واچ مین اسے دیکھ کر مودب ہو کر جھکا اور لپک کر گیٹ کھولنے لگا، گاڑی بجری کی سرخ روش پہ پھیلتی سفید ستونوں کی چھت والے وسیع پورٹیکو میں جا رکی، وہ جیسے ہی دروازہ کھول کر باہر آیا اس کے انتظار میں سوکھتیں وہ تیزی سے اس کے راستے میں آ گئیں۔

''آ گیا میرا بیٹا!'' انہوں نے شفقت و محبت سمیت کہتے اس کے مضبوط چوڑے شانوں کو چھوا، وہ تھکا ہوا مضمحل لگتا تھا، ہاتھ میں موجود خوبصورت کور سے سجی فائل دوسرے میں منتقل کرتے سرخ و سفید چہرے سے نادیدہ پسینہ پونچھنے لگا، قدموں کی رفتار ہنوز تھی، نہ بہت تیز نہ سست، آنکھوں پہ سن گلاسز تھے، جو بہت جچتے تھے اسے، اس پہ اس کی باوقار شاہانہ چال، وہ کسی ریاست کا شہزادہ لگتا تھا، دراز قامت، غضب کا مردانہ روپ، ٹھٹکا دینے والی پرسنالٹی، آنکھوں کا حسن تو جان لیوا تھا، ان کا دل دکھ کے انوکھے احساس سے لبریز ہونے لگا، (کوئی ایسے حسین چہرے سے بھی نفرت کر سکتا ہے؟) انہوں نے دکھ میں مبتلا ہوتے اچنبھے میں خود اپنے آپ سے سوال کیا تھا۔

''کچھ کھاؤ گے؟'' وہ اس کے ہمراہ چلتیں اس کے کمرے تک آ گئی تھیں، وہ فائل رکھ کر دراز لاکڈ کر رہا تھا، یونہی جھکے جھکے سر کو نفی میں ہلا ڈالا، انہوں نے ہونٹ بھینچ لیے۔

''تو کیا جوگ لو گے اس حرافہ کی خاطر؟'' وہ بالآخر پھٹ پڑیں، بلکہ پھوٹ کر رو دیں، وہ جیسے کھڑا تھا اسی زاویے پہ ٹھہرا رہ گیا، معاً پلٹا تھا اور انہیں شانوں سے تھام لیا، مگر وہ تو ننھی سی

بچی کی مانند اس کے چوڑے سینے سے لگ کر بے حال ہونے لگیں۔

''نہیں دیکھی جاتی یہ حالت مجھ سے تمہاری، مون اولاد سے بڑھ کر تمہیں چاہا، کیوں خود کو برباد کرتے ہو بتاؤ؟'' وہ رو رو کر ہلکان ہوئی جاتی تھیں، اس نے ان کا چہرہ بہت نرمی و رسان سمیت ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔

''اپنے بھائی کو اتنا کمزور سمجھتی ہیں آپا؟'' وہ بہت کرب سے مسکرایا، گلاسز اتر چکے تھے، اب جان لیوا حسن کی مالک آنکھوں کی تباہ کن خوبصورتی اور حزن نمایاں تھا۔

''میں ہرگز برباد نہیں کر رہا خود کو، نہ کوئی جوگ لوں گا، ٹیک اٹ ایزی۔'' وہ ان کے آنسو پونچھ رہا تھا، انہیں قدرے سکون آیا، مگر غیر یقینی اپنی جگہ تھی۔

''پھر یہ سب کیا ہے؟'' وہ شاکی ہوئے بغیر نہ رہ سکیں، اب کے اس نے جواباً ہونٹ بھینچ لئے۔

''اماں کی وفات کے بعد یہ دوسرا کٹھن مرحلہ ہے میری زندگی کا آپا، تھوڑا وقت دیں، میں خود کو سمیٹ لوں۔'' وہ نظریں چرا رہا تھا، انہوں نے بغور اسے دیکھا، گویا اس کے اندر کا بھید پانے کی متمنی ہوں۔

''کیا کرنے والے ہو مون؟'' وہ ہولنے سی لگیں۔

''جو وہ چاہتی ہے۔'' وہ بوجھل آواز میں کہہ گیا اور یوں بیٹھ گیا جیسے بہت تھک گیا ہو۔

''یعنی طلاق دے دو گے؟'' سوال کرتے انہیں لگا خود اپنا کلیجہ نوچ رہی ہوں، اب کی بار جواب میں محض سر ہلایا گیا، وہ گنگ سی اسے دیکھتی رہیں، انہیں اس کی شادی کا دن یاد آیا، جب سب کی مخالفت کے باوجود دونوں اک دوسرے کو پا کر بے حد مسرور تھے۔

''اور بچے؟'' وہ جیسے سہمی سہمی بولیں، جانتی تھیں وہ کرتا وہی تھا جو اس کا اپنا دل چاہے، باقی کوئی لاکھ سر پٹخ لے، اب بھی اس کی ہاں ناں میں گویا اس کی زندگی کا فیصلہ مشروط ہوا۔

''بچے بھی۔'' جواب مل گیا اور وہ بے جان ہوتی یوں بیٹھ گئیں جیسے کبھی کھڑی نہیں ہو سکیں گی۔

''یہ کیسے کر سکتے ہو تم مون؟'' وہ بے ساختہ و بے اختیار رو پڑیں۔

''قانونی تقاضا ہے آپا! مجبوری ہو گی، جبھی تو یہ فیصلہ اتنا کٹھن ہو رہا ہے میرے لئے۔'' اس کی آواز مزید بوجھل ہو گئی، کمرے میں جیسے موت کا سناٹا چھا گیا، اس کے بعد بہت دیر بیت گئی دونوں سے کوئی نہیں بول سکا، وہ خاتون تھیں رو سکتی تھیں، وہ مرد تھا کیسے رو لیتا، وہ نہیں رو سکتا تھا۔

☆☆☆

شدت درد میں آئی نہ کوئی کمی رات بھر
درد پھر درد رہا الٹا بھی لکھا سیدھا بھی لکھا

اس کی کیفیت بے حد بے دھیانی کی تھی، اسی غفلت بھرے انداز میں وہ کانٹے سے سلائس کو بھنبھوڑ رہی تھی، اسی غفلت میں مما کی نظروں کا عمیق جائزہ بھی ڈوبتا جا رہا تھا، جو عام حالات میں اسے خائف کرنے کو کافی ہوا کرتا، انہوں نے جوس کا سیپ لے کر بلوریں جار واپس میز پہ رکھ دیا،

مگر اس طرح کہ شیشے سے شیشہ ٹکرانے کی آواز پیدا ہو، وہ چونک جائے اور ان کی خفگی کو محسوس کرے، لیکن وہ غافل تھی، غافل رہی پچھلے پندرہ منٹ سے اس کی یہی کیفیت تھی، وہ اسی طرح ناشتے کی میز پہ موجود تھی، اس کے سامنے دنیا کی بہترین نعمتیں بجی ہوئی تھیں، مگر وہ ان سب سے غافل تھی، ان سمیت وہ کیسے برداشت کرتیں۔

اس سے قبل بھی جب انہوں نے اسے چائے بنانے کا کہا تو چائے ٹی پاٹ سے کپ میں انڈیلتے وہ بے خیال تھی، اتنی ڈالی کہ چائے کپ کے کناروں سے چھلک گئی، وہ تب ہڑبڑائی تھی، مستعد ملازمہ نے باسرعت کپ اس کے سامنے سے ہٹایا میز صاف کی، تب سے اب تک غانیہ کے حلق سے کچھ نہیں اترا تھا، مما جو اسے دو سے تین بار ٹوک چکی تھیں اس کی کیفیت کو اچنبھے و تشویش کی نگاہ سے دیکھتے غصے سے بھرنے لگیں۔

''کالج کیوں نہیں جا رہی ہو غانیہ؟ یو نو واٹ تمہارے ایگزیم قریب ہیں مگر تمہیں ہوش نہیں ہے، یعنی حد ہو گئی صاحبزادی کو اس کے ایگزیم کے متعلق بھی مجھے انفارم کرنا پڑ رہا ہے۔'' تمام تر ضبط کے باوجود اس کا لہجہ کڑا اور درشت ہو چکا تھا، غانیہ یوں چونکی گویا گہری نیند سے ہڑبڑا کر جاگی ہو اور خالی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی، مما کو جزاغ پا کرنے کا باعث اس کی نظروں کا یہی استفہامی انداز تھا، یعنی یہ اہمیت تھی اس لڑکی کے نزدیک ان کی باتوں کی۔

''کچھ سمجھ تو نہیں آئی ہو گی تمہیں کہ کیا بکواس کر رہی ہوں میں؟'' وہ جس طرح ابلیں جس طرح تڑکی تھیں، غانیہ صرف سنبھلی نہیں خائف بھی نظر آنے لگی، مما کا رویہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا تھا مگر وہ اپنے اصولوں میں بہت سخت تھیں۔

''آج پھر اتنا لیٹ جاگی تم کہ کالج ٹائم اوور ہو چکا تھا، آخر چاہتی کیا ہو تم؟'' جس وقت مما اسے اتنے کڑے انداز میں جھاڑ جھپاڑ رہی تھیں پپا اسی پل تیار ہو کر ڈائننگ ہال میں آئے تھے۔

''کچھ تو فضہ اور اسد سے عقل سیکھی ہوتی، ماشاءاللہ دونوں ہائر ایجوکیٹڈ ہیں، امریکہ جیسے ملک میں دونوں ہی اعلیٰ پوسٹ پر ہیں، اک تم ہو، مجھے نہیں لگتا گریجویشن بھی کمپلیٹ کر سکو، کل فضہ کا فون آیا، نواب زادی اپنے کمرے سے نہیں نکلی۔'' مما کا غصہ کسی طور کم ہوتے میں نہیں آ رہا تھا، آخری شکایت پپا سے ہی لگائی، کرسی کھینچ کر نشست سنبھالتے پپا دانستہ کھنکارے اور نگاہوں ہی نگاہوں میں گویا غانیہ سے اس گرج چمک کی وجہ دریافت کرنی چاہی مگر جواب میں وہ محض آنسو بھری نظروں سے ہی انہیں دیکھ سکی۔

''ہو کیا گیا بیگم صاحبہ! ارلی مارننگ ہماری گولڈن فیری کی اتنی سخت کلاس کیوں لگا دی آپ نے؟'' انہوں نے اپنے لئے مگ میں چائے نکالتے مداخلت ضرور کی مگر اسی کے حق میں تو مما کا جلال مزید بڑھا۔

''ابھی سے سن لیں، اس معاملے میں آپ کچھ نہیں بولیں گے جمال! پہلے ہی آپ کا لاڈ پیار سے اول درجے کی نکمی بنا چکا ہے، تین ماہ بعد پورے اٹھارہ سال کی ہو جائے گی مگر اب تک۔''

''ہو جائے گا گریجویشن بھی مسز! لیکن پلیز اس وقت تو بچی کو ناشتہ کرنے دیں دیکھیں میری شہزادی کا کتنا سا منہ نکل آیا ہے۔'' پپا نے نرمی سے ٹوکتے سائیڈ پھر بھی اسی کی لی تو مما انہیں

گھورے بغیر نہ رہ سکیں۔

''یہ اتنا سا منہ میری وجہ سے نہیں اس دن سے لٹکا ہوا ہے جس روز سے گاؤں سے لوٹی ہے، کچھ کھاتی پیتی ہی نہیں، جانے کون سا آسیب چمٹ گیا ہے۔'' مما کا اصل غصہ ظاہر ہو ہی گیا، غانیہ پہلے بے ساختہ چونکی پھر اپنی جگہ سہم سی گئی، اگلے لمحے خود کو سنبھالتی تیزی سے اٹھی تھی، مما کے الفاظ اسے بھک سے اڑا کر رہ گئے تھے، کس قدر درست قیافہ تھا ان کا اس کا خائف ہونا بنتا تھا، البتہ پپا نے خاص دھیان نہیں دیا کہ جانتے تھے بیشتر عورتوں کی طرح وہ بھی سسرالی عزیزوں سے خار کھاتی تھیں۔

''کم آن بیٹے! ناشتہ تو۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے پپا!'' وہ بھرائی آواز میں کہتی کرسی دھکیل کر اٹھ گئی۔

''غانیہ بیٹھو یہاں اور ناشتا......'' مما کی سختی سے شروع کی گئی تنبیہ بھی ادھوری رہ گئی، وہ تیز قدموں سے ڈائننگ ہال کا دروازہ پار کر گئی تھی، غیر یقین و حیرت کے باعث مما کا منہ کھلا رہ گیا، پپا نے بامشکل مسکراہٹ دبائی مگر مما دیکھ چکی تھیں، جبھی سیخ پا بھی ہو چکی تھیں۔

''دیکھ رہے ہیں اپنی بے جا حمایت کا نتیجہ؟'' وہ غرائیں اور گویا پنجے جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑیں۔

''آپ غصہ تھوک کیوں نہیں دیتیں؟'' پپا نے لاچاری سے انہیں دیکھا۔

''اس کے رنگ ڈھنگ بھی تو دیکھیں، خدا کی پناہ، مجھے تو ڈر لگنے لگا ہے اس سے اور یہ سب تب سے ہو رہا ہے جب سے یہ گاؤں......''

''گاؤں آخر آپ کے حواسوں پہ کیونکر سوار ہو گیا ہے نازنین؟'' وہ عاجز ہو کر رہ گئے، جواباً مما نے انہیں کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

''وجہ جانتے ہیں آپ کو کیوں سوار ہو گیا ہے، آپ اسے لے کر ہی کیوں گئے آخر؟ مجھے تو آپ کے ارادے بھی مشکوک لگ رہے ہیں؟'' وہ روہانسی ہوتی جا رہی تھیں، پپا ایکدم سنجیدہ نظر آنے لگے۔

''اپنے خدشات کو زبان نہ دو نازنین بیگم! برسوں قبل کی وہ بات کب کی اپنی اہمیت کھو چکی، ایسا وہاں کسی کے بھی گمان میں نہیں اب اور زبردستی کے قائل نہیں میرے رشتے......'' وہ کسی حد تک جارحانہ موڈ میں واضح کر رہے تھے، مما نے یوں سر جھٹکا جیسے ان کی بات کو سرے سے اہمیت نہ دی ہو۔

''سب جانتی ہوں جتنے وہ صابر و شاکر ہیں، وہ تو ہر طرح جال پھیلائیں گے کہ کسی طرح یہ کام ہو جائے، مگر پھر سن لیں جمال، اگر کبھی آپ نے ایسا کیا تو میرا مرا ہوا منہ دیکھیں گے، میں ہرگز ان گنواروں سے کوئی تعلق استوار نہیں کر سکتی۔'' وہ پھنکار پھنکار کر کہہ رہی تھیں، پپا نے چائے کا مگ واپس رکھ دیا، نازک فریم کے گلاسز اتار کر سائیڈ پہ رکھے اور انہیں دیکھ کر مسکرائے۔

''تعلق تو استوار ہو چکا نازنین بیگم!'' ان کا انداز اطلاعیہ تھا یا طنز آمیز مما سمجھنے سے قاصر رہیں، البتہ دھک سے ضرور رہ گئیں، بلکہ ہاتھ میں پکڑا کانٹا بھی چھوٹ گیا۔

''واٹ؟'' ان کا رنگ فق ہوا۔
''کیا کہا آپ نے؟'' ان کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمایاں ہونے لگے، پپا دلچسپی سے تبسم خیز نظروں سے انہیں دیکھتے رہے۔
''وہی جو تم نے سمجھا۔'' پپا نے معنی خیزیت سے کہتے انہیں مزید ہولایا اور وہ جیسے بے ہوش ہونے کے قریب جا پہنچیں۔
''کیا سمجھا میں نے؟'' ان کی آواز سرسرائی، کانپنے لگی، معاً وہ ایک دم بھپر کر اٹھیں اور طیش بھرے انداز میں ان کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔
''کہیں...... کہیں آپ نے اس برسوں پرانے عہد کے مطابق میری بیٹی...... کی زندگی برباد تو نہیں کر دی؟ اپنے پہلے سے بیاہتا بیٹے دوہاجو سے اولاد والے سے، میری بیٹی کا نکاح تو نہیں کر آئے؟ بولیں جمال...... بولیں، سچ بولیے گا، ورنہ مر جاؤں گی میں؟'' وہ ہراساں تھیں، گویا بے ہوش ہونے کے قریب، پپا گھبرا گئے، شپٹا گئے، مذاق ان کے گلے پڑ چکا تھا، انہوں نے جان کنی کے عالم میں جاتی بیوی کو بامشکل سنبھالا، قسمیں کھانے لگے۔
''مذاق کر رہا تھا میں نازنین! کیا ہو گیا ہے یار۔'' وہ ان کے ہاتھ سہلاتے یقین سونپ رہے تھے۔
''ایسا بڑا فیصلہ کیسے کر سکتا ہوں میں، پاگل ہو تم؟'' وہ ان کی شک بھری نظروں اور بے اوسان سانسوں کی بدولت ہر لحظہ مضطرب وضاحتوں پہ وضاحتیں پیش کرتے تھے۔
''میرا مطلب تو اپنے اور تمہارے تعلق کے حوالے سے تھا احمق۔'' وہ پھر توضیح دے رہے تھے اور دروازے پہ ساکن کھڑی غانیہ کو لگتا ہے وہ پتھر کی ہو گئی ہے، وہ تو آفس سے آنے والا پپا کا فون سن کر انہیں اطلاع دینے آ رہی تھی کہ ایسے ایسے انکشافات ہوتے چلے گئے، بات اگر گاؤں اور اس کے مکینوں کی نہ ہوتی تو بھلا سب کچھ بھلا کر وہ چپکے سے سب سننے کی متمنی ہوتی، برسوں قبل اس کا سنجوگ کس سے ہوا تھا؟ اس کا دل دھک دھک کرتا تھا۔
تاؤ جی کے بیٹوں میں سے تو شادی شدہ صرف بھا حبیب تھے، کیا وہ ان سے منسوب تھی؟ وہ چاہتی بھی تو یقین نہ کر پاتی، پاپا ایسا کر سکتے تھے؟ نہیں ہرگز نہیں، بھا حبیب تو اس سے بہت بڑے تھے، کم از کم بھی تو پندرہ بیس سال...... پھر...... پھر۔
وہ پلٹ گئی، غیر یقین سی، غیر یقین تھی۔
کیا اس شخص کی نفرت کا سرا اسی کڑی سے ملتا تھا؟ وہ سوچ سوچ کر پاگل ہوئی جاتی مگر جواب نہیں ملتا تھا، وہ جواب کس سے لیتی، سمجھ نہیں آئی تھی، بے بسی سی بے بسی تھی۔
اذیت سی اذیت، وہ جلے پیر کی بلی کی مانند پورے کمرے میں چکراتی پھرتی تھی جب مما اس کے کمرے میں آ گئیں، آہٹ پہ اس نے پلٹ کر انہیں دیکھا، اس کی نظریں پہلی مرتبہ انہیں دیکھتے عجیب تھیں۔
''تم مجھے سچ بتاؤ غانیہ، تمہیں ہوا کیا ہے، کچھ نہیں چھپاؤ مجھ سے بیٹے۔'' وہ اسے مخاطب کر چکی تھیں، انداز میں فکرمندی بھی تھی، محبت بھی تھی، اضطراب بھی تھا، عجیب سی وحشت بھی، وہ انہیں

دیکھتی رہی، یہاں تک کہ آنکھوں میں پھیلتی نمی کے باعث نگاہوں میں ان کا چہرہ دھندلا گیا، اس نے ان کے ہاتھ اپنے کاندھوں سے ہٹا دیئے۔

''اک بات آپ بھی مجھے بتا دیں پہلے ماما! پراس..... میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔''

وہ بولی تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی، ماما چونکیں ضرور مگر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

''ہاں بولو بیٹے؟''

''بچپن میں پپا نے مجھے تاؤ جی کے بیٹے سے منسوب کیا تھا؟ کس بیٹے سے منسوب کیا تھا؟''

بیٹے نے بول دیا تھا اور ماما کو سکتہ کر ڈالا، ان کا برسوں کا خوف ان کے سامنے تھا، وہ ایک دھچکے سے نکل کر آئی تھیں، مزید دھچکا ان کی برداشت چھین لے گیا۔

''تمہیں یہ سب کہاں سے معلوم ہوا؟'' وہ حواس میں آئیں تو چیخ پڑیں۔

''اس بات کو چھوڑ دیں ماما؟'' غانیہ کا سرمہر انداز انہیں لگا زمین ان کے قدموں تلے سرکنے لگی ہے، وہ اسے گھورنے لگیں۔

''منیب سے..... اور سن لو..... میں کبھی تمہاری اس سے شادی نہیں ہونے دوں گی، سنا تم نے؟ اس کے باوجود بھی کہ اس کے ظاہری حسن کی وجہ سے تم اس پہ مرمٹی ہو تب بھی۔'' انہوں نے پاگلوں کی مانند اسے دھکا دیتے ہوئے چلاتے ہوئے کہا تھا، غانیہ گرتے گرتے بچی۔

''منیب سے؟'' اسے لگا خوش بختی نے اسے چھو لیا ہے۔

''ہاں منیب سے ہی، مگر یہ رشتہ اسی وقت اپنی اہمیت کھو گیا تھا، جب اس نے اپنے گھر والوں کی مرضی کے بغیر پسند کی شادی کی اور پھر اسے طلاق دے دی، میں..... میں اپنی بیٹی کی شادی اس سے نہیں کروں گی، امپاسبل۔'' وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں ہیجانی انداز میں غانیہ کو مگر کچھ نہیں سن رہا تھا اب منیب شادی شدہ تھا؟

اسے لگا اس کی خوشی چھن گئی ہے، وہ اس دنیا کی سب سے بد بخت لڑکی بن گئی تھی، آن کی آن میں ہی، اس کی اولاد بھی تھی، وہ زمین پہ بیٹھتی چلی گئی۔

سب کچھ غلط ملط ہوتا چلا گیا، سب کچھ ہی الٹ پلٹ ہوتا جا رہا تھا، ہنسی تاراج کیسے ہوتی ہے، ایسے انہی چند لمحوں میں معلوم ہو گیا، روگ کیسے لگتے ہیں، اس نے چند ساعتوں میں جان لیا، ساعتوں میں شور تھا، بہت شور، بصارتوں میں تاریکیاں اتر رہی تھیں، اس کا ہر تعلق حواس سے کٹنے لگا۔

(باقی اگلے ماہ)

Click on http://www.paksociety.com for more
محبت میں بھیگتا موسم
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

اہمیت دکھ کی نہیں ہوتی، دکھ دینے والے کی ہوتی ہے، کچھ دوست کھیل ہی کھیل میں زندگی سے کھیل جاتے ہیں، کیا وہ واقعی ہی دوست ہوتے ہیں؟

شاید وہ دوست نہیں ہوتے، آستین میں پلنے والے سانپ ہوتے ہیں، جنہیں جب بھی آزمایا جائے وہ ڈسے بغیر رہ نہیں سکتے۔

اس کا دوست بھی کچھ ایسا ہی ثابت ہوا تھا، نام کا سلطان تھا، نیت کا بے ایمان اور اس وقت انتہائی نازک صورتحال میں ارسلہ کے گھر میں موجود ڈرائنگ روم کے عین وسط میں بے حد حیران، ششدر، متحیر اور نادم کھڑا تھا، یہ پشیمانی اس چال کے لئے تھی جو اسی پہ الٹی جا چکی تھی۔

شاید وہ اس صورت حال کو سمجھ نہیں پا رہا تھا؟ یا سوچ رہا تھا، اس کے ساتھ ہوا کیا ہے؟ یا اس کے ساتھ کیا کیا گیا تھا؟

اپنے تئیں اس نے بڑی شاطر چال چلتے ہوئے گیم کھیلنے کی کوشش کی تھی، شاید اس کی گیم کامیاب ہو جاتی، اگر بیچ میں ماہ پارہ نام کی کامین نہ آ جاتی، اس کے آ جانے سے سلطان کی گیم کا پانسہ الٹ گیا تھا، وہ نامراد ہو گیا، ناکام ہو گیا۔

اور یہ پشیمانی محض ناکامی کے لئے ہی نہیں تھی بلکہ دوست کی نگاہوں سے گرنے کی وجہ سے بھی تھی، اس گھر کے ڈرائنگ روم میں اپنے دوست کو غیر متوقع دیکھ کر سلطان کے حواس جاتے رہے تھے، اس کی بنی ہوئی جھوٹی کہانی کی مالا ٹوٹ پھوٹ گئی تھی اور اس کا جھوٹ کھل کر سامنے آ گیا تھا، سلطان مارے ذلت، رہانت اور پشیمانی کے بھونچکا رہ گیا۔

جبکہ کھڑکی کے اندر زرتار کپڑوں میں سجی دولہن سوچ رہی تھی، اگر غلط فہمی دل میں زیادہ دیر رہے تو بدگمانی کو جنم دیتی ہے اور بدگمانی فاصلوں

مکمل ناول

کا باعث بنتی ہے، نہ وہ بدگمان ہوتی نہ غلط فہمیوں کے جال میں پھنستی اور نہ ان کے درمیان دوریوں کی اونچی دیواریں کھڑی ہوتیں، سفر سے آیا تھکا ہارا سا مسافر فی الوقت ساری تھکان بھلا کر اپنے دوست کو آئینہ دکھانے کے بعد سوچ رہا تھا۔

''اگر تم بیچ میں نہ آتے تو یہ سنہرا وقت بھی نصیب میں نہ آتا، تم بیچ میں ''فصیل'' بن کر آگئے تو یہ سنہرا وقت بھی میرا نصیب بنا، چلو تمہیں اس سنہری گھڑی اور دلنشین ملن کی ساعت کے بدلے معاف کرتا ہوں۔'' جبکہ ہر چیز سے بے نیاز چال چلنے والے کو اپنی چال کے الٹنے کا صدمہ غم زدہ کر رہا تھا، وہ لٹے پٹے قدموں سے ناکام لوٹ رہا تھا۔

☆☆☆

یہ ایک سلگتی ہوئی دوپہر تھی۔

دوپہریں سلگتی ہوتی ہیں یا نہیں، لیکن اسے سلگتی نظر آتی تھیں، ان دنوں تو ہر دوپہر سلگ رہی تھی، گرم، تپتی ہوئی، پر حدت، یوں لگتا تھا آگ برس رہی ہے، ہر طرف آگ ہی آگ تھی، اندر بھی آگ، باہر بھی آگ۔

کیا ساون کی گیلی دوپہریں بھی سلگتی ہیں؟ کیا پرنم سہ پہریں بھی سلگتی ہیں؟ ساون تو نام ہی نمی اور سیلاہٹ کا تھا، ساون آتے تو بادلوں کے ہنڈولے لاتے، ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے آتے، کبھی پورا دن بوندوں کی پازیبیں بجتی تھیں یا پورا دن آسمان بادلوں میں گھرا رہتا تھا، یوں کوئی دوپہر پرتپش نہیں تھی، فضا میں خنکی اور نمی محسوس ہوتی تھی۔

پھر بھی اسے ہر دوپہر گرم محسوس ہوتی، پر حدت، پرتپش، آگ اگلتی ہوئی، یہ آگ اندر تھی یا باہر؟ آگ کدھر تھی؟ آگ کہاں تھی؟ آگ کہاں سے آئی تھی؟

اور وہ کیسے بتاتا؟ اور وہ کیسے بتاتا؟ آگ تو وہاں سے آئی تھی جس کی طرف اس کا گمان نہیں تھا، اس کا ایقان نہیں تھا اور آگ وہاں سے آئی تھی، جس کی طرف اس کا تخیل، سوچ، فکر اور خیال تک نہ جاتا تھا۔

☆☆☆

فون کی گھنٹی بجی تو پھر ایک تواتر سے بجتی چلی گئی تھی۔

''ٹرن، ٹرن، ٹرن۔'' ہر آواز کے ساتھ ایک پیغام آتا تھا، التجاؤں میں ڈوبا، سسکتا، پرنم اور اس کا دل ہر گھنٹی پہ یوں دھڑکتا جیسے آخری بار دھڑک رہا ہو، جیسے آخری بار اپنے ہونے کا احساس دلا رہا ہو۔

''عدم حکم! تم پہ منکر محبت کا الزام آتا ہے، تم ایسی باغی یا روگرداں تو نہیں تھی، پھر عدم تعمیل میں ایسی تاخیر کیوں؟''

اور وہ اپنے ایذاد کا کیا سبب بتاتی، اس کی روایات اور دنیاوی معیار کی زنجیروں میں پابند سلاسل کر دیا گیا تھا۔

ہر گھنٹی پہ اس کا دل دھڑکتا، سلگتا، تڑپتا اور پھر ایسے چپ سادھ لیتا جیسے سینے کی دیواروں تلے دب گیا ہو، کبھی نہ اٹھنے کے لئے، کبھی نہ دھڑکنے کے لئے اور کبھی جو دل مجرم کو عدالت مجاز میں کھڑا کر کے سوال کیا کرتا۔

''بتا تو، منکر محبت کا نافرمان کیوں ہوا؟ تجھے سزائے گناہ سے سرفراز کیا جائے؟'' تو وہ پورے اختیارات والی اس کچہری میں صف ماتم بچھا لیتی، اتنے بین کرتی کے آسمانوں کے پردے تک ہلا کر رکھ دیتی، اونچی آواز میں چلاتی اور ایک ایک بااختیار نفس کا گریبان پکڑ کر آہ و فغاں کرتی۔

''میرے دل کے ساتھ منافقت کا رویہ روا نہیں رکھا گیا، میرے ساتھ عدل نہیں کیا گیا،

میرے دل کے گنبد کو توڑ کر چور کیا گیا۔''
لیکن اس کی ساری تڑپ، اذیت، درد اور آنسوؤں کو ایک مدھم اور ٹھنڈی آواز دبا ڈالتی تھی۔
''ارسلہ! اٹھو اور دستر خوان بچھا دو، دیکھو، سکینہ بی نے کھانا تیار کرلیا؟ آج کے بعد تم کھانا لگاؤ گی پورا وقت خاموشی کی بکل اوڑھ کر جانے کون سا مراقبہ کرتی ہو۔''
امی کا ٹھنڈا ٹھار لہجہ ارسلہ کو حواسوں میں لے آتا تھا، اس کے لاشعور میں بجتی فون کی گھنٹیاں خود بخود خاموش پڑ جاتی تھیں اور وہ حواسوں میں آکر حیرانگی سے فون کی طرف دیکھتی رہتی، وہ فون جس کی کیبل کٹ چکی تھی، جو بے جان تھا، جس کے اندر سے کوئی آواز نہیں آسکتی تھی، نہ اس سے کوئی نمبر ڈائل کیا جاسکتا تھا۔
تب ارسلہ کسی ستارے کی طرح پارہ پارہ ہو جاتی، ٹوٹ کر بکھر جاتی، بکھر کر ارزاں ہو جاتی، اس کے باوجود دل تھا کہ اپنی ڈگر سے ہٹتا نہیں تھا، دل تھا کہ اپنی ڈگر کو چھوڑتا نہیں تھا اور دل کا مکین اس کے ہر کرب سے بے نیاز اپنی الگ دنیا بسا کر شاد، مطمئن اور مسرور تھا، ایک اور دنیا کا باسی، ایک اور نگر کا مکین۔
ساری تکالیف وہ حقیقتوں کے انکشاف ہو جانے کے بعد بھی ارسلہ کا دل اپنی ضد پہ اڑا ہوا تھا، کچھ بھی ماننے کو تیار نہیں تھا، کچھ بھی تسلیم کرنے سے انکاری تھا۔
اسے لگتا جیسے سب کچھ جھوٹ ہو، غلط ہو، ایک فرسودہ اور من گھڑت فسانہ ہو، جو اس کے کانوں میں اترا ہو وہ جھوٹ کے پلندوں اور جھوٹی کہانیوں کے سوا کچھ نہ ہو۔
لیکن یہ سب وہ دل کی تسلی کے لیے خیال اور گمان کرتی تھی، حالانکہ یہ سب نہ کوئی جھوٹ تھا، نہ گمان نہ وہم، یہ ایک تلخ ترین دل کو چیر دینے والی سچائی تھی، کہ زیان احمد پردیس میں اپنی الگ دنیا بسا چکا تھا۔

☆☆☆

ارسلہ کا تعلق ایک خوشحال گھرانے سے تھا۔
اس کے والد کا اپنا بزنس تھا، دو بھائی تھے، وہ بھی والد کے ساتھ بزنس کرتے تھے، ارسلہ کی امی گھریلو خاتون تھیں، گھر میں روپے پیسے کی تنگی نہیں تھی، ہر طرح کی خوشحالی تھی۔
لیکن ارسلہ کا گھرانہ ماڈرن یا آزاد خیال نہیں تھا، گو کہ بہت دقیانوسی بھی نہیں تھے، پھر بھی روایات اور پرانی اقدار کا پاس رکھا جاتا تھا۔
ارسلہ کو ایک حد تک بس آزادی تھی، کالج سے گھر آنا اور اکلوتی سہیلی ماہ پارہ کے گھر جانا، وہ بھی کبھی کبھار کیونکہ امی کو ماہ پارہ کے گھر بھی جانا اتنا پسند نہیں تھا۔
بس یہ تھا کہ ماہ پارہ اور ارسلہ اکٹھے کالج جایا کرتی تھیں، واپس بھی اکٹھے آتی تھیں، دونوں میں اچھی دوستی تھی، سو ماہ پارہ اکثر اس کے گھر میں پائی جاتی تھی۔
ان کا کالج بھی قریب تھا، پیدل صرف بیس منٹ لگتے، وہ دونوں باتوں باتوں میں کالج پہنچ جاتی تھیں۔
ماہ پارہ کا گھر کالج کے زیادہ قریب تھا، آگے کالج اور پھر فوٹو اسٹیٹس کی چھوٹی دوکانیں، اس سے آگے چھوٹے موٹے اسٹال تھے۔
وہ دن بڑا خوشگوار تھا، اس دن ارسلہ کمپیوٹر لیب سے نکل کر باہر آئی تو ماہ پارہ کچھ نوٹس لہراتی اس سے ٹکرا گئی تھی، ارسلہ ارے ارے کرتی بمشکل گرنے سے بچی تھی۔
''ہوا کے گھوڑے پہ کیوں سوار ہو؟'' ارسلہ نے حواس باختہ ہو کر پوچھا، اس کے ہاتھ سے

کتابیں بھی گر گئی تھیں۔
"بات ہی کچھ ایسی ہے۔" اس نے پھر سے نوٹس لہرائے تھے، ارسلہ نے اپنی کتابیں اٹھاتے ہوئے طنزیہ کہا۔
"بڑی خوش لگتی ہو؟ کیا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے تمہارے۔" اس کے طنز پہ ماہ پارہ بے ساختہ مسکرائی تھی۔
"خزانہ ہی سمجھ لو۔" ماہ پارہ نے اس کا بازو کھینچا اور گراؤنڈ تک لے آئی، چھٹی کا وقت قریب تھا، اب وہ بیرونی گیٹ کی طرف جا رہی تھیں، گیٹ سے باہر نکل کر ماہ پارہ گھر کی طرف جاتی سڑک پہ مڑنے کی بجائے مخالف سمت جانے لگی تو ارسلہ نے بے ساختہ پوچھا تھا۔
"کہاں جا رہی ہو؟" ارسلہ کی آنکھوں میں واضح حیرانی تھی، تب ماہ پارہ نے نوٹس ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائے تھے۔
"اس خزانے کو فوٹو اسٹیٹ کروانے، دو کاپیاں کرواؤں گی، ایک تمہاری ایک میری۔" ماہ پارہ نے مسکرا کر کہا تو ارسلہ بھی بے ساختہ خوش ہو گئی تھی۔
"یہ نوٹس کہاں سے ملے؟"
"تم آم کھاؤ، گٹھلیوں کی طرف دھیان مت دو۔" ماہ پارہ نے شان بے نیازی دکھائی تھی، ارسلہ بھی مسکرا دی۔
یہ نوٹس یقیناً آمنہ کے تھے، وہ اپنے نوٹس کسی کو نہیں دیتی تھی، بلکہ ہوا تک نہیں لگنے دیتی تھی، جانے ماہ پارہ کیسے اپنی چکنی باتوں میں اسے پھنسا کر نوٹس اڑا لائی تھی۔
"ویسے اس کنجوس نے نوٹس دے دیئے؟" ارسلہ کو جیسے یقین نہیں آیا تھا۔
"دیئے ہیں، تبھی لے کر آئی ہوں۔" ماہ پارہ نے مصنوعی کالر اکڑائے تھے۔
"مان گئی ہو نا تم مجھے۔"
"کہاں سے کرواؤ گی فوٹو اسٹیٹ؟" ارسلہ نے باتوں باتوں میں جب دائیں طرف دیکھا تو وہ دوکان بند تھی جس سے یہ سب اپنے کاغذات وغیرہ فوٹو اسٹیٹ کروانی تھیں۔
"تھوڑا سا آگے جانا ہوگا، سلطان بھائی کے دوست نے نئی دوکان بنائی ہے، ہم وہیں سے نوٹس فوٹو اسٹیٹ کروا لیتے ہیں۔" ماہ پارہ تیز تیز چل رہی تھی، ارسلہ کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا، اسے بھی نوٹس آج ہی فوٹو اسٹیٹ کروانے کی جلدی تھی، کیونکہ آمنہ کے مزاج کا تو سب کو ہی پتا تھا۔
ماہ پارہ آگے آگے تھی، ارسلہ اس کے پیچھے، پھر ماہ پارہ ایک چھوٹی سی کیبن نما دوکان میں گھس گئی تھی، ماہ پارہ نے مسکرا کر اپنی فائل اور نوٹس وہاں موجود ایک خوش شکل نوجوان کو پکڑا دی تھی، اس نے ماہ پارہ کو دس منٹ کے لئے انتظار کرنے کا کہا تھا، معاً اس کی نگاہ شاپ کے باہر کھڑی ایک گھبرائی گھبرائی سی لڑکی پہ پڑی تھی، اسی پل ارسلہ نے بھی بے ارادہ ہی اسے دیکھا تھا، دونوں کی نظریں ملیں اور بے ساختہ جھک گئی تھیں پھر اسی طرح بے ارادہ ہی دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، دونوں کے دل یک بارگی دھڑکے اور دھڑکنوں نے جیسے تال بدل لئے تھے، جیسے ایک دم سر بدل لئے تھے۔
یوں لگا باہر سلگتی دھوپ کو ابر باراں نے ڈھک لیا ہو، یا آسمانوں نے زمین پہ سایہ کر لیا ہو، یا تنک ہواؤں نے اپنا رخ بدل لیا ہو، یا گھٹاؤں نے زمین پہ سجدہ کیا ہو، باہر رنگ بدل گئے تھے یا اندر کے موسم پگھل رہے تھے۔
یہ لمحوں میں کیسی کایا پلٹ تھی؟ ایک ساتھ دھڑکنوں میں کیسا بھونچال آیا تھا، یہ کیسا زلزلہ آیا

تھا، جیسے چناروں کے پار نوید صبح کا اعلان چل رہا ہو، جیسے سرزمین دل پہ کوئی دبے قدموں چل رہا ہو، ارسلہ کو لگا وہ لمحوں میں مٹی ہوگئی ہے، وہ اپنے آپ میں نہیں رہی، وہ کسی اور میں ڈھل گئی ہے، اس کا دل اختیار کی ہر حد سے تجاوز کر رہا تھا، ارسلہ کی ہتھیلیاں پسینے سے تربتر تھیں اور اس کا ماتھا احساسات کے اس نئے کھیل کی جذباتی لہر سے نمناک ہو چکا تھا، اس نے خود کو گرنے سے بچانے کے لئے دروازے کا سہارا لیا تھا۔

اور یہی کیفیات زیان احمد کے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر رہی تھیں، وہ بھی اندرونی تبدیلی پہ متعجب اور حیران تھا، آخر دل کی دنیا میں کیا حشر برپا ہوا تھا؟ آخر زیان احمد لمحوں کے اس کھیل میں کیا سے کیا ہو چکا تھا۔

یہ کون تھی جو اک نگاہ بے ارادہ سے اس کا چین سکون اور دل جیسی متاع چرا کر لے گئی تھی؟ اس سے کام کرنا محال تھا، اس سے اپنے قدموں میں گرے کاغذات اٹھانا محال تھا، اس سے جھک کر پھر اٹھنا محال تھا، وہ اپنے بے اختیار ہوتے دل کو اختیار میں کرتا ہوا بمشکل اس فسوں خیز لمحے کی قید سے خود کو چھڑاتا کام میں لگ گیا، دس منٹ بعد نوٹس فوٹو اسٹیٹ ہو چکے تھے، اس نے ماہ پارہ کی طرف نوٹس بڑھائے۔

''آئندہ کچھ بھی فوٹو اسٹیٹ کروانا ہو تو سلطان سے کہنا، خود دوکان پہ مت آنا۔'' یہ ایک واضح تنبیہ تھی، صرف ماہ پارہ کے لئے نہیں، شاید کسی اور کے لئے بھی، ماہ پارہ نے نوٹس کی ایک کاپی ارسلہ کی طرف بڑھا دی تھی، پھر مسکرا کر زیان کا شکریہ ادا کیا۔

''زیان بھائی! آپ کا بہت شکریہ اور سلطان کی تو بات مت کریں، وہ اگلے سال بھی ہمارے نوٹس فوٹو اسٹیٹ کبھی نہ کراتا۔'' زیان اس کی بات سمجھ کر سر ہلا گیا۔

ارسلہ ان دونوں کی گفتگو سے بے نیاز سامنے دیوار پہ چسپاں موبائل نمبر کو دیکھ رہی تھی، جیسے گاہکوں کی سہولت کے لئے چسپاں کیا گیا تھا، ارسلہ نے اس نمبر کو اتنی مرتبہ دیکھا کہ ذہن میں نقش ہوگیا، ایک ایک ہندسہ دماغ کی سلیٹ پہ کھنڈ گیا تھا، وہ نمبر جو زیان احمد کا تھا، جو دیوار پہ چسپاں تھا، اب ارسلہ فاروق کے دل کی دیواروں پہ جگہ جگہ لکھا جا چکا تھا۔

آخر یہ کیوں ہوا تھا؟ آخر ایسا کیوں ہوا تھا؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب فی الحال کسی کے پاس بھی نہیں تھا سوائے آنے والے وقت کے۔

☆☆☆

اس نے کہیں پڑھا تھا، جو راستوں کے عشق میں گرفتار ہو جاتے ہیں، منزلیں ان سے دور ہو جاتی ہیں اور وہ یعنی ارسلہ فاروق، رستوں کے عشق میں نہیں، منزلوں کے عشق میں گرفتار ہونا چاہتی تھی، یہ اس کی نادانی اور کم فہمی کے سوا کیا تھا؟ کیا رستوں پہ چلے بغیر منزل کا حصول ممکن تھا؟ اور رستہ چاہے پھولوں کا ہی کیوں نہ ہو، پیدل چلنے والوں کو تھکا ڈالتا ہے اور اس نے تو پیدل چلنے کا ہی نہیں، اندھا دھند چلنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

پھر محبت کب سوچ اور سمجھ بوجھ کی وادیوں میں پڑاؤ ڈالنے دیتی ہے، یہ تو عقل اور فہم کو دھتکار کر اپنی من مانی کرتی ہے، منہ زور ہوتی ہے، اپنی مرضی کرتی ہے، سرکش ہوتی ہے، چڑھ چڑھ کے آتی ہے، اس نے اپنے اندر پنپنے والے تذبذب کو دھیرے دھیرے اکھاڑ پھینکا تھا، تذبذب وہ مقام تھا، جہاں آگے جانے کی ہمت نہیں تھی اور واپس جانا بھی ممکن نہیں تھا، وہ آگے

بڑھتی یا پیچھے ہٹتی؟

گلابی دوپہر کی ایک نظر نے دل کی دنیا میں آگ سلگادی تھی، وہ آگ کی تپش نے دل مضطر کو ابھی تک بے چین کر رکھا تھا۔

وہ کیا کرتی؟ کیسے کرتی؟

اس ایک نظر کو لوٹا کر واپس کیسے لاتی؟ اس آواز کا سحر کیسے اتارتی؟ جس کا فسوں سر چڑھ کر بولتا تھا، کون تھا جو اس معاملے میں ارسلہ کی اعانت کرتا؟ طلب کرتی؟ جو ارسلہ کو مژدہ سناتا اور نیلے رنگوں کے سارے مکڑی جیسے اندیشوں کا جال ٹوٹ جاتا، کیا اسے ماہ پارہ کو اپنے دل پہ ہونے والی واردات کی خبر دینی چاہیے تھی؟ کیا اسے ماہ پارہ کو بتانا چاہیے تھا؟ کیا اسے ماہ پارہ کے گھر جانا چاہیے تھا؟

اس کے لئے امی سے اجازت کیسے ملتی؟ پہلے ماہ پارہ کے گھر اس کی والدہ ہوتی تھیں، اب بھائی بھی آ گیا تھا جو لندن پڑھنے گیا ہوا تھا، جب سے اس کا بھائی سلطان واپس آیا تھا تب سے تو ارسلہ بالکل بھی اس کے گھر نہیں جا رہی تھی، امی کو پسند نہیں تھا، وہ ارسلہ پہ کم از کم اس حوالے سے کافی روک ٹوک رکھتی تھیں۔

جب اسے کوئی چارہ کار نظر نہ آیا تو اس نے اپنے موبائل سے ماہ پارہ کو کال کی، یہ موبائل بھی ابو نے حال ہی میں لے کر دیا تھا، کیونکہ ایک دو مرتبہ کالج سے آتے ہوئے ایسی صورت حال بنی کہ ارسلہ کو گھر اطلاع دینے میں بڑی دقت کا سامنا ہوا تھا، تب ابو نے اسے موبائل لے دیا تھا۔

وہ لاؤنج سے اٹھ کر اوپر اپنے کمرے میں آ گئی تھی، پھر اس نے محتاط انداز میں ماہ پارہ کا نمبر ملایا، کافی دیر بیل جاتی رہی تھی مگر کسی نے کال تک نہیں کی، ارسلہ بار بار ٹرائی کر رہی تھی، معاً کسی نے فون اٹھا کر ہیلو کہا تو ارسلہ نے جلدی سے کال کاٹ دی، شاید دوسری طرف ماہ پارہ کا بھائی تھا۔

وہ موبائل گود میں رکھے بے دلی سے بیٹھ گئی تھی تب اچانک اس کا فون بجنے لگا، ارسلہ نے چونک کر اسکرین دیکھی۔

''ماہ پارہ کالنگ۔'' لکھا آ رہا تھا، کیا ماہ پارہ کال کر رہی تھی؟ یا اس کا بھائی؟ ارسلہ کچھ گھبرا سی گئی تھی، پھر اس نے ڈرتے ڈرتے کال ریسیو کی تو دوسری طرف ماہ پارہ ہی تھی، ارسلہ کی جان میں جان آ گئی تھی۔

''تم آ سکتی ہو پارہ؟'' ارسلہ نے چھوٹتے ہی پوچھا تھا، پارہ کچھ حیران ہوئی۔

''کہاں؟''

''میرے گھر۔'' اس کی آواز مدہم تھی، پارہ اس کے لہجے میں چھپی بے قراری کو سمجھے بغیر بولی۔

''تمہارے گھر میں نیاز بٹ رہی ہے کیا؟'' اس کا انداز شرارتی سا تھا۔

''کچھ نہیں، پہلے کیا نیاز لینے آتی ہوں؟'' ارسلہ نے خفگی سے کہا۔

''نہیں، تمہارا دماغ کھانے۔'' وہ کھلکھلائی تھی۔

''تو اب بھی میرا دماغ حاضر ہے، تم کھانے کے لئے آ جاؤ۔'' ارسلہ کا انداز منت بھرا تھا۔

''دیکھ لو پھر، چھوڑوں گی نہیں۔'' اس نے وارننگ دی تھی، ارسلہ کو اور کیا چاہیے تھا، اس کے بلانے پہ پارو ہمیشہ ایسے ہی آ جاتی تھی، کبھی انکار نہیں کرتی تھی۔

''اچھا......رکو بیس منٹ تک آتی ہوں، سلطان کے کپڑے پریس کر لوں، اسے زیان

بھائی کے ابو کے چالیسویں پہ جانا ہے۔" پارو کے بتانے پہ ارسلہ کا دل یک بارگی بہت زور سے دھڑکا تھا، زیان کا نام ہی اس کا فشار خون بڑھانے کے لئے کافی تھا، وہ لمحہ بھر کے لئے اپنے حواسوں میں نہیں رہی تھی، اس کا دل بار بار ڈوب ڈوب کر ابھرتا رہا تھا، وہ کھڑے سے اچانک بیٹھ گئی تھی، پھر اس نے بڑی دقت کے ساتھ سوکھے ہونٹوں پہ زبان پھیر کر زیان کا نام لینا چاہا تھا۔

"کک...... کیا ہوا ان کو، مطلب زیان کے ابو کو؟" اس کا لہجہ روانی سے قاصر تھا، الفاظ بھی بمشکل لبوں سے برآمد ہوئے تھے۔

"بے چارے بہت عرصے سے بیمار تھے، تبھی تو زیان بھائی نے تعلیم بھی ادھوری چھوڑ دی تھی، چھوٹی موٹی نوکریاں کرتے رہے، پھر فوٹو اسٹیٹ کی دوکان بنالی، ان کے ابو کی ڈیتھ ہوگی ہے اور اب امی بیمار ہیں، بے چارے کی پریشانیاں ہی ختم نہیں ہوتیں۔" پارو کے تفصیلاً بتانے پہ ارسلہ کا دل زیان کے لئے دکھ اور ہمدردی سے لبالب بھر گیا تھا، اس کی آنکھوں کے فرش گیلے ہوتے چلے گئے تھے اور اسے پتا بھی نہیں چلا تھا۔

"بہت افسوس ہوا۔" ارسلہ نے بمشکل کہا تھا۔

"ہاں یار! بے چارے کی زندگی خاصی کٹھن ہے، اتنی محنت کرتا ہے، پہلے باپ کے لئے، اب ماں کے لئے، ان کا اکلوتا بیٹا جو ہے، گھر بھی اپنا نہیں، سلطان کا بہت اچھا دوست ہے، سمجھو بچپن کا۔" پارو نے مزید بھی بتایا تھا۔

"اچھا، اب فون رکھتی ہوں، سلطان کو کپڑے پریس کر کے دینے ہیں۔" اسے اچانک گزرتے وقت کا احساس ہوا تو فون بند کر دیا اور ارسلہ کتنی ہی دیر تک گم صم سی موبائل گود میں رکھے بیٹھی رہی تھی۔

اس کے دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں، دل تھا کہ اڑ اڑ کر اسے دیکھنے اور اس کا درد، دکھ، کرب بانٹنے کو بے تاب تھا، وہ کیسے زیان تک جائے؟ وہ کس طرح اس دیکھے؟ کیسے اس کی آواز سنے؟ اس دوکان کی دیوار پہ چسپاں زیان کا نمبر اس کے ذہن کی اسکرین پہ روشن تھا۔

کیا وہ زیان کو کال کرے؟ کم از کم اس کی آواز تو سن لے، اس میں حرج کیا؟ بات کرنے میں گناہ کیا؟ وہ خود کو بودی دلیلیں دے رہی تھی، جس سے اس کا اپنا دل بھی مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا، بات کرنے میں جو تباہی یا گناہ تھا اس سے ارسلہ ناواقف نہیں تھی، پھر بھی دل مضطرب کی ضد کے سامنے بے بس ہوتی چلی گئی اور یہ دل تو بس ایسے ہی رسوا کرنے پہ تل جاتا تھا اور اپنی کرنی پہ آتا تو کسی قسم کے نقصان کو کسی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

پھر ارسلہ اپنی ہر دلیل کے سامنے لاچار ہو گئی، امی اور ابو کا خوف پس پشت چلا گیا تھا، بھائیوں کا ڈر بھی جاتا رہا، دل سرکشی کسی جواز کو سمجھنے کے لئے تیار نہ تھا، کسی دلیل کو مانتا تک نہیں تھا، اسے بے بسی کی انتہا تک لے آیا تھا، یہ غلط تھا یا ٹھیک تھا؟ جو بھی تھا، وہ کر رہی تھی، اسے کرنا ہی تھا، زیان تک جانا ہی تھا، زیان کو اس تک آنا ہی تھا، کیونکہ ارسلہ فاروق کو زیان احمد سے محبت ہو گئی تھی اور کیا زیان احمد کو بھی ارسلہ فاروق سے محبت ہو گئی تھی؟ اس کا جواب نہ جانے کس کے پاس تھا۔

☆☆☆

ایک اور گلابی دن نکلا اور ڈھل گیا۔

ہر دن اپنے ہی انداز میں طلوع ہوتا تھا،

چڑھتا تھا، بکھرتا تھا اور ڈھل جاتا تھا، زندگی ایک ہی دائرے میں مقید تھی، زندگی ایک ہی مدار میں گھوم رہی تھی۔

اپنے دائرہ کار سے نہ کبھی زندگی نے نکلنے دیا تھا اور نہ زیان نے ایسی کبھی کوشش کی تھی، وہ ایک ہی مدار میں آج تک گردش کر رہا تھا۔

ایک کٹھن اور دشوار زندگی کا ہر دن اس کے انتظار میں گھات لگائے بیٹھا تھا، وہ اس پر مشقت زندگی سے نالاں بھی نہیں تھا، اسے اپنے حالات میں جینا آتا تھا، اسے حالات سے نکل کر بکھر جانے کی تمنا نہیں تھی، وہ جانتا تھا، وہ ایک معمولی مزدور کا بیٹا ہے، اس کا باپ ایک محنت کش انسان تھا اور وہ ان کا اکلوتا لخت جگر تھا، سو باپ کی بیماری سے لے کر باپ کی وفات تک وہ اتنا ہی سخت جان اور مضبوط رہا، حالات جیسے بھی ہوتے وہ گھبراتا نہیں تھا، اسے گھبرانے کی، دل چرانے کی اور ہمت چھوڑ دینے کی حالات نے تربیت نہیں دی تھی، اسے ہر کٹھن دور سے گزر کر بھی اپنے حال میں رہنا ہے۔

زندگی جس قدر بھی جھٹکے دیتی یا کھونچیں مارتی بہرحال اسے ہر وار کا مقابلہ کرنا آتا تھا، ابا کی بیماری میں اس کی تعلیم ادھوری رہ گئی تھی، یہ اس کی زندگی کا پہلا خواب تھا جو ٹوٹ گیا، تعلیم جو اس کی زندگی بدل سکتی تھی، حالات بدل سکتی تھی، ایک ٹوٹے خواب کی طرح کرچی کرچی ہو کر بکھر گئی تھی۔

ابا کی بیماری نے اسے محنت کی عادت ڈال دی تھی، وہ ہر کسی کا کام کر دیتا، ہر طرح کی مزدوری کر لیتا، گھر کا چولہا اور ابا کی دوائیوں کا سلسلہ چلتا رہا، اس کی محنت رنگ لاتی گئی، تھوڑے تھوڑے پیسے جمع کر کے اس نے کچھ قرض بھی لیا اور فوٹو اسٹیٹ مشین خرید لی۔

اب یہ تھا کہ چھوٹی موٹی مزدوری سے جان چھوٹ گئی تھی، اس کا اپنا کام تھا، سو تھوڑی سی محنت کے بعد چل پڑا تھا، اسے ایک کالج کے پاس چھوٹی سی دوکان بھی کرائے پہ مل گئی تھی اور یہ انہی دنوں کا ایک قصہ تھا۔

گلابی دن جس کی چھب ہی نرالی تھی، جو ایک نئے انداز میں طلوع ہوا تھا، شاید یہ دن کسی نئے انداز میں طلوع نہیں ہوا تھا، بس زیان کو ایسا لگ رہا تھا، کیونکہ اس دن میں ایک خاص بات تھی، وہ خاص بات کیا تھی؟ کیا اس دن آسمان سے گل سوسن کی برسات ہوئی تھی؟ کیا گل رعنا اپنی رعنائیوں کے ساتھ اندر اور باہر سے سرخ ہو گیا تھا؟

کیا گل دوپہر، دوپہر کی بجائے شام کو کھلنے لگا تھا؟ کیا گل چاندنی اب اندھیرے میں بکھرنے لگا تھا؟ آخر اس دن ہوا کیا تھا؟

زیان کے دل کی دھڑکنوں میں کیسا بھونچال آیا تھا، اس کے ساتھ ہوا کیا تھا، دل پہلی نگاہ میں گھائل کیسے ہوا؟ دل اتنا بے چین مضطرب اور پاگل کیوں ہوا؟ کتنے ہی دن اسے خود کو یقین دلانے میں گزر گئے تھے، وہ اتنا کھویا کھویا اور بے چین تھا کہ اس کا دوست سلطان تک ٹھٹک گیا، وہ اس کا اچھا دوست تھا، زیان اس سے ہر بات کر لیتا تھا، لیکن اس بات کو وہ اپنے دل میں ایک راز کی طرح چھپا گیا تھا۔

وہ کیسے کس طرح اور کیوں عیاں کر دیتا؟ وہ لڑکی جس سے ایک نظر کی محبت ہوئی تھی، اس کی عزت زیان کو اپنی زندگی سے بہرحال زیادہ عزیز تھی۔

اس کے انداز و بیان میں اگر کچھ تبدیلی آئی ہی تھی تو اس محبت کی بدولت سے آئی تھی، یہ سارا اس محبت کا اعجاز تھا، جو یک طرفہ تو نہیں لگتی تھی،

اگر یک طرفہ ہوتی تو دل اتنا دیوانہ، پاگل اور مضطرب نہ ہوتا، اسے دیکھنے کے لئے اس قدر نہ مچلتا، اسے دیکھنے کے لئے اتنا نہ تڑپتا، یہ دل اپنے اختیار کی ہر حد کو توڑ کر لپک لپک کر ان راہوں کی طرف جانا چاہتا تھا جو ارسلہ فاروق کے گھر کی طرف جاتی تھیں، یا جن راہوں پہ چل کر وہ اپنی درسگاہ کی طرف آتی تھی۔

کیا زیان احمد کی محبت کو گوارا تھا، وہ کسی سڑک چھاپ عاشق کی طرح اسے لوگوں کی نگاہوں میں گرانے کی خاطر کالج کی حدود میں جا کھڑا ہوتا؟

وہ چاہتا تو ایسا کر سکتا تھا، وہ چاہتا تو اپنے سکون قلب کی خاطر آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے کے لئے دور سے ہی سہی، اسے ایک نظر دیکھ آتا، لیکن اسے ارسلہ کی عزت کا پاس تھا، اسے اپنی پاکیزہ محبت کا پاس تھا، اسے شہر محبت میں بکھرے ہر رستے پہ چلنے کا قرینہ آتا تھا، اسے محبت برتنے اور سمجھنے کا قرینہ آتا تھا، اسے محبت کو اوڑھ کر چلنے کا سلیقہ آتا تھا، اسے محبت میں احترام کی حد کو لاگو کرنے کا طریقہ آتا تھا۔

وہ دل جو اپنا نہیں رہا تھا کسی اور کا ہو گیا تھا، اس دل کو ضبط کے پل صراط سے گزار کر ضبط عشق کے مرحلوں میں لاتا تھا، اسے ارسلہ فاروق کے شہر دل کی گلیوں میں بے دھڑک نہیں جانا تھا، لیکن ہوا کیا؟ کچھ عجیب، بڑا انوکھا اور حیران کن۔

اس دن وہ گھر تھا، ابا کے چالیسویں کا ختم ہو گیا، مہمان اپنے گھروں کو لوٹ چکے تھے، وہ سارے دن کی بھاگ دوڑ سے تھک چکا تھا، اماں کو گرم دودھ اور دوائی دے کر اپنے بستر پہ آیا تو اس کا موبائل بج رہا تھا، کچھ اس طرح کہ ایک بیل دے کر کال کاٹ دی جاتی تھی، گویا کرنے والا فون کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا، یا پھر کوئی اور وجہ تھی؟ نمبر انجانا تھا، غیر شناسا سا تھا، زیان کچھ سوچ میں پڑ گیا تھا، کیا بیک رنگ کرے یا نہیں؟ جانے کون تھا؟ کیوں بار بار کرتا اور پھر کال ڈسکنیکٹ کر دیتا تھا، کچھ سوچ کر زیان نے کال کی، لیکن اس کی کال پک نہیں کی گئی تھی، وہ بار بار کرتا رہا، ہر دفعہ کال کاٹ دی جاتی تھی، ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ کون تھا جو ایسا کر رہا تھا؟ آخر یہ کس کا نمبر تھا؟

وہ بہت دیر سوچتا رہا تھا اور پھر لمحہ بھر کے لئے بھونچکا رہ گیا، اس کا دل لحظہ بھر کے لئے رکا اور پھر زور زور سے دھڑکنے لگا، اچانک دل کی یہ بے ترتیبی اس کا تنفس تیز کر رہی تھی، ایسا کیوں تھا؟ ایسا کیوں ہوا تھا؟ وہ نمبر دیکھتا اور اس کا دل جیسے گواہی دینے لگا۔

''یہ وہی ہے، ارسلہ...... ہاں یہ ارسلہ ہے، ماہ پارہ کی سہیلی۔'' زیان زیر لب بڑبڑایا تھا، ماہ پارہ کی زبانی وہ ارسلہ کا نام تو جان گیا تھا اور اس وقت زیان کا دل چیخ چیخ کر تصدیق کر رہا تھا، اس نے ماتھے پہ ابھرتا پسینہ صاف کیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ میسج ٹائپ کیا، اسے امید تھی میسج کا Reply ضرور آئے گا، وہ کال پہ بات کرنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی، لیکن میسج پہ ضرور بات کرتی۔

''میں جانتا ہوں، آپ کون ہیں؟'' اس نے میسج ٹائپ کر کے سینڈ کر دیا تھا، اس کی توقع کے عین مطابق کچھ دیر بعد جواب آ گیا تھا۔

''پھر بتاؤ، میں کون ہوں؟'' جواب اس کی سوچ کے برعکس تھا، زیان کو کچھ دیر تک سوچنا پڑا، وہ کیا جواب لکھے؟ جو ارسلہ کو چونکا دے، اسے حیران کر دے۔

''اگر بتا دوں تو کیا انعام دو گی؟'' زیان کا بکھرتا اعتماد بحال ہو گیا تھا، اس کے ماتھے کا پسینہ

بھی خشک ہو گیا، یہ ارسلہ ہی تھی، اس کا دل تھا نا، گواہی دینے کے لئے، اس کی دھڑکنوں کا شور بتا رہا تھا، اس سے بات کرنے والی ارسلہ ہی تھی، کوئی اور ہرگز نہیں۔

ارسلہ کا جواب ایسا حیران کن، متعجب اور پاگل کر دینے والا تھا کہ زیان لمحہ بھر کے لئے ساکت رہ گیا، وہ تو ارسلہ کو چونکانا چاہتا تھا اور ارسلہ نے زیان کو چونکا نہیں بلکہ ٹھٹکا دیا تھا۔

''انعام دوں گی، ضرور دوں گی۔'' دوسری طرف سے جواب آیا۔

''کیسا انعام؟'' زیان نے بے تابی سے لکھا تھا، اسے جواب جاننے کی جلدی تھی۔

''اپنا دل دوں گی، کیا لو گے؟ خریدار بنو گے؟'' اس کا اگلا میسج زیان کو پوری جان سے ہلا دینے کے لئے کافی تھا، وہ ہکا بکا رہ گیا، دم بخود رہ گیا، بہت دیر تک اس سے کچھ لکھا نہیں گیا تھا، پھر اس نے بڑی ہمت کے ساتھ کوشش کی تھی۔

''دل تو دیتے ہیں، بیچتے نہیں، انعام میں دو گی، پھر خریداری کا کیا سوال؟'' وہ اسے اپنی بات میں الجھا کر اس کے دل کی گہرائی میں اتری محبت کو ماپنا چاہتا تھا، وہ محبت جو بغیر کہے سنے بھی ان دونوں کو اسیر کر چکی تھی، وہ محبت جو واضح سچائی کے ساتھ دونوں کے دلوں میں روشن تھی، یوں کہ ہر سو اجالا بکھر رہا تھا۔

''تو پھر کیا دل کا نذرانہ لو گے؟'' اس کا جواب آیا، زیان کی سانس سانس الجھ گئی، اس نے کئی لمحے جواب پڑھنے میں صرف کر دیئے تھے، پھر زیان نے میسج لکھا۔

''اتنے پیارے نذرانے پہ کون کافر انکار کر سکتا ہے؟''

''تو پھر میں کیا سمجھوں؟'' ایک اور دل دھڑکا دینے والا سوال آیا تھا، زیان لکھتا رہا، پڑھتا رہا، دیکھتا رہا، سوچتا رہا، بے خود ہوتا رہا، بے بس ہوتا رہا۔

پھر اس نے دل کی ہر سچائی کے ساتھ بڑے سچے جذبوں کی مالا میں ایک ایک موتی پرو کر میسج لکھ دیا۔

''یہی کہ راہ محبت میں ارسلہ فاروق میرے ہم قدم ہے، میں اکیلا نہیں۔'' دوسری طرف میسج پڑھ کے ارسلہ پہ بھی مژدہ جاں فزا کا جیسے نزول ہو گیا تھا۔

☆☆☆

دونوں عشق کے خمار میں ڈوب گئے تھے، ہرا جالا دن خمار میں لپٹا طلوع ہوتا تھا، سورج پہ بھی خماری چڑھی تھی اور دھوپ بھی خمار آلود تھی۔

رات بھی خمار سے خالی نہیں تھی؛ لبالب بھری ہوئی، یوں لگتا، ہر چلتی شے پہ نشہ چڑھ گیا ہے، ہر چیز بدمست دکھائی دیتی تھی یا پھر یہ ارسلہ کی نگاہ کا اثر تھا، زندگی میں یوں لگتا تھا جیسے رنگ و بو کا سیلاب اتر آیا ہے۔

اب کتابوں میں دل نہیں لگتا تھا، کتابوں میں لکھے لفظ اجنبی سے لگتے تھے، ہر سبق میں محبت کا چہرہ دکھائی دیتا تھا، ہر لفظ میں محبت کی خوشبو ابھرتی تھی، جو رگ و جاں کو معطر کر ڈالتی۔

پھر یوں ہوا کہ یہ محبت کی مشک پارہ تک بھی چلی گئی، ارسلہ نے لاکھ پہلو بچانا چاہا تھا لیکن پارہ سے کچھ بھی چھپانا محال تھا، اسے ارسلہ کے اندر کی خبر ہو گئی اور وہ ارسلہ سے ہوتی ہوئی زیان تک بھی چلی گئی، اسے پتا چل گیا تھا کہ ارسلہ اور زیان کے درمیان محبت کا تعلق ایک زنجیر کی طرح موجود تھا، ایک تناور درخت اپنی جڑیں مضبوط کر رہا تھا، ماہ پارہ کے لئے اس میں حیرانگی کے کئی پہلو تھے، اس نے پہلی مرتبہ ہی ارسلہ کو سمجھانا چاہا تھا۔

''تم جانتی ہو ارسلہ؟ زیان اور تمہارے اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے، محبت کرنی تھی تو سوچ سمجھ کر کرتی۔'' ماہ پارہ نے جیسے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔

''محبت سوچ سمجھ کر نہیں ہوتی، بس یہ ہو جاتی ہے۔'' ارسلہ بے بس تھی اور پارہ اسے خفا نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

''یہ کیا پاگل پن ہے ارسلہ! تم کیا اس محبت کے نتائج نہیں جانتی؟'' اس کا انداز خفگی سے پر تھا۔

''نتائج کی پرواہ کون کرتا ہے؟'' وہ پرسوز لہجے میں بول رہی تھی۔

''پاگل مت بنو، خود کو اسی مقام پہ روک لو، تم جانتی نہیں، زیان تمہارے قابل نہیں ہے۔'' پارہ نے چڑتے ہوئے کہا تھا۔

''تو کیا ہوا؟ اس کے پاس پیسہ نہیں، پیسہ سب کچھ نہیں ہوتا اور وہ بہت محنتی ہے، مجھے یقین ہے بہت ترقی کرے گا۔'' ارسلہ کا انداز پریقین تھا۔

''لیکن ابھی تو اس کے پاس کچھ بھی نہیں، تمہیں دینے کے لئے کچھ بھی نہیں۔'' پارہ اسے زندہ حقیقتوں کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن ارسلہ کو مادی چیزوں کی پرواہ کہاں تھی؟

''اس کے پاس مجھے دینے کے لئے محبت کے خزانے موجود ہیں، مجھے اس کے علاوہ کچھ اور نہیں چاہیے۔'' ارسلہ پہ ایک دھن سوار تھی۔

''محبت سے پیٹ نہیں بھرتا۔'' پارہ نے تلخی سے جتایا تھا۔

''یہ تم نے ٹھیک کہا، لیکن دوست زندہ رہنے کے لئے جن چیزوں کی یا جتنی خوراک کی ضرورت ہوگی، اتنی زیان ضرور مہیا کر دے گا۔'' ارسلہ کی قناعت کا کوئی انت نہیں تھا، پارہ ہکا بکا اسے دیکھتی رہی۔

''ارسلہ! تم پچھتاؤ گی، اپنے بڑھتے قدموں کو یہیں روک لو۔'' کچھ دیر بعد پارہ نے پھر سے سمجھانا چاہا تھا۔

''اگر پچھتاوا قسمت میں لکھا ہے تو کیا کوئی قسمت کا لکھا مٹا سکتا ہے؟'' ارسلہ کا انداز پرسکون تھا، جیسے وہ ہر پہلو پہ غور کر چکی تھی، اب اسے کسی کے سمجھانے بجھانے کی ضرورت نہیں تھی، وہ فائدے اور نقصان سے بے نیاز ہو چکی تھی، یہ زیان کی محبت کا اثر تھا، یا محبت کی طاقت کا اثر، ارسلہ کو جیسے کسی بات کی پرواہ نہیں تھی۔

''تم سوچ لو، اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا، تمہارے گھر والے نہیں مانیں گے۔'' اس کے لہجے میں واضح تنبیہ تھی، وہ اسے آنے والے مشکل حالات کے لئے تیار کر رہی تھی یا اسے سمجھا رہی تھی۔

''سب لوگ مان جائیں گے۔'' اس کا اعتماد قابل دید تھا۔

''مجھے یقین نہیں۔'' پارہ نے صاف صاف کہا۔

''تم دیکھ لینا۔'' ارسلہ کے لبوں پہ یقین مسکان بن کر پھیل رہا تھا، پارہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

''میں نہیں مانتی، یہ ممکن ہی نہیں۔'' پارہ اس کے الفاظ پہ پہلی مرتبہ ارسلہ کو بہت برا لگا، اس کے دل میں بال سا آ گیا تھا، یہ اس کی کیسی دوست تھی، کوئی امید دلائے بغیر مایوسی کا زہر گھول رہی تھی، کیا یہ اس کی دوست تھی؟ ارسلہ کو بہت دکھ ہوا، نہ کوئی تسلی نہ کوئی دلاسہ، بس ہراساں کر رہی تھی۔

''تم دعا تو کر سکتی ہو نا؟'' ارسلہ نے التجائیہ انداز میں بہت لجاجت سے کہا تھا، ماہ پارہ نے

یہاں بھی جھنڈی دکھا دی تھی، اس کا لہجہ بڑا دو ٹوک اور روکھا قسم کا تھا۔

''جس دعا کی قبولیت کا یقین نہ ہو، اس کے لئے تردد کیوں کروں؟'' ماہ پارہ کے الفاظ ارسلہ کو دم بخود کرنے کے لئے کافی تھے، وہ ہکا بکا سی اس کی صورت دیکھتی رہ گئی تھی، وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ دعائیں تو تقدیر کے رخ موڑ دیتی ہیں، دعائیں تو قسمت بدل دیتی ہیں، دعائیں تو آسمانوں کو ہلا دیتی ہیں، لیکن وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکی، وہ خاموش ہو گئی، وہ جان گئی تھی کہ فی الحال خاموشی ہی بہتر ہے، فیصلہ آنے والا وقت خود ہی کر دے گا۔

☆☆☆

موسم بہار کے آتے ہی درختوں پہ شگوفے پھوٹ پڑے تھے، بلبلیں باغوں میں چہکتی تھیں اور گلابوں پہ رونق کا سماں تھا، باہر بھی موسم بہار تھا تو ارسلہ کے اندر بھی بہار رتوں کے گلاب کھلے تھے۔

ان دنوں اس پہ حسن کا ہن برس رہا تھا، وہ کسی تتلی کی مانند اڑتی پھرتی، اس کے حسن کی فراوانی امی کو کئی مرتبہ اس کی نظر اتارنے پہ مجبور کر دیتی تھی۔

وہ اندر ہی اندر سہم رہی تھیں، ارسلہ کا حسن دلکشی اور تابنا کی انہیں کئی طرح سے وہموں میں ڈالتی تھی، وہ اسے دعاؤں کے حصار میں کالج پڑھنے کے لئے بھیجتیں، اس کے آنے تک دروازے اور سڑک کے پھیرے لگاتیں اور جب وہ آجاتی تو سکون کا سانس لیتیں۔

اس دن بھی کالج سے آ کر ارسلہ نے یونیفارم بدلا اور کھانا بمشکل زہر مار کر کے اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی تھی، پیچھے سے امی آوازیں دیتی رہ گئی تھیں۔

''گندا یونیفارم میشن میں ڈال دو، اپنی کتابیں تو سنبھالتی، جانے اس لڑکی کو کیا ہو گیا ہے، کوئی بات سنتی ہی نہیں ہے۔'' امی بڑبڑاتی ہوئی اس کی چیزیں سمیٹ رہی تھیں۔

ارسلہ نے کمرے میں آ کر دروازہ لاک کیا تھا، پھر موبائل نکال کر زیان کا نمبر ملایا، وہ کبھی بھی زیان سے باہر نہیں ملی تھی، نہ زیان ایسی خواہش رکھتا تھا، وہ خود بڑا محتاط تھا، اسے بھی محتاط رہنے پہ مجبور کرتا، ارسلہ فطرتاً لاپرواہ تھی، وہ چھوٹی چھوٹی نزاکتوں کو نہیں سمجھتی تھی۔

زیان کبھی بھی اس کے راستے میں کھڑا نہیں ہوا تھا اور نہ وہ ارسلہ کو فورس کرتا تھا کہ فوٹو اسٹیٹ کروانے کے بہانے دوکان پہ آئے، اس نے ارسلہ کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ وہ دوکان پہ انتہائی ضرورت کے تحت بھی نہ آئے۔

یوں زیان کو دیکھنے اور ملنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، بس فون پہ بات ہو جاتی تھی، یا پھر میسجز کے ذریعے رابطہ قائم تھا۔

اور اس وقت ارسلہ اسے دن بھر کی روداد سنا رہی تھی، اپنی محبت اور دیوانگی کی باتیں، جواباً وہ بھی اپنی چاہت کا برملا اظہار کرتا تھا، تاہم وہ ارسلہ کی طرح جذباتی نہیں تھا، زیان کی شخصیت میں ٹھہراؤ تھا اور ارسلہ کے اندر عجلت پسندی کوٹ کوٹ کر بھری تھی، وہ ہر کال کے اختتام پہ زیان سے ایک ہی بات کہتی۔

''تم اپنی اماں کو کب بھیجو گے؟'' ارسلہ پہ ایک ہی دھن سوار تھی، وہ چاہتی تھی زیان کی اماں باقاعدہ پرپوزل لے کر آئیں، زیان اسے ٹالتا نہیں تھا، اپنی مجبوریاں ضرور بتاتا۔

''اماں شدید بیمار ہیں ارسلہ، وہ ابھی آ نہیں سکتیں، وہ آ بھی جائیں تو میں اتنا فنانشلی اسٹرونگ نہیں ہوں کہ تمہارے ابو اور بھائی

میرے پرپوزل پر غور کریں، تم ان نزاکتوں کو کیوں نہیں سمجھتی۔'' وہ اسے ملائمت سے سمجھاتا تھا، نرمی سے اپنے حالات کی طرف اس کی توجہ دلاتا، لیکن وہ بھی تو ارسلہ تھی، کسی مجبوری کو خاطر میں نہیں لاتی تھی، اس کی کوئی بات نہیں سمجھتی تھی۔

''حالات اتنی جلدی کیسے ٹھیک ہوں گے؟ تب تک ابو میرے لئے کسی بھی پرپوزل کو فائنل کر دیں گے، آج کل دو تین پرپوزلز زیر غور ہیں۔'' ارسلہ اسے اپنی مجبوری بتاتی تھی۔

''میں کوشش کر رہا ہوں، دوبئی جانے کے لئے، دعا کرو، میرا ویزہ لگ جائے، پھر سال ڈیڑھ سال تک کچھ نہ کچھ حالات بہتر ہو جائیں گے، تب تک تمہاری تعلیم بھی مکمل ہو جائے گی۔''

زیان نرمی اور محبت سے اسے امید دلاتا تھا۔

''اور اگر ادھر سب کچھ بکو گیا، ہماری توقع کے مطابق نہ ہوا؟'' ارسلہ چڑ گئی تھی۔

''کم از کم دو سال تک تو تمہاری شادی ممکن نہیں، جب تک تمہارا گریجویشن نہیں ہو جاتا۔'' زیان پرامید تھا۔

تب تک وہ خود کو اتنا اسٹرونگ کر لیتا کہ ارسلہ کا رشتہ مانگتے ہوئے اسے کوئی بھی کمپلیکس نہ ہوتا، پھر ابھی تو وہ پرپوزل لے کر آنے کی پوزیشن میں نہیں تھا، ارسلہ جانے کس جہان میں رہتی تھی، اسے اندازہ ہی نہیں تھا، ان کا ملن اتنا آسان نہیں ہے، بیچ میں اسٹیٹس کی اونچی فصیل کھڑی تھی، جس کو پاٹنا فی الحال زیان کے بس میں نہیں تھا، اس کا پرپوزل تو بغیر بچار کیے، سوچے اسی وقت ریجیکٹ کر دیا جانا تھا، آخر اس کے پاس ارسلہ کو دینے کے لئے کیا تھا؟

بھوک، افلاس، غربت، تنگی، بھلا ایسی صورت حال میں اسے کون ارسلہ کا رشتہ دیتا؟ ہر گز نہیں، وہ خوابوں میں نہیں جیتا تھا، حقیقت کی دنیا میں رہتا تھا، اسے اندازہ تھا، ارسلہ کے حصول کی خاطر آگ کا دریا پار کرنا تھا، بڑے کٹھن مراحل سے گزرنا تھا اور خود کو ارسلہ کے معیار تک لانا تھا، اس کے لئے محنت بھی چاہیے تھی، پیسہ بھی اور وقت بھی۔

زیان نے جیسے تیسے کر کے پیسوں کا بندوبست کر لیا تھا، اب ویزے کا حصول باقی تھا، کچھ کوششوں کے بعد ایک ایجنٹ نے اسے دوبئی کا ویزہ بھی فراہم کر دیا، اب اصل مسئلہ اماں کا تھا، وہ کہاں جاتیں؟ وہ کیسے زیان کے بغیر رہتیں، اس نے سلطان سے مشورہ کیا تو اس نے صاف لفظوں میں کہا۔

''یار! کوئی رشتے دار اتنے اچھے نہیں جو آنٹی کو اپنے پاس رکھ سکیں، تو دوبئی مت جا، تیرا فوٹو اسٹیٹ کا کام اچھا بھلا تو چل رہا تھا، خواہ مخواہ دوبئی کی دھن سوار ہو گئی ہے تم پر۔'' سلطان نے تو اس کو سمجھایا، کہہ بھی تو ٹھیک رہا تھا، اس میں غلط بھی کیا تھا؟

وہ اماں کو کس کے سہارے پہ چھوڑتا؟ کس کے آسرے پہ چھوڑتا؟ پھر وہ بیماری کی آخری اسٹیج پر تھیں، اگر زیان چلا جاتا تو اماں کی دیکھ بھال کون کرتا؟ اپنی ماں کی خاطر زیان نے روشن مستقبل کو ٹھوکر مار دی تھی اور دوبئی جانے کے خیال کو دل سے نکال دیا، وہ ایک مرتبہ پھر فوٹو اسٹیٹ کی دوکان پر بیٹھ گیا تھا، لیکن اب کہ اس کے دل میں امید کی کوئی کرن نہیں تھی، اسی دن ارسلہ کی پھر کال آ گئی تھی، زیان کا بجھا لہجہ اسے چونکا گیا۔

''کیا بات ہے زیان تم پریشان ہو؟'' وہ اس کی پریشانی کو بن کہے سمجھ جاتی تھی، کچھ ایسا ہی ان دونوں کے درمیان انہونا تعلق بن چکا تھا۔

''میں دوبئی نہیں جا رہا ارسلہ۔'' زیان نے

رنجیدگی بھرے لہجے میں بتایا تھا، دوسری طرف ارسلہ بے ساختہ خوش ہو گئی تھی۔

''یہ تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے، تمہاری اماں کو تمہاری ضرورت ہے زیان، وہ تمہارے بغیر کیسے رہ سکتی تھیں۔'' ارسلہ کو زیان کے نہ جانے کا سن کر بے پناہ خوشی کے احساس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

''میں اس دوکان پہ بیٹھ کر کوئی نواب نہیں بن جاؤں گا ارسلہ، یہ مت بھولو کہ تمہارا حصول میری اچھی مالی پوزیشن سے مشروط ہوگا۔'' زیان کے لہجے میں پہلی مرتبہ مایوسیوں کی کرچیاں تھیں۔

''مجھے تمہاری ضرورت ہے، مجھے تم سے محبت ہے، تمہاری اسٹرونگ پوزیشن سے نہیں، تم مجھے ہر حال میں قبول ہو۔'' ارسلہ کا لہجہ محبت کے احساس سے لبالب بھرا تھا، زیان پہ جھنجلاہٹ سوار ہو گئی تھی۔

''تم خوابوں کی دنیا سے کب نکلو گی ارسلہ، حقیقت بہت تلخ ہے اور زندگی اس سے بھی زیادہ تلخ ہے۔'' وہ بہت بکھر رہا تھا، جیسے اپنے حالات سے مایوس ہو گیا تھا، حالانکہ زیان تو بہت باہمت تھا، ارسلہ کا انداز بدل گیا، اب وہ اسے سمجھا رہی تھی، اسے مایوسیوں کے شکنجے سے نکال رہی تھی۔

''تم پریشان نہ ہو، دیکھنا سب اچھا ہو جائے گا۔'' اس کا انداز اسے بہلانے والا تھا۔

''کیا خاک اچھا ہوگا، جو مجھے نظر آتا ہے وہ تمہیں نظر نہیں آ سکتا، تمہارا حصول میری زندگی ہے، تمہیں پانا میری اولین تمنا، اگر تم نہ ہوئی تو اس زندگی کی بھی مجھے کوئی چاہ نہیں۔'' زیان کی آواز بھرا رہی تھی، ارسلہ کے دل کو دھکا سا لگا، اس نے پہلی مرتبہ زیان کو اتنا ٹوٹا بکھرا محسوس کیا تھا، ورنہ وہ تو زندگی کی، امید بھری باتیں کرتا تھا، مایوسی تو اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتی تھی، پھر کیا اس کی محبت نے زیان کو کمزور کر دیا تھا۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں زیان، ہمیشہ کے لئے تم تصور بھی مت کرنا، میں تمہارے علاوہ کسی اور کو سوچ سکتی ہوں۔'' ارسلہ کے امید دلاتے الفاظ بھی زیان کی آزردگی کا خاتمہ نہیں کر سکے تھے۔

''زندگی میں کبھی کوئی آیسا موڑ آ جائے، جب وقت ہم دونوں کو جدا کر دے، تب ارسلہ، بتاؤ تب کیا کرو گی؟'' وہ اس سے عہد لے رہا تھا یا اس کے ارادے جاننا چاہ رہا تھا، ارسلہ سمجھ نہیں پائی تھی، لیکن اس کے لہجے میں ایک مستحکم احساس ضرور بول رہا تھا۔

''ایسا کبھی نہیں ہوگا۔'' وہ اتنی پر یقین تھی کہ زیان کے لحظہ بھر کے لئے سارے اندیشے ختم گئے تھے۔

''مجھے لگتا ہے ارسلہ! کچھ ایسا ضرور ہوگا، جو ہمارے راستے جدا کر دے گا۔'' زیان اپنے ان احساسات سے کیسے جان چھڑا پاتا جو اسے کوئی خوش آئندہ احساس نہیں بخش رہے تھے۔

''وہم میں مت پڑو زیان، تمہیں خدا پہ بھروسہ نہیں؟ اگر ہمارا ملن آسمانوں پہ لکھا ہے تو چاہے کچھ بھی ہو جائے، کتنی رکاوٹیں بیچ میں آئیں، ہمیں ایک ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا؟'' ارسلہ کے لہجے میں اب بھی وہی یقین بول رہا تھا، لیکن نہ جنے کیوں زیان پرامید نہیں تھا، اسے اللہ پر یقین تھا، مگر اپنی قسمت پہ نہیں، اپنے حالات پہ نہیں، ارسلہ کے دل میں زیان کی محبت کا پیدا ہونا بھی ایک معجزہ تھا، اگر تقدیر ان دونوں کو ملا دیتی اور ارسلہ اس کی زندگی میں آ جاتی تو یہ بھی ایک کرشمہ ہی ہوتا اور زیان کو معجزوں پہ یقین تو تھا ہی مگر اپنی بد حالی کے بدلنے پہ کوئی

یقین نہیں تھا۔

☆☆☆

دن ایسے ہی بے جان اور افسردہ گزر رہے تھے، ان دنوں ارسلہ سے بھی کم کم بات ہوتی تھی، وہ خود اسے بات کرنے کا موقع نہیں دیتا تھا، اس کے امتحان قریب تھے، وہ اسے پڑھنے کے لئے اکساتا تھا اور ان ہی دنوں میں زیان کو احساس ہوا تھا کہ ارسلہ تو اس کی رگوں میں خون بن کر دوڑتی ہے، وہ اس کے اندر روح کی مانند بستی ہے، زیان کو اب احساس ہو رہا تھا، ارسلہ کا نہ ملنا اس کے لئے قیامت ہے، اس کی ہر امید تمنا اور خوشی ارسلہ سے وابستہ تھی، اگر ارسلہ نہ ہوتی تو زیان کے پاس جینے کا جواز ہی ختم ہو جاتا۔

زیان کو اس کے بات نہ کرنے کے دنوں میں اب احساس ہوا تھا، اس کی آواز کانوں میں نہ پڑتی تو اس کی سماعتیں بہری ہونے لگتیں، اسے کوئی آواز اچھی نہ لگتی اور وہ بلا سبب اپنے ہی گاہکوں سے الجھنے لگتا تھا۔

ارسلہ کتنی کم مدت میں اس کے بہت قریب آ گئی تھی، اس کی زندگی پہ پوری طرح چھا گئی تھی، اس کی چاہت زیان کے دل و دماغ پہ محیط تھی، اس کی محبت خون بن کر زیان کے اندر زندگی بن کر دوڑ رہی تھی اور یہ سب اسی ایک نگاہ کا کمال تھا جو دل کی دنیا کو تہہ بالا کر گیا تھا۔

زیان احمد آج تک اسی نگاہ کے کمال پہ دم بخود تھا، کیا کسی نظر میں ایسی حدت اور حاوی ہونے کا اثر ہوتا ہے؟ کیا کوئی نگاہ پہلی مرتبہ میں اسیر کرنے کا اسم رکھتی ہے؟

وہ بھی ایسا ہی بے جان اور پھیکا دن طلوع ہوا تھا، اس دن ارسلہ کا تیسرا پیپر تھا اور ان دونوں کے درمیان بات نہ ہوئے چوتھا دن تھا، ورنہ ایک آدھ دفعہ کی ڈنڈی تو ارسلہ از خود مار لیتی تھی۔

زیان آج بھی اپنے گاہکوں سے الجھ رہا تھا، معاً سلطان بھی دوکان میں داخل ہوا، وہ اپنے آفس سے آ رہا تھا، کچھ فائلیں فوٹو اسٹیٹ کروانی تھیں، گھر جانے کی بجائے پہلے ادھر آ گیا تھا۔

اسے دیکھ کر زیان کی تپش کچھ کم ہوئی تھی، رش بھی تھوڑا اچھٹ گیا تھا، وہ اس کا کام کرتا اپنے اندر کی بے چینی پہ قابو پا کر بولا۔

''بڑے دنوں بعد دکھائی دیئے ہو، کہاں تھے تم؟'' شاید وہ خود کو باتوں سے لگا کر ارسلہ سے اپنا دھیان ہٹانا چاہتا تھا، سلطان نے گہرا سانس کھینچا۔

''فارغ تھوڑی تھا، ایگزیکٹو پوسٹ پہ ہوں کام کا بہت برڈن ہوتا ہے۔'' سلطان نے مسکرا کر بتایا، اپنی اچھی نوکری کی دھاک بٹھانے سے باز نہیں آتا تھا۔

''تم سناؤ، لو اسٹوری کس انجام پہ پہنچی؟''

سلطان اکثر زیان سے ارسلہ کے بارے میں سوال کرتا تھا، ماہ پارہ کے توسط سے وہ ان دونوں کے موجودہ تعلق محبت کو جان چکا تھا، پھر زیان نے بھی اپنا دوست سمجھ کر اپنی باتیں اس کے ساتھ شیئر کر لی تھیں، کیونکہ سلطان اس کا اکلوتا مخلص دوست تھا۔

''محبت بہت کم انجام تک پہنچتی ہے۔'' زیان کا لہجہ یاسیت سے بھر گیا تھا، سلطان نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''کم آن، محبت انجام تک تو پہنچ ہی جاتی ہے، یہ کہو، خوشگوار انجام تک کم ہی پہنچتی ہے۔'' اس کی بات پہ زیان کا دل ڈوب کر ابھر گیا تھا، اس کے لبوں پر پھیکی سی مسکان چمکی، سلطان اس کی افسردگی محسوس کر کے بات بدلنے والے انداز میں بولا۔

''یار! ہماری ہونے والی بھابھی کہاں ہوتی ہے، ابھی تک دیدار سے محروم ہوں۔''

''تمہاری ہونے والی بھابھی کا میں خود دیدار مہینوں کرنے سے قاصر ہوں، تمہیں کیا کراؤں، ماہ پارہ کی سہیلی ہے، تمہارے گھر نہیں آتی کیا؟'' زیان نے کچھ چونک کر پوچھا تھا، سلطان نے نفی میں سر ہلایا۔

''پارو بتا رہی تھی، اس کی امی بہت سخت ہیں، کہیں بھی آنے جانے نہیں دیتیں۔'' اس کے چہرے پہ مایوسی تھی۔

''پھر تو اچھا ہی کرتی ہیں۔'' زیان نے بے ساختہ خوش ہو کر کہا، سلطان نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

''کیوں اچھا کرتی ہیں، کم از کم ہمارے گھر تو آنے دیں، پارو تو دن میں دو دو مرتبہ وہاں پائی جاتی ہے، ارسلہ پہ پابندیاں ہیں بس۔'' وہ چڑ کر بولا تھا۔

''اس کی امی کو خبر ہو گی، تم ایسے شریف نہیں، اسی لئے تمہارے گھر جانے پہ پابندی لگائی ہو گی۔'' زیان نے اسے چڑایا تھا، سلطان کے آنے سے اس کا موڈ بدل گیا تھا، کچھ دیر پہلے والی رنجیدگی کا اثر کم ہو گیا تھا، سلطان اس کی بات پہ عادتاً کھول اٹھا۔

''ساری شرافت تو تم پہ ختم ہے، معصوم آنٹی کو خبر نہیں، ان کی لاڈلی بنو کو تم نے گھیر رکھا ہے۔'' اس نے بھی حساب برابر کر دیا تھا۔

''گھیرنے کا الزام مت لگاؤ، محبت جیسے مقدس جذبے کی ہتک ہوتی ہے۔'' زیان نے اسے فوراً ٹوکا تھا۔

''جانے تم نے کون سے زمانے والی محبت کا روگ پال لیا ہے، آج کے دور میں ایسی محبتیں کون کرتا ہے؟ آج کل تو لوگ ڈیٹ مارتے ہیں، ہوٹلنگ کرتے ہیں، دو چار گرما دینے والی ملاقاتیں ہوتی ہیں اور پھر۔'' سلطان اپنی سوچ کے مطابق اس کی بوسیدہ اور دقیانوسی محبت کو باتیں سنا رہا تھا، جو بقول سلطان کے انتہائی پرانی بوسیدہ اور محدود سی محبت تھی، آزاد خیال نہیں تھی، بس فون تک محدود، جس میں کوئی ملن ملانے والا چارم ہی نہیں تھا۔

''اور پھر محبت اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہے کیوں؟'' زیان نے طنزیہ کہا۔

''مجھے ایسی محبت سے اللہ بچائے۔'' وہ کانوں کو ہاتھ لگا رہا تھا، سلطان منہ پھاڑے اسے دیکھتا رہا تھا، پھر حیرت سے سر جھٹک کر بولا۔

''کبھی کبھار میں کچھ عجیب سوچتا ہوں، اتنا عجیب کے بس۔'' اس کا انداز کچھ پرسوچ قسم کا تھا، زیان نے صاف مذاق اڑایا تھا، اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

''شکر ہے، تم بھی کچھ سوچنے لگے ہو۔'' اس کی بات پہ سلطان نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

''پوری بات تو سن لو۔'' اس نے زیان کو ڈپٹ کر کہا تھا، وہ ہونٹوں میں مسکان سمیٹ کر بیٹھ گیا۔

''تم جیسا اتنا مہذب، شریف، باکردار اور سب سے بڑی بات اتنا آرگنائزڈ بندہ اتنی لوکل سی محبت پہ کیسے راضی ہو گیا؟'' اس کے خاموش ہوتے ہی سلطان نے اپنی حیرت کا برملا اظہار کیا تھا، لوکل محبت سے مراد شاید ٹیلی فونک رابطے کی طرف اشارہ تھا، وہ سلطان کی بات سن کر واقعی حیران ہوا، پھر اسے سراہے بغیر نہیں رہ سکا تھا، اس کی آنکھوں میں ستائش بھر گئی تھی۔

''سلطان یار! تم بھی کچھ اچھا اور گہرائی میں جا کر سوچنے لگ گئے ہو؟ کہیں تمہارے دل کے ساتھ کوئی واردات تو نہیں ہو گئی؟'' اس کے لہجے

میں بھرپور سنجیدگی تھی اور چہرہ مسکرا رہا تھا، سلطان نے مصنوعی لمبی سی آہ بھری تھی۔

''ڈھنگ کی لڑکی تو تم اڑا کر لے گئے، میری بہن کی کوئی اور سہیلی ایسی نہیں تھی جس کے ساتھ میرا بھی کام بن جاتا۔'' زیان نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

''اتنی آہیں مت بھرو، ورنہ تمہارا بھی کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔''

''ارے اپنے نصیب، تمہارے جیسے کہاں؟'' سلطان نے پھر مصنوعی کراہ سے آنکھ میچ کر اشارہ کیا تھا، زیان نے اس کے کندھے پر دھموکا جڑا تھا، پھر اسے کان سے پکڑ کر اٹھایا۔

''میرے نصیبوں کو اپنی بدنظر مت لگانا، اٹھو میاں راستہ ناپو۔'' وہ اس کی فائل نتھی کر چکا تھا، سلطان نے اپنے کاغذ سمیٹے اور پھر سے مسکرا کر تان لگائی۔

''اتنا بے آبرو کر کے اپنے کوچے سے مت نکالو، ورنہ دو فرلانگ دور ہی ڈگری کالج ہے، اپنی بھابھی کو تمہاری شکایت لگاتا ہوا جاؤں گا۔'' سلطان نے اس انداز میں بسور کر کہا تھا کہ زیان کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

''ہاں، کیوں نہیں جاتے ہوئے ضرور دو جوتے کھاتے ہوئے جانا، تمہاری طبیعت صاف ہو جائے گی۔'' زیان نے اسے دھمکایا تو وہ مسکرا کر بولا۔

☆☆☆

''کیا واقعی؟'' اس کی آنکھوں میں بلا کی حیرت تھی، زیان نے اپنی بات پہ مہر لگائی۔

''جی، بالکل، میرے علاوہ باقی سب کے لئے اس کے ہاتھ میں جوتا ہے۔'' زیان بڑے یقین کے ساتھ کہہ رہا تھا، سلطان کو جھٹکا سا لگا، پھر وہ زیان کے نصیب پہ رشک کرتا پلٹ گیا تھا، اس کے چہرے کا تاثر بڑا عجیب تھا، جسے زیان عجلت میں دیکھ نہیں سکا تھا، کیونکہ اس کے پاس کام کارش لگ چکا تھا۔

☆☆☆

آج اس کا آخری پیپر تھا، صبح صبح جب وہ بغیر ناشتے کے گھر سے نکل رہی تھی تو امی نے اسے آواز دے کر زبردستی روک لیا تھا، وہ اسے بغیر ناشتے کے کبھی گھر سے نکلنے نہیں دیتی تھیں پھر آج کل تو امتحان چل رہے تھے، امی نے اسے باداموں والا دودھ گلاس بھر کے پکڑ رکھا تھا، ارسلہ کا دل خواہ مخواہ متلانے لگا، اس نے بہت جان چھڑوانی چاہی تھی مگر امی کے سامنے اس کی ایک نہیں چلتی تھی، امی کا خاصا رعب تھا، وہ جیسے ہی فارم میں آتیں، ارسلہ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی تھی۔

اب بھی گلاس خالی کر کے جیسے ہی امی کو پکڑایا تھا، انہوں نے شاباش بول کر نرمی سے اسے سمجھایا۔

''دھیان سے پیپر دینا اور ہاں جلدی آنے کی کوشش کرنا، سہیلیوں میں لگ کر باتیں بگھارنے نہ بیٹھ جانا، آج کچھ مہمان آئیں گے۔'' امی کے لہجے میں کوئی خاص بات تھی، جس نے اسے بری طرح ٹھٹکا دیا تھا، اس کے چہرے پہ ہوائیاں سی اڑنے لگیں، مہمان؟ کون سے مہمان؟ وہ پورے راستے مہمانوں کو ہی سوچتی رہی تھی، اسے امی کا لہجہ کچھ غیر معمولی لگا تھا، مہمان کیوں آنا چاہتے تھے؟ اس پہ گھبراہٹ طاری تھی۔

پھر پیپر بھی اسی کشمکش میں دیا تھا، گو کہ اچھا ہو گیا تھا تاہم اس کے ذہن سے مہمانوں والی بات نکل نہیں رہی تھی، کاش وہ موبائل لے آتی اور زیان کو اپنی پریشانی کے متعلق بتا دیتی۔

بہت دیر سوچنے کے بعد اس نے ایک فیصلہ کیا اور مطمئن ہو گئی، پارو کو بتائے بغیر اس نے کالج سے باہر آ کر تھوڑی دیر کے لئے سوچا اور پھر زیان کی دوکان کی طرف چلنے لگی، اس کے قدموں کی رفتار تیز تھی اور وہ اپنے اتنے لمبے ٹیلی فونک رابطے کے بعد پہلی مرتبہ اس دن کے بعد آج اس کی دوکان پہ آئی تھی۔

یوں کہ اسے دیکھ کر زیان کا میٹر ہی گھوم گیا تھا، اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا، ارسلہ یوں دوکان پہ اس کے منع کرنے کے باوجود آ جائے گی، وہ تو دوکان بند کر کے گھر جا رہا تھا، گھر سے اماں کی خرابی طبیعت کی اطلاع آئی تھی اور ابھی وہ اٹھنے ہی لگا جب ارسلا اچانک اندر آ گئی، زیان اسے دیکھ کر پہلے تو حیران ہوا تھا پھر اسے غصہ آیا، لیکن ارسلہ پہ غصہ کرنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، پھر بھی زیان اسے ٹوکے بنا نہیں رہ سکا۔

''کیوں آئی ہو ارسلہ؟ میں نے منع بھی کیا تھا، تمہیں کوئی دیکھ لے تو، کس قدر بے عزتی ہو گی تمہاری بھی اور میری بھی۔'' زیان اپنی ناگواری کا برملا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا، ارسلہ اس کی ناگواری کو چپ چاپ پی گئی تھی، اسے بھی بات کرنے کی جلدی تھی، وہ خود بھی یہاں آنا نہیں چاہتی تھی مگر۔

''گھر میں مہمان آ رہے ہیں، میں تمہیں یہی بتانا چاہ رہی تھی۔'' ارسلہ نے بے ربط انداز میں کہا۔

''مہمان آ رہے ہیں یا دہشت گرد، کیا تم فون پہ یہ بات نہیں کر سکتی تھی؟'' زیان نے خفگی جتائی تھی، ایک تو گھر جانے کی جلدی تھی، جانے اماں کی طبیعت کیسی ہو، اوپر سے ارسلہ کی آمد اور یہ مہمانوں کا چکر اس کا دماغ گھوم رہا تھا۔

''گھر پہ اگر موقع نہ ملتا بتانے کا پھر تم کیا کرتے؟ اگر مہمانوں کو ہاں ہو جائے تو پھر؟''

ارسلہ کے اگلے الفاظ، زیان کے چودہ طبق اچانک روشن ہوئے، تو ارسلہ خاص مہمانوں کی بات کر رہی تھی، اوف میرے اللہ، زیان کا سر چکرا گیا۔

''ان مہمانوں کو بھی آج ہی آنا تھا، حد ہے یار، تمہارے ماں باپ تمہیں گریجویٹ ہونے نہیں دیں گے۔'' اس نے تپتے لہجے میں کہا تھا، اس کا ذہن سنسنا اٹھا تھا۔

''تم ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہو، میری بارات دروازے تک آ جائے گی۔'' ارسلہ رو دینے کو تھی۔

''تو کیا کروں؟'' وہ عجلت میں بولا تھا، ابھی اسے دوکان کو تالا لگانا تھا، کوئی ٹیکسی پکڑنی تھی، پھر اماں کو ہسپتال لے کر جانا تھا۔

''اپنی اماں کو میرے گھر بھیجو زیان، تم سمجھتے کیوں نہیں۔'' ارسلہ نے ٹپ ٹپ گرتے آنسوؤں کو بمشکل سمیٹا تھا، زیان کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

''ابھی تو اماں کو ہسپتال بھیجنے لگا ہوں، دعا کرو اماں ٹھیک ہو جائیں، تمہارے گھر آ کر تمہارا شوق بھی پورا کر لیں گے ٹکا سا جواب لے کر۔'' زیان اپنی بے بسی پہ خود کا مذاق اڑانے لگا تھا۔

''اماں کو کیا ہوا ہے؟'' ارسلہ اپنا غم بھول کر سخت متوحش ہو گئی تھی۔

''پھر طبیعت خراب ہے، دمہ کا شدید اٹیک، میں چلتا ہوں دعا کرنا۔'' زیان نے عجلت میں چیزیں سمیٹ ڈالی تھیں، پھر جاتے جاتے بھی تنبیہ کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''آئندہ دوکان پہ مت آنا ارسلہ، اپنے لئے رسوائی مت خریدو۔'' اس کی تنبیہ میں محتاط سا

اشارہ تھا جسے ارسلہ سمجھتی تو تھی مگر عمل نہیں کرتی تھی، اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتی تھی، بے بس اور لاچار ہو جاتی تھی، زیان چلا گیا اور ارسلہ کسی ہارے ہوئے مسافر کی طرح سڑک پہ شکستہ قدموں سے چلتی رہی۔

☆☆☆

ان دنوں سورج نکلتا اور چپکے سے ڈھل جاتا، دھوپ چڑھتی، ڈھلتی، چھپتی، ارسلہ کو کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا، وہ پورا دن اپنے کمرے میں بند رہتی تھی، یا آنسو بہاتی، یا اپنی قسمت سے گلے کرنے لگتی تھی۔

کبھی کبھار پارو آ جاتی تو اس کے دل کا کچھ بوجھ ہلکا ہو جاتا تھا، وہ اس کے دکھ بھی سنتی تھی، آنسو بھی چنتی تھی اور مقدور بھر اسے تسلی دینے کی کوشش بھی کرتی۔

پارو اس کی سہیلی تھی، وہ اس کا احساس کرتی تھی، خیال رکھتی تھی، ڈھارس پہنچاتی تھی، لیکن اس کے دل کا بوجھ کم نہیں ہوتا تھا، بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔

اس دن ارسلہ کے آخری پیپر والے دن زیان کا دوکان بند کر کے جانا گویا ہمیشہ کے لئے ہو گیا تھا، دوبارہ اس نے دوکان کھولی ہی نہیں تھی، کیونکہ اسی شام زیان کی اماں چل بسی تھیں، پارو کی پوری فیملی اس کے گھر گئی تھی، تعزیت کے لئے، لیکن ارسلہ کے جانے پہ پابندیاں تھیں، کاش وہ بھی پارو کے ساتھ چلی جاتی، کچھ اور نہیں تو ٹوٹے بکھرے زیان کو تسلی دلاسہ دیتی، اس کا سہارا بنتی، غم کی اس گھڑی میں زیان کا ساتھ دیتی، لیکن ارسلہ بہت مجبور تھی اور زیان اس کی مجبوری کو سمجھتا بھی تھا، اس لئے اسے ارسلہ سے کوئی گلہ نہیں تھا۔

زیان کی اماں کو دنیا سے گئے ہوئے بیس دن ہو چکے تھے، زیان سنبھل تو گیا تھا لیکن ابھی تک غم کے اس فیز سے نکل نہیں پایا تھا، اس کا پورا گھر ختم ہو چکا تھا، وہ اس بھری دنیا میں اکیلا رہ چکا تھا، اس کا اپنا اب کوئی بھی نہیں تھا، پھر کچھ وقت گزرا تو ارسلہ کی محبت، توجہ اور التفات زیان کو زندگی کی طرف کھینچ لائے تھے، لیکن اب وہ کچھ اور انداز میں سوچتا تھا۔

اس کا گھر بار تو تھا کوئی نہیں، اس نے ایک مرتبہ پھر باہر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا، اس دفعہ ارسلہ نے اسے نہیں روکا تھا، وہ چاہتی تھی زیان کم از کم اس قابل ضرور ہو جائے کہ اسے اس کے بھائیوں کے ساتھ وہ کھڑے ہوتے ہوئے اسے کوئی احساس کمتری نہ محسوس ہو، لیکن جانے سے پہلے زیان کی ایک خواہش تھی، وہ ارسلہ کو اپنے نام کر جاتا، کم از کم دل کو تسلی تو رہتی، اس ضمن میں زیان نے سلطان کی امی سے مشورہ کیا تھا اور اپنی خواہش کا اظہار کیا، سلطان کی امی مان گئی تھیں، کیونکہ زیان کا کوئی بزرگ اب نہیں تھا، نہ کوئی رشتے دار تھا، بس سلطان کی فیملی تھی، جس سے زیان کی توقعات وابستہ تھیں، گو کہ زیان اتنا پر امید نہیں تھا، پھر بھی اس نے رسک لینے کا سوچ لیا تھا۔

اتوار کے دن زیان کا پرپوزل لے کر آنٹی ارسلہ کے گھر آئی تھیں، ارسلہ کی امی بہت خوش ہوئیں، اس کے ابو اور بھائی بھی بہت خوش تھے۔

لیکن جب آنٹی نے اپنا مدعا پیش کیا تو ان لوگوں کو خاصا دھچکا لگا تھا، ان کے خیال تھا کہ وہ اپنے بیٹے سلطان کے لئے آئی ہیں، لیکن یہ پتا دینے پر کہ وہ بیٹے کے دوست کے لئے آئی ہے، سو ان کو طریقے کے ساتھ انکار کر دیا گیا تھا، زیان کی خاطر آنٹی نے کافی زور دیا مگر بے سود، ارسلہ کے بھائی کسی طور راضی نہیں تھے مجبوراً آنٹی

کو بے مراد لوٹنا پڑا تھا۔

زیان کے لئے یہ بڑا دھچکا نہیں تھا، اسے انکار کا گمان تھا، لیکن ارسلہ کے لئے یہ بہت بڑا دھچکا تھا، وہ اس غم سے ادھ موئی ہو رہی تھی، یہ صدمہ اس کی برداشت سے باہر تھا، حتیٰ کہ زیان کے سمجھانے پہ بھی وہ سنبھل نہیں رہی تھی۔

''میں جانتا تھا، انکار ہو جائے گا، مجھے قبل از وقت پر پوزل نہیں بھیجنا چاہیے تھا مگر میں نے تمہاری تسلی کے لئے۔'' زیان بھیگی آواز میں بول رہا تھا اور ارسلہ کے آنسو ہر حد توڑنے کو بے تاب تھے۔

''یہ لوگ نہیں مانیں گے زیان! مجھے نہیں لگتا، یہ کبھی نہیں مانیں گے۔'' ارسلہ امید کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھی تھی۔

''تم کیوں گھبراتی ہو، دیکھنا سب ٹھیک ہو جائے گا، میرا ویزہ لگ چکا ہے، ایک سال بعد جب میں واپس آؤں گا تو یہ لوگ کم از کم اس طرح انکار نہیں کر سکیں گے۔'' زیان کی امیدیں روشن تھیں، وہ اسے بھی دلاسا دے رہا تھا، اس کی ہمت بڑھا رہا تھا، مگر ارسلہ کے دل کو چین نہیں آتا تھا۔

''ایک سال میں پتا نہیں کیا ہو؟ تم نہ جاؤ زیان۔'' ارسلہ شدت سے کرلائی تھی۔

''میرا جانا بہت ضروری ہے ارسلہ! یہاں رہ کر میں کچھ نہیں کر پاؤں گا، قدرت مجھے دوسری مرتبہ موقع فراہم کر رہی ہے، میں یہ موقع کھونا نہیں چاہتا، تم آسائشات کے بغیر کیسے رہو گی؟ کہنے کی حد تک سب باتیں ٹھیک لگتی ہیں، عملی زندگی بہت مشکل ہے ارسلہ اور میں تمہیں ہر قسم کے سکھ دینا چاہتا ہوں، تمہاری فیملی بھی تمہارے لئے بہتر سوچتی ہے، وہ کیسے تمہارا ہاتھ میرے جیسے بندے کے ہاتھ میں تھما دیں، جس کا کوئی فیوچر ہی نہیں۔'' زیان کا لہجہ گہرا رنجیدہ تھا۔

''میں صرف تم سے ایک عہد چاہتا ہوں، تم میرا انتظار کرو گی، کسی بھی قیمت پہ، کسی بھی صورت میں، تم میری پابند رہو گی، میرا وعدہ ہے میں لوٹ کر آؤں گا۔'' زیان کی بھیگی آواز میں وعدوں کی باس رچی تھی، اس کا خالص لہجہ آج بھی یقین سے پر تھا، ارسلہ نے زیان کو اپنے آنسوؤں سے بھیگی دعاؤں تلے رخصت کیا تھا، اسے یہ اندازہ ہی نہیں تھا، وہ زیان کو ہمیشہ کے لئے رخصت کر رہی ہے، وہ کبھی ایک دوسرے کو دیکھ نہیں پائیں گے وہ کبھی ایک دوسرے سے مل نہیں پائیں گے اور کبھی ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کر پائیں گے۔

☆☆☆

زیان کے جاتے ہی ارسلہ پہ ایک ہی موسم ہمیشہ کے لئے ٹھہر گیا تھا، یہ جدائیوں کا موسم تھا، کون کہتا تھا، محبت وصل میں بھیگتا ہوا موسم ہے، محبت تو جدائیوں میں سلگتا ہوا موسم تھا، وہ کون سی گھڑی تھی جب محبت نے اسے روگی کر دیا تھا، اسے ایسے مقام پر لے آئی تھی، جس سے آگے تذبذب کی کھائیاں تھیں اور پیچھے کشمکش کے اندھے گڑھے، کوئی امید نہیں تھی، کوئی روشنی نہیں تھی اور کوئی چارہ گر بھی نہیں تھا اور زیان اسے اپنے ہر میسج میں ایک ہی تسلی دیتا تھا، اس کے آنسوؤں، التجاؤں اور کربناک باتوں کے بدلے میں صرف ایک ہی بات دوہراتا۔

''ارسلہ! وہ وقت دور نہیں، جب یہ مشکل وقت ختم ہو جائے گا، تم ہمت نہ ہارو، دیکھو میں تمہارے لئے دن رات کا فرق بھلا کر گدھوں کی طرح کام کرتا ہوں، میں جلدی واپس آ جاؤں گا۔'' زیان کے لفظوں میں امید کے پھاہے اس کے رستے زخموں پہ مرہم بن جاتے تھے، وہ کچھ

دن زیان کی باتوں کے سہارے خوش رہتی تھی اور پھر اس پہ یاسیت کے لمبے لمبے دورے پڑ جاتے تھے، دراصل زیان کی جدائی ارسلہ کے لئے ضرب شدید کی مثل تھی، یہ مہلک صدمہ اسے اندر ہی اندر گھلا رہا تھا اور بظاہر وہ بہت خوش رہنے کی کوشش کرتی، اسے اپنے اردگرد موجود لوگوں کو بھی مطمئن کرنا ہوتا تھا، لیکن یہ جو رنج کا غبار اس کے اندر جمع ہو رہا تھا، وہ کسی دن پھٹ ہی پڑتا، اگر زیان کی محبت طاقت بن کر اس کے گرد حصار نہ کھینچتی، وہ ہر روز اپنے لفظوں کی مرہم اس کی یادوں کے رستے زخموں پہ رکھتا تھا، اس کے لئے زیان کی باتیں اور یادیں آکسیجن کا کام دیتی تھیں، اکثر وہ زیان کے پرانے میسج نکال کر پڑھتی تھی، وہ اکثر بڑی روانی میں بھی یہ الفاظ دوہراتا تھا۔

''دریا پہاڑوں میں سے سمٹ کر گزرتا ہے اور میدانوں میں سے پھیل کر گزرتا ہے، اپنے حالات کے مطابق بہنا چاہیے، انسان حالات سے باہر نکل جائے تو بکھر کر رہ جاتا ہے۔'' وہ زیان کا ایک ایک میسج کھول کر دیکھتی تھی اور پہروں تکیہ آنسوؤں سے بھگوتی رہتی، اس کی یاد ارسلہ کا سوگ تھا، اس کی جدائی ارسلہ کا روگ تھا، وہ اس کی آنکھ میں آنسو بن کر ہمیشہ ٹھہرا رہتا تھا، نہ بہتا تھا نہ پلٹتا تھا، بس ایک یاد کی طرح سینے میں کسک بن کر دھڑکتا تھا، جب وہ آخری حد تک مایوسی کے سائے تلے دب جاتی تب زیان کا ایک اور میسج اس کے اندر نئی رتوں کی امیدیں لے کر روشن ہو جاتا تھا، تب ارسلہ عادت سے مجبور ہو کر سسکی دبا کر لکھتی۔

''تم کہتے ہو، سب ٹھیک ہو جائے گا، کیا ہماری چاہ کے مطابق سب ٹھیک ہو جائے گا؟''

اس کا سسکتا لہجہ اسے دور بیٹھے بھی تڑپا ڈالتا تھا، وہ کتنا ہی کیوں نہ مصروف ہوتا، وہ کتنا ہی کیوں نا کام کے بوجھ تلے دبا ہوتا، ارسلہ کو جواب لکھنا نہیں بھولتا تھا، اس کی امید تازہ کرنا نہیں بھولتا تھا۔

''ٹھیک وہ نہیں ہوتا ارسلہ جو ہم چاہتے ہیں، بلکہ ٹھیک وہ ہوتا ہے جو رب نے ہمارے لئے لکھ رکھا ہے، تم خدا کی رحمت سے مایوس کیوں ہوتی ہو، اس نے لڑکھڑانے سے بچایا ہے تو قدموں کو مضبوطی بھی بخشے گا، جم کر کھڑا ہونے کی طاقت بھی دے گا، وہ دن دور نہیں اور وہ دن واقعی ہی دور نہیں۔'' ارسلہ، زیان کے لکھے لفظوں کو بار بار پڑھتی تھی، دل پھر بھی نہیں بھرتا تھا، اس کے ہر لفظ میں ایک انوکھی طاقت کا احساس چھپا ہوتا تھا، ارسلہ کمزور پڑتے پڑتے بھی مضبوط ہو جاتی تھی، ٹوٹتے ٹوٹتے بھی سنبھل جاتی تھی۔

لیکن اسے ایک بات کا اندازہ نہیں تھا، کچھ دکھ بس نصیب کا کرشمہ ہوتے ہیں، ان سے پیچھا چھڑوانے کی جتنی کوشش کی جائے یہ ساتھ ساتھ رہتے ہیں، مگر تنہا نہیں چھوڑتے، کبھی اکیلا نہیں کرتے۔

یوں ہی ایک سال گزر گیا اور زیان کی یادوں میں دوسرا سال پھسلنے لگا، اس نے ارسلہ کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ شاید وہ آنہ سکے، اس کی چھٹی منظور نہیں ہو رہی تھی۔

ادھر اس کا رزلٹ بھی آچکا تھا، امی اب اس کے ہاتھ پیلے کرنے کے چکروں میں تھیں، آئے دن رشتے آتے لیکن نہ جانے کیوں، کہیں بات نہیں بن پا رہی تھی، لوگ ارسلہ کو پسند کر جاتے تھے، رشتہ پکا ہونے کے قریب ہوتا اور لڑکے والوں کی طرف سے جواب ہو جاتا، جانے مسئلہ کیا تھا، امی ابو سخت ہراساں تھے اور بھائی شدید متفکر۔

پھر ان دنوں پارو بھی بیاہ کر پیا دیس سدھار گئی تھی، امی کو کسی پل قرار نہیں آتا تھا، ان کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔

انہی بے کیف دنوں میں ارسلہ کے بھائیوں کو کچھ شک پڑ گیا، یہ شک نہیں تھا، انہیں جیسے یقین تھا، ارسلہ کا در پردہ کسی کے ساتھ رابطہ ہے بھی اس کے دونوں بھائی بڑے یقین اور وثوق کے ساتھ اس سے باز پرس کر رہے تھے، کاشف بھائی کا چہرہ سرخ اور غصے سے تمتما رہا تھا، تب خوف و ہراس میں ارسلہ کو اندازہ نہیں ہو سکا تھا، اس بات کا اسے بعد میں خیال آیا تھا، یوں لگ رہا تھا بھائیوں کو کسی نے پڑھا لکھا کر بھیجا ہے اور بڑا یقین دلایا تھا کہ ارسلہ کا رشتہ پکا نہ ہونے کے پیچھے بڑی ٹھوس وجوہات موجود ہیں، تبھی تو کاشف بھائی نے بڑے دوٹوک لہجے میں ارسلہ کو بلا کر سمجھایا۔

''تمہارا رشتہ کیوں نہیں ہو رہا؟ اس کے پیچھے جو بھی وجہ ہے، تمہیں اپنی زندگی عزیز ہے تو گزشتہ ہر بات بھول جاؤ، میں بار بار سمجھاؤں گا نہیں۔'' کاشف بھائی کا انداز اتنا برہم نہیں تھا، لیکن عاطف بھائی کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا، وہ ارسلہ سے ہر بات اگلوا لینے کے چکر میں تھے، انہوں نے ارسلہ کو بڑا پریشرائز کیا تھا، اسے بری طرح ڈرایا دھمکایا اور ہراساں کیا تھا، وہ کسی بھی صورت اسے بخشنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

''سچ سچ بتا دو، کون ہے وہ؟ اور کیوں رکاوٹ بن رہا ہے؟ ورنہ میں تمہارا منہ توڑ دوں گا، تمہیں زندہ درگور کر دوں گا۔'' عاطف بھائی جس انداز میں بات کر رہے تھے ارسلہ کو پتا لگ گیا تھا، انہیں زیان کے بارے میں کسی نے ٹھوس ثبوت اور شواہد فراہم کیے تھے۔

''کوئی بھی نہیں، جھوٹ ہے سب، میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' ارسلہ کو جھوٹ کا سہارا لینا ہی پڑا تھا، اسے اپنی پرواہ نہیں تھی مگر وہ زیان پہ آنچ آنے نہیں دینا چاہتی تھی۔

''مگر تمہارا انکار ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، تم در پردہ ہر لڑکے والوں کو رشتے سے انکار کیوں کرتی ہو؟'' ابو کو بیچ میں بولنا پڑا تھا۔

''میں تمہارا باپ ہوں ارسلہ، تم مجھے بتاؤ، کوئی مسئلہ ہے بیٹا۔'' اسے اپنا باپ حد سے زیادہ غمگین اور افسردہ لگا تھا، امی بھی سر جھکائے بیٹھی تھیں، ان کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور ان کا چہرہ زرد تھا۔

''ابو! کچھ بھی نہیں، بھائیوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' اس نے لرزتی آواز میں اپنی صفائی پیش کرنا چاہی تھی، تب عاطف بھائی گرج کر دہاڑے تھے۔

''تو پھر زیان کون ہے؟'' عاطف بھائی کے الفاظ ارسلہ پر کسی بم کی طرح گرے تھے، اس کی امی کا چہرہ بھی فق ہو گیا تھا اور اس کے ابو دم بخود تھے۔

''کون زیان؟'' ابو اور امی کے ساتھ ساتھ کاشف بھائی بھی چونکے تھے۔

''یہ وہی لڑکا ہے جس کا پرپوزل مسز قمر زمان لائی تھیں ارسلہ کے لئے۔'' عاطف بھائی نے چبا چبا کر جتایا تھا، ارسلہ کا دل دھک سے رہ گیا تھا، اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی، تو بھائیوں کو پتا چل گیا تھا؟ ان کو کس نے بتایا تھا، انہیں کیسے پتا چلا، وہ ہکا بکا دیکھتی رہ گئی، امی کی رنگت متغیر تھی اور ابو ساکت کھڑے تھے، جیسے انہیں یقین نہ آیا ہو، پھر انہوں نے عاطف بھائی کو جھڑک دیا تھا۔

''بکواس مت کرو، اپنی بہن پہ الزام لگاتے ہو، یہ کسی زیان کو نہیں جانتی۔'' ابو جیسے

ارسلہ کے لئے ڈھال بن گئے تھے، ارسلہ کو لگا، ابو کے سامنے اس کا عمر بھر سر نہ اٹھ سکے گا، یہ ندامت تھی، پشیمانی تھی، شرمندگی تھی کہ کیا تھا، اس کا سر اٹھ ہی نہ سکا، امی اور ابو دونوں اس کی خاطر بھائیوں سے لڑتے رہے تھے، پھر عاطف بھائی کے دماغ میں جانے کیا سمائی تھی، وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھے اور ارسلہ کے قریب آ کر چلائے تھے۔

''اس سے کہیں اپنا موبائل لے کر آئے۔'' وہ امی اور ابو سے مخاطب تھے اور دیکھ ارسلہ کی طرف رہے تھے اور ارسلہ کا سانس جیسے لمحہ بھر کے لئے رک سا گیا تھا، اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا اور اس کی ٹانگیں بوجھ اٹھانے سے قاصر تھیں، اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔

''جاؤ ارسلہ اپنا موبائل لے کر آؤ۔'' اب کہ کاشف بھائی نے بھی کھردرے لہجے میں اسے پکارا، ارسلہ سے اٹھنا محال ہو گیا تھا، وہ پارہ پارہ ہوتی بے بس اور لاچار کھڑی تھی۔

''ابھی آپ کو پتا چل جاتا ہے، یہ آپ کی لاڈلی کہاں تک پہنچی ہے۔'' عاطف بھائی نفرت سے بولے تھے۔

''تم خاموش رہو، میں بات کرتا ہوں، بلکہ میں موبائل لاتا ہوں، بتاؤ کہاں رکھا ہے؟'' کاشف بھائی، عاطف بھائی کو ڈپٹ کر ارسلہ کی طرف متوجہ ہوئے تھے، تب امی نے گہرا سانس کھینچا تھا پھر کاشف بھائی کو روک کر بے ساختہ بولیں۔

''میں لاتی ہوں تم رکو۔'' ارسلہ پہ ایک کڑی نگاہ ڈال کر وہ اندر چلی گئی تھیں، پھر کچھ دیر بعد ان کی واپسی ہوئی، وہ ارسلہ کا موبائل لے آئی تھیں اور اس موبائل میں وہ سب کچھ تھا جو نہیں ہونا چاہیے تھا، زیان کا ایک ایک میسج سیو تھا، اس کی ایک ایک بات، ایک ایک لفظ، جسے وہ تنہائی میں پڑھتی تھی اور اس کی ریکارڈ شدہ باتیں سنتی تھی اور اس وقت وہی باتیں اور وہی میسجز ارسلہ کے لئے رسوائی کا سبب بن رہے تھے، اس کے دونوں بھائیوں کا پارہ آسمان پہ تھا اور وہ ارسلہ پہ بے دریغ برس رہے تھے۔

''اسی لئے میں لڑکیوں کو موبائل دینے کے حق میں نہیں تھا، یہ ناجائز استعمال کرتی ہیں، دیکھ لیا آپ نے؟ اب کوئی اور بھی ثبوت چاہیے۔'' وہ دونوں اب امی ابو کے سر ہو چکے تھے، جنہوں نے ارسلہ کو بے جا آزادی دے رکھی تھی، جس کی وجہ سے آج یہ دن دیکھنا پڑا تھا اور وہ آج اپنے بھائیوں کے سامنے رسوا ہو گئی تھی، اپنے والدین کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔

ایک خالص اور سچی محبت کو غلط طریقے سے کرنے کا یہ انجام تھا، کوئی ایک بھی سیدھا رستہ جو خالص محبت تک لے جاتا ہو، کاش اس کی سمجھ میں ہوتا اور جو سیدھے طریقے سے آتے ہیں، ان کو یہ کم فہم لوگ کبھی رسموں کبھی روایات، کبھی ذات پات اور کبھی مال و دولت کے پیمانے میں تول کر دھتکار دیتے ہیں، پھر محبت کو پانے کا کوئی صحیح طریقہ کہاں سے ایجاد ہوتا، اگر تھا تو یہ لوگ بتاتے کیوں نہیں تھے، چپ کیوں تھے، خاموش کیوں تھے، بولتے کیوں نہیں تھے، شاید ان لوگوں کے پاس بھی کوئی جواب نہیں تھا، لیکن ان کے پاس سوال بہت تھے، طعنے بہت تھے، طنز بہت تھے، دل چھلنی کر دینے والے لفظ بہت تھے۔

اس کے دونوں بھائیوں نے حتی المقدور اسے ملامت بھی کیا، غصہ بھی نکالا، زہر بھی اگلا، مارا بھی اور پھر موبائل فون چھین لیا، اسے کمرے تک محصور کر دیا، وہ گھر میں اپنے ہی گھر میں قید کر

دی گئی تھی، وہ ایسا ہی کر سکتے تھے، انہوں نے ایسا کرلیا تھا، کیونکہ وہ صاحب اختیار تھے، خود مختار تھے، حاکم تھے اور ارسلہ ایک مظلوم رعایا تھی، وہ سنتی بھی تھی، سہتی بھی تھی، برداشت کرنے پہ مجبور بھی تھی۔

لیکن ایک چیز اس کے صبر اور ضبط کی آخری حد کو کراس کر دیتی تھی، وہ زیان سے جدائی کا خیال تھا، وہ زیان کی محبت سے دستبرداری تھی، وہ زیان کو بھول جانے کا خیال تھا، یہ اس کے صبر اور ضبط کی آخری حد تھی۔

وہ سب کچھ سہہ سکتی تھی، وہ سب کچھ برداشت کرسکتی تھی، وہ ہر صدمہ دل پہ لے سکتی تھی، وجود پہ اٹھا سکتی تھی مگر زیان کی یاد سے جدائی کا تصور بھی محال تھا، زیان کی محبت سے دستبرداری کا خیال بھی محال تھا، زیان کو بھول جانا اس کے اختیار کی کسی حد میں نہیں آتا تھا، زیان سے محبت ایک لافانی جذبہ تھا، زیان سے عشق ایک الہامی جذبہ تھا۔

☆☆☆

میں سوتا ہوں
میرے اندر
ایک سنہرا
جد سے گہرا
غم ہوتا ہے
جب بھی آنکھیں کھولوں
سامنے منظر دیکھوں
گھاس اگ آتی ہے
اور راستہ نم ہوتا ہے

زیان کے وہ دن کسی عذاب سے کم نہیں تھے، ان دنوں کو سوچنا، لکھنا اور شمار کرنا کسی قیامت سے کم نہیں تھا، اس کے دن رات کا چین کھو چکا تھا، وہ محبت اور رشتوں میں قلاش ہو چکا تھا، اس کی پوری زیست کا سرمایہ صرف ایک رشتہ بچا تھا، ارسلہ کے نام کا، وہی زیان کی پوری زندگی کا اثاثہ اور متاع تھی اور زیان اسی اثاثے کو کھو چکا تھا، وہ متاع دل کھو چکا تھا۔

اسے آج تک یقین نہیں آتا تھا کہ ارسلہ بغیر کچھ کہے سنے، کیسے کس طرح اور کیونکر اس سے تمام رابطے ختم کرسکتی تھی؟ ارسلہ اتنی سنگدل اور کٹھور کیسے ہوسکتی ہے، ارسلہ اس قدر بے وفا اور ہرجائی کس طرح بن سکتی ہے؟ زیان کو بالکل یقین نہیں آتا تھا، اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی یقین نہیں آتا تھا۔

وہ ارسلہ سے بات کرنے کے لئے تڑپتا تھا، وہ دن بھر کام کر کے تھکا ہارا آتا اور پوری رات ارسلہ کے نمبر پہ کالز کر کر کے تھک جاتا تھا، ارسلہ کا نمبر ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا تھا۔

پھر صدمے، دکھ، کرب اور اذیت کے اس غبار میں اسے امید کی ایک کرن نظر آئی تھی، اس نے لمحے کے آخری حصے میں اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنایا اور سلطان کے نمبر پہ کال کی۔

وہ سلطان ہی تھا جو اس کی مدد کرسکتا تھا، کم از کم ارسلہ کی خیریت معلوم ہو جاتی، وہ ٹھیک تو تھی؟ وہ زندہ تو تھی؟ اسے کئی طرح کے اندیشے ڈرا رہے تھے، وہ سخت متوحش تھا، سلطان نے اس کی پوری بات دھیان سے سنی تھی، پھر وہی کیا جو زیان نے کہا تھا۔

سلطان، زیان کی طرف سے ایک خط لکھ کر ارسلہ کو بھجوایا، جس میں اس کی خیریت پوچھی گئی تھی اور اپنی خیریت بتائی گئی تھی، یہ خط سلطان نے اپنی ملازمہ کے ہاتھ ارسلہ کو بھجوایا تھا جس کا جواب بھی لفافے میں بند ہو کر فوری طور پر آ گیا تھا، سلطان نے زیان کو دوبارہ کال کی تھی۔

''یار! جواب تو آ چکا ہے، لفافے میں بند

ہو کر، کیا تمہیں پوسٹ کر دوں؟'' سلطان نے اس کی پریشانی کے خیال سے فوراً بتا دیا تھا، ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا، اسے تھوڑا سا ستاتا۔

''کیا پارو گئی تھی وہاں، میری پارو سے بات کروا سکتے ہو؟'' زیان دوسری طرف بے تابی سے بولا تھا، سلطان کچھ بتاتا بتاتا رک سا گیا۔

''ہاں، پارو کو بھیجا تھا، مگر تمہاری بات نہیں ہو سکتی، وہ جا چکی ہے۔'' سلطان نے ملازمہ کے ہاتھ پیغام رسانی والی بات کو چھپا لیا تھا۔

''اچھا۔'' وہ مایوس ہو گیا، وہ ارسلہ کی خیریت سلطان سے تو نہیں پوچھ سکتا تھا۔

''اب بتاؤ، خط تمہارے بتائے گئے پتے پہ پوسٹ کر دوں؟'' سلطان اسے سوچوں کے بھنور سے کھینچ لایا تھا، زیان تھوڑی توقف کے بعد فوراً بولا۔

''نہیں، تم پوسٹ مت کرو، مجھے پڑھ کر سنا دو، پوسٹ کرو گے تو کافی دن بعد میرے تک پہنچے گا، جبکہ مجھ سے صبر نہیں ہو رہا۔'' زیان کی بے تابی اور اضطراب کو محسوس کر کے سلطان نے لفافہ چاک کر لیا۔

ارسلہ نے بڑا لمبا خط لکھا تھا، جگہ جگہ سے لفظ آنسوؤں میں مٹ چکے تھے، تحریر بے ربط بھی تھی اور رقت آمیز بھی، سلطان کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

''زیان! میں نے کہا تھا، تم نہ جاؤ، کبھی نہ جاؤ۔'' بغیر کسی سلامتی کی دعا کے خط کا بڑا بے ربط آغاز تھا، جو ارسلہ کی شکستہ ذہنی کیفیت کو صاف ظاہر کر رہا تھا، سلطان نے لمحہ بھر کے لئے سوچا اور اچانک لائن ڈراپ کر کے موبائل آف کر دیا، اسے پہلے خود تحریر پڑھنی چاہیے تھی، پھر زیان کو پڑھ کر سناتا، نجانے ارسلہ نے کیسے دل خراش قصے لکھے ہوں، بے چارہ پردیس میں پریشان ہو گا، یہی سوچ کر اس نے خط پہ نگاہیں جما دی تھیں۔

''زیان! تم کہاں چلے گئے ہو مجھے تاریکیوں کے جنگل میں چھوڑ کر، مجھے تنہا، اکیلا اور لاچار کر کے میں جن حالات سے گزر رہی ہوں، تمہیں کیا بتاؤں، تمہاری یاد ایک آکسیجن ہے جس کی بدولت ابھی تک سانس لے رہی ہوں، ورنہ تمہاری ارسلہ اب تک مر چکی ہوتی، تمہیں کیا کیا بتاؤں جانے عاطف بھائی کو تمہارے بارے میں کس نے بتا دیا، انہوں نے میرا جینا محال کر دیا تھا، میرا موبائل چھین لیا، مجھ پر پابندیاں لگا دیں، مجھے مارا پیٹا، کمرے میں بند کر دیا، میں نہ کسی سے مل سکتی ہوں، نہ کسی سے بات کر سکتی ہوں، زیان تم جلدی سے واپس آ جاؤ، میں آج بھی تمہارا انتظار کر رہی ہوں، میں تمہاری جدائی میں لمحہ لمحہ مر رہی ہوں، تمہاری واپسی کا ایک ایک دن گن رہی ہوں، میں آبلہ پائی کے اس سفر سے کبھی تھکوں گی نہیں، زیان، میں کبھی اپنے محور سے ہٹوں گی نہیں، تم اس یقین کے ساتھ لوٹ آنا، میں تمہاری راہ تک رہی ہوں، میں لمحہ لمحہ مر رہی ہوں اور کیا لکھوں؟ سمجھ نہیں پا رہی، بس زندگی وبال بنتی جا رہی ہے۔''

سلطان سے مزید درد و ہجر کی داستان پڑھنا محال تھا، اس کا فشار خون بلند ہونے لگا، اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا تھا پھر موبائل آن کر کے زیان کا نمبر ملایا، یقیناً وہ اب تک اس کا نمبر ٹرائی کر کر کے پاگل ہو چکا تھا، اس کی کال دیکھ کر زیان کی جان میں جان آئی تھی، اس نے نمناک لہجے میں بڑی بے صبری سے کہا تھا۔

''یار! جلدی سنا، پھر تیری بیٹری دھوکہ نہ دے جائے۔'' اس کے لہجے میں واضح التجا تھی، سلطان کی بھنویں کھنچ گئی تھیں اور پھر اس نے

زیان کو خط پڑھ کر سنایا۔

''زیان! میں تمہاری راہ دیکھ دیکھ کر تھک چکی ہوں، تم نے کوئی رابطہ نہیں کیا، میں تم سے مایوس ہو چکی ہوں، اب پلیز مجھ سے کوئی رابطہ مت رکھنا، میری شادی ہو رہی ہے، اگر تم مجھ سے سچی محبت کرتے ہو تو پلیز مجھے بھول جاؤ، میری زندگی کو ڈسٹرب مت کرنا، یہ میری تم سے التجا ہے۔'' اس نے خط اپنے تئیں پڑھ کر سنا دیا تھا اور دوسری طرف زیان کا مارے صدمے کے دل بند ہونے لگا تھا، وہ کئی لمحے کچھ بول نہیں سکا تھا، پھر جب بولنے کے قابل ہوا تو اس کی تڑپ سلطان کے کانوں میں پگھلا سیسہ اتار رہی تھی۔

''یہ ارسلہ نے لکھ کر بھیجا ہے؟ میں نہیں مان سکتا، ارسلہ میرے ساتھ اس طرح کیسے کر سکتی ہے، میرے ساتھ ارسلہ دھوکہ کیسے دے سکتی ہے۔'' زیان کا دل پھٹ رہا تھا، اس کی آواز پھٹ رہی تھی، سلطان نے خود اپنے کانوں سے سنا تھا، وہ اونچی آواز میں رو پڑا تھا اور اس کا رونا سلطان کے حواسوں کو جھنجھوڑ رہا تھا۔

فون بند ہو گیا مگر زیان کئی گھنٹے لگاتار روتا رہا، پھر وہ کئی دن بخار میں تپتا رہا، تڑپتا رہا، روتا رہا، وہ حال سے بے حال ہوتا رہا اور دوسری طرف سلطان اپنی طرف سے زیان کا نام لکھ لکھ کر ارسلہ کو نامے بھیجتا رہا۔

زیان اس صدمے کو نہ سہہ سکا تھا اور ہسپتال جا پڑا تھا، جبکہ پیچھے سے سلطان نے کمان سنبھال لی تھی، وہ زیان کی طرف سے آخری خط ارسلہ کو بھیج کر مطمئن تھا، جس میں اس نے ارسلہ سے خوب معذرت کی تھی۔

''مجھے معاف کر دو ارسلہ، میں مجبور ہو گیا تھا، حالات سے تنگ آ چکا تھا، دوبئی میرے لئے یورپ نہیں تھا جو میں راتوں رات امیر ہو جاتا، میں مجبوریوں میں جکڑا گیا تھا، مجھ پہ وقت بڑا تنگ تھا، میں جیل میں ایک ایکسیڈنٹ کی وجہ سے بھی رہا، یہاں پہ میری کسی نے مدد کی، وہ پاکستانی آدمی تھا، اس نے مجھے جیل سے نکلوایا، میری مدد کی، اس کی بیٹی سے میں ایک سال پہلے شادی کر چکا ہوں، میں اپنی زندگی میں مگن ہوں، پلیز تم مجھے معاف کر دو اور اپنی زندگی کی شروعات کر لو، میرا انتظار مت کرنا، میں کبھی لوٹ کر نہیں آؤں گا۔''

زیان کا یہ خط جب ارسلہ تک پہنچا تب ہی اس پہ بھی زیان جیسا خوف طاری ہو گیا تھا، اس کے پیروں تلے سے بھی زمین نکل گئی تھی، اس کے سر سے آسمان کھینچ گیا تھا، اس پہ قیامت کی گھڑی کاری تھی، صدمے کے اس بار نے ارسلہ کے حواس چھین لئے تھے، اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ یہ کیسا ظلم ہوا تھا؟ یہ کیسا اندھیر ہوا تھا۔

تب ارسلہ کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا، وہ موت کے دہانے پہ پہنچ گئی تھی، اس کی حالت زار نے اس کے بھائیوں کا دل نرم کر دیا تھا، اس کے ماں باپ کے دل بھی پسیج گئے تھے، وہ اس کی زندگی کے لئے تگ و دو کرتے ہسپتال میں اس کا نیم مردہ وجود لے کر بھاگ پڑے تھے۔

ارسلہ پہ قیامت طاری تھی، اس محبت نے ارسلہ سے کیسا حساب لیا تھا؟ اس محبت نے ارسلہ کو کیسا برباد کیا تھا؟ وہ اتنی گنہ گار تھی جو اس قدر خوار ہو گئی تھی؟ وہ اتنی خطا کار تھی جو رسوا ہو گئی تھی؟ کیا محبت اتنا بڑا جرم تھی، جس کی سزا کے طور پر زیان نے اس کے گلے میں بے وفائی کا پھندا ڈال دیا تھا، اگر محبت جرم تھی تو ارسلہ ایسی ذلت کی حق دار تھی اور زندگی ارسلہ کے لئے زیان کے نام پر ختم ہو گئی تھی لیکن زندگی ختم کہاں ہوتی تھی؟

☆☆☆

انسان زندگی سے زیادہ جی نہیں سکتا اور موت سے پہلے مر نہیں سکتا، یوں ارسلہ ایک مرتبہ ہسپتال سے گھر تو آ گئی تھی، لیکن اس کے لئے زندگی ختم ہو چکی تھی، یا یوں کہنا چاہیے تھا، زندگی اس کے اندر مر چکی تھی۔

وہ زندہ تو تھی مگر مردوں سے بدتر تھی اور امی ابو چاہتے تھے، وہ پہلے کی طرح زندگی کی طرف لوٹ آئے، جب یہ قیامتیں بیت چکی تھیں تب بھائیوں کو بھی احساس ہو گیا، ان کے سخت رویوں نفرت اور بے جا ضد کی وجہ سے ارسلہ ان حالوں کو پہنچی تھی، ان کی انا پرستی اور نام نہاد غیرت نے ارسلہ کو اپنی ہی ذات کی قبر میں مقید کر لیا تھا۔

بھائی نادم بھی تھے اور پشیمان بھی، سو اپنی پشیمانی اور ضمیر کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے انہوں نے اپنے ماں باپ کو اجازت دے دی تھی۔

''آپ ارسلہ کی خوشی کو پورا کر دیں ابا، ہماری بہن کا انتخاب برا نہیں ہو سکتا، پھر جب قانون، شریعت اور اسلام اسے پسند کی اجازت دیتا ہے تو ہم کون منکر ہوتے ہیں، آپ ارسلہ کی خوشی کو مقدم جانیں، باقی ساری باتیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔''

بھائیوں کا فرمان ارسلہ تک بھی پہنچ گیا تھا، لیکن اب اسے ان باتوں کی ضرورت نہیں تھی، وہ ہر خوشی غمی احساس دکھ کرب سے بے نیاز ہو چکی تھی، اسے اب کسی محبت کی کسی تھپکی کی ضرورت نہیں تھی، وہ اپنے دل سے محبت نامی بوٹی کو اکھاڑ چکی تھی، اب کوئی محبت اسے اپنی طرف کھینچتی نہیں تھی، اس کا دل ہر احساس سے عاری ہو چکا تھا، اس کا دل مردہ ہو چکا تھا۔

اس لئے جب ماہ پارہ کی امی اپنے بیٹے سلطان کے لئے ارسلہ کا رشتہ لے کر آئیں تب اس نے کوئی بھی اعتراض نہیں کیا تھا، اس نے ایک چپ کی بکل میں خود کو لپیٹ لیا تھا، اس کے ماں باپ جو مرضی فیصلہ کرتے، چاہتے تو انکار کرتے، چاہتے تو اقرار کرتے۔

وہ تو ایک جیتا جاگتا مردہ وجود تھی، جس کے بے جان لاشے پہ سرخ لباس لپیٹ کر اسے سولہ سنگھار اور پورے جاہ جلال کے ساتھ جنازے کے بعد رخصت کر دیا جانا تھا اور اس کی رخصتی کا ان دنوں گھر میں اہتمام چل رہا تھا۔

☆☆☆

سلطان کے لئے ارسلہ کے گھر والوں کا اقرار اہم نہیں تھا، اس کے لئے سب سے بڑھ کر ارسلہ کا اقرار مقدم تھا، یعنی اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا؟ جس کا مطلب تھا وہ زیان کی خود غرض محبت کو بھلا چکی تھی، وہ زیان کو بھول گئی تھی، اس کی محبت کو بھول گئی تھی، سلطان فتح کے نشے سے معمور تھا اور اپنی ذہانت کو داد دیئے بغیر نہیں رہتا تھا۔

ارسلہ نے زیان کی محبت کے سوکھے پھول اس کی لوح مزار پہ چڑھا دیئے تھے، زیان اب عمر بھر ان سوکھے پھولوں کی باس کو سینے سے لگائے پھرتا، کبھی وطن نہ لوٹتا، اتنا تو سلطان جانتا ہی تھا، پھر اب تو ارسلہ اس کی زندگی میں آ رہی تھی، وہ جلد اسے اپنی محبت کے شکنجے میں جکڑ لیتا، ارسلہ بھی بہت جلد ہر قسم کی تغیر کو ذہنی طور پر قبول کر لیتی، سلطان کو اعلیٰ ظرف جان کر عمر بھر اس کے سامنے سر جھکائے رکھتی، کبھی نگاہ اٹھا کر بات نہ کرتی، سلطان کا ہر طرف سے پلڑا بھاری تھا اور ان دنوں وہ ہواؤں میں اڑ رہا تھا، شاید یہی صورت حال شادی کے دن تک برقرار رہتی، مگر اس کی بہن پارو کے آتے ہی ماحول بدل گیا تھا۔

پارو کو ارسلہ اور سلطان کی شادی کی ذرہ بھر

خوشی نہیں تھی، وہ اپنی ماں سے بھی لڑ چکی تھی اور بھائی سے بھی، وہ ارسلہ اور زیان کی محبت کو جانتی تھی، ان کی گواہی دیتی تھی، اسے زیان کی بات من گھڑت لگتی تھی اور اس کا جھوٹ کسی طرح سے ہضم نہیں ہوتا تھا، وہ سلطان کی سنائی کہانی پر شدید تعجب کا شکار تھی، وہ زیان کی محبت اور ارادوں کی پائیداری، مضبوطی، استحکام، پختگی سے واقف نہ ہوتی تب سلطان کی من گھڑت پہ یقین کر لیتی، اسے اپنے بھائی پر ذرا بھی یقین نہیں تھا، اسے لگ رہا تھا جیسے کچھ مسئلہ ہے کیا مسئلہ تھا یہ تو وقت ہی بتاتا، ادھر سلطان اس سے لڑتا تھا، بات بے بات طعنے مارتا تھا۔

''تمہیں اپنی بکواس سے فرصت نہیں، تم واحد بہن ہو جسے اپنے بھائی کی شادی کا کوئی چاؤ نہیں ہے۔''

''چاؤ تو بہت تھا، اگر تم اس طرح دھاندلی سے شادی نہ رچاتے۔'' پارو کے دو بدو جواب نے سلطان کو منہ بند کرنے پہ مجبور کر دیا تھا، وہ نگاہ چراتا بھاگ نکلا، تو کیا پارو سب کچھ جان گئی تھی۔

سلطان کے لئے یہ صورت حال بہت پریشان کن تھی، اس کی بہن اپنی سہیلی سے بہت مخلص تھی، اگر اس نے ارسلہ کو کچھ بتا دیا تو سلطان کا بچنا محال تھا، وہ شدید ڈپریسڈ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

اپنی بہن پارو کی شادی میں ارسلہ کے حسن جمال کی فراوانی کو دیکھ کر سلطان اپنا دل ہار بیٹھا تھا، اسے اس عام سے زیان پر بڑا رشک آتا تھا، کیا تھا اس غریب اور مفلس زیان میں، جو یہ اتنی عالیشان خوبصورت شہزادیوں کا سار کھنے والی اس کے عشق میں گرفتار تھی، سلطان نے تب ہی سوچ لیا تھا، قدرت نے اسے موقع فراہم کیا تو وہ ارسلہ کے حصول کی ہر ممکن کوشش کرے گا، پھر اسے قدرت نے شاید آزمانے کے لئے ہی موقع فراہم کر دیا تھا، زیان کی کال کا آنا، زیان کی منت، درخواست اور پھر تجویز کو سن کر سلطان کو اپنی گیم بڑی آسان لگی تھی، وہ دونوں کی طرف سے جھوٹے نامے لکھتا تھا، ایک ارسلہ کو بھجوا دیتا، ایک زیان کو پڑھ کر سنا دیتا تھا، ان دونوں کو ایک دوسرے سے بدگمان کر کے وہ ارسلہ کو حاصل کرنے کے لئے دل و جان سے تیار تھا، پارو کی شادی میں ہی اس نے ارسلہ کو دیکھ کر اپنی نیت بدل لی تھی، وہ اتنے عام سے زیان کے لئے کہاں بنی تھی؟ اس کے ساتھ تو سلطان کو ہونا چاہیے تھا، وہ ارسلہ کے حصول کی خاطر آخری حد تک جا سکتا تھا اور اس نے یہی کیا تھا، آخری حد تک گرا تھا اور اپنی ہی نظروں میں ذلیل ہو گیا تھا، قدرت نے موقع فراہم کر دیا تھا، اس کے جھوٹ کو سامنے لانے کا۔

اس کی مہندی کا فنکشن بڑی دھوم دھام کے ساتھ ہوا، گو کہ امی بھی اندر سے راضی نہیں تھیں، پھر بھی بیٹے کی خوشی کے لئے خوش نظر آ رہی تھیں، لیکن پارو نے قسم کھا رکھی تھی، وہ ذرا بھی مسکرائے گی نہیں، نہ مسکرانے کا ڈھونگ رچائے گی، نہ خوش ہونے کا سوانگ بھرے گی، اس کی بہن اتنی اصول پرست تھی نہیں، لیکن زیان اور ارسلہ کی خاطر جانے کیوں بن چکی تھی۔

وہ بھی اپنی شادی ہو جانے تک صبر کر رہا تھا، کیونکہ شادی تک فی الحال پارو کو برداشت کرنا اس کی مجبوری تھی، گو کہ وہ آتے جاتے اسے کچو کے دینے سے باز نہیں آئی تھی لیکن سلطان اس کی کسیلی باتیں سہنے پر مجبور تھا، ایک مرتبہ اسے ارسلہ مل جاتی، پھر بات کھلتی بھی تو سلطان کو کوئی

پرواہ نہیں تھی، ارسلہ نے اس کے پاس ہی رہنا تھا، کہیں جانا تو نہیں تھا۔

یوں بارات والی شام بھی آنگن میں اتر آئی تھی، اس دن ماہ پارہ خاصی پراسرار لگ رہی تھی، یہی نہیں اس کے والدین بھی کچھ مشکوک نظر آ رہے تھے، سلطان نے کوئی توجہ نہیں دی، وہ چوری چوری کسی سے رابطوں میں مصروف تھے، سلطان چونکا تو تھا مگر خاطر میں نہیں لایا۔

یوں بارات روانہ ہو کر ارسلہ کے گھر میں پہنچ گئی، ان کی طرف سے زیادہ لوگ نہیں تھے اور نہ ہی ارسلہ کی طرف سے زیادہ مہمان تھے۔

جب یہ لوگ ارسلہ کے گھر ڈرائنگ روم میں پہنچے تو وہاں صورت حال بڑی عجیب تھی، ایک سفر سے تھکا ہارا مہمان نظر آیا، جو مولوی صاحب سے مل رہا تھا، یوں لگا جیسے کچھ لمحے پہلے ہی ایجاب وقبول کی رسم ادا کی گئی ہے، سلطان کے لئے یہ منظر انتہائی خوف زدہ کر دینے والا تھا، وہ تھکا ہارا جوان اب سب سے گلے مل مل کر مبارکیں وصول کر رہا تھا اور ارسلہ کے بھائی اسے بڑی محبت کے ساتھ مل رہے تھے، جیسے ہی اس جوان کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آیا، سلطان پہ ساتوں آسمان آن گرے تھے، اسے لگا جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا ہے، یا اس کا دماغ گول گول چکر کھا رہا ہے، یا پھر پوری شادی کا اچانک سیٹ بدل گیا ہے۔

حتی کہ اس کی والدین اور بہن تک مہمان سے بڑی جوش وخروش سے مل رہے تھے، امی اسے مبارک باد دے رہی تھیں، اس کا شانہ تھپک رہی تھیں، سلطان سے یہ منظر دیکھنا محال ہو گیا تھا، اس کے صبر، ضبط اور برداشت کا انت ہو چکا تھا، قریب تھا کہ وہ غم و غصے اور تذلیل کے احساس سے بے حال پھٹ پڑتا اور یہاں کری ایٹ ہونے والے سین پہ ایک قیامت کھڑی کر دیتا۔

معاً وہ مہمان اپنا رخ موڑ کر سیدھا سلطان کے قریب آیا تھا، پھر وہ سلطان کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا اور وہ زیان کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر پتھر میں ڈھل گیا تھا، پھر اس کی سماعتوں نے زیان کی آواز سنی تھی، وہ اس کے کانوں میں نیزے چبھو رہا تھا۔

''بہت خوب، تو میرے دوست، تم نے آستین میں آرام فرما فرما کر بالآخر مجھے ڈس لیا، میرے ساتھ اتنا بڑا کھیل کھیلا، میرے ساتھ ڈرامہ کیا، میرے ساتھ دھوکا کیا، اپنے نفس کے غلام بن کر بدنیتی کے مرتکب ہوئے، مجھے موت کے پروانے بھجوا کر خود یہاں شادیانے بجانے کی تیاریوں میں لگ گئے، مجھے یقین نہیں آتا، تم میرے ساتھ ایسا بھی کر سکتے ہوں، پہلے ارسلہ پہ الزام لگا کر اسے عاطف کی نظروں میں ہلکا کیا، وہ تم ہی تھے نا جس نے عاطف بھائی کو میرے اور ارسلہ کے تعلق کا بتا کر ارسلہ پہ زندگی کے دروازے بند کروائے تھے، وہ تم ہی تھے نا جس نے ارسلہ کو میرے خلاف بھڑکایا، جھوٹے نامے لکھے، مجھ سے بدگمان کیا اور مجھے ارسلہ سے متنفر کر کے دور کر دیا، اس سارے کھیل کا مقصد تمہارا اپنا الو سیدھا کرنا تھا، لیکن یہاں یہ معاملہ ہی الگ ہو گیا، تمہارا کھیل چوپٹ ہو گیا، تمہای بساط الٹی گئی، تم منہ کے بل گر پڑے، تمہارے اس دھوکے کے بدلے مجھے اور ارسلہ کو جو اذیت سہنا پڑی، جس کرب جس درد جس تکلیف سے ہم گزرے ہیں، دل تو نہیں کرتا تمہیں معاف کروں، مگر اپنی اس بہن کے صدقے میں تمہارے اس جرم کو سرعام معاف کرتا ہوں، جو تم نے ہمارے ساتھ کیا، وہ آج پالیا، خالی ہاتھ بے

مراد اور نا کام لوٹ رہے ہو، تمہاری سزا بس یہی ہے، اپنی ہی نظروں میں ذلیل ہو چکے ہو، ارسلہ بھی تمہارا کھیل جان چکی ہے اور ارسلہ کی فیملی بھی، باقی سب مزید جان جائیں گے اور میں تمہیں اس تماشے سے محفوظ رکھتا، تمہیں یہاں سے خوار ہو کر جانا نہ پڑتا، تمہیں آج صبح ہی بتا دیا جاتا کہ ہمارا نکاح ہو چکا ہے، ابھی تو محض کاغذی کاروائی کی گئی ہے، لیکن سب کا خصوصاً تمہارے والدین کا خیال تھا کہ تمہیں یہاں بلا کر بتانا بہت ضروری تھا، اس لئے کہ تماشا دیکھنے والوں کو جب اپنا تماشا دکھانا پڑتا ہے تو ان پہ کیا گزرتی ہے، سو تم بھی انجوائے کرو اور دوسروں کو بھی انجوائے کرنے کا موقع دو، یہ تو میری بہن ماہ پارہ کا مجھ پہ احسان ہے، جس نے مجھے ساری حقیقت بتا کر فوراً پاکستان آنے کا مشورہ دیا تھا، ورنہ میرا ٹائی ٹینک تو تم ڈبو ہی چکے تھے، دوست کے لبادے میں چھپے کھلے دشمن، تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا، پھر بھی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتا ہوں اور تمہیں معاف کرتا ہوں۔"

زیان کے الفاظ سلطان کے پتھر وجود کو پانی پانی کر گئے تھے، اس کی حقیقت کھل گئی تھی، ہر کوئی اسے ملامت کر رہا تھا، وہ انتہائی شرمسار اور پشیمان تھا، اسی لئے سر جھکا کر شرمندہ شرمندہ منظر سے غائب ہو گیا، جب وہ جا رہا تھا تو اس کی چال بڑی غیر ہموار اور شکستہ تھی، کیونکہ دھوکے بازوں کی چال ان پہ الٹی جا چکی تھی۔

سلطان کے منظر سے ہٹتے ہی ماحول بدل گیا تھا اور ایک مرتبہ پھر رنگ و نور کی محفل سج گئی تھی، زیان بھی اس محفل کا حصہ بن چکا تھا، کیونکہ بادباں کھل چکے تھے، کہر چھٹ گئی، دھند ہٹ چکی تھی، بدگمانیوں کے جالے اتر چکے تھے۔

☆☆☆

اور آج ان کی شب زفاف تھی، انتہائی کڑے مراحل اور صبر آزما انتظار کے بعد ملن کی گھڑیاں قریب تر تھیں، دونوں کے جذبات ایک سے تھے، دونوں کے دل درد و غم اور جدائیوں کے بار سہہ سہہ کر پگھل رہے تھے، دونوں ہی اپنی اپنی روداد ہجر سنانے کے لئے مچل رہے تھے، زیان کے لئے آج کی مبارک رات کا مل جانا اتنا آسان نہیں تھا۔

اس دن جب سلطان نے ارسلہ کا خط اسے پڑھ کر سنایا تھا تب وہ ایک دم صدمے کی شدت سے نڈھال ہو گیا، یہ وار بہت کاری تھا، بڑا گہرا تھا، زیان کو سنبھلنے کے لئے بڑا وقت درکار تھا، پھر وہ غم کی شدت سے بیمار پڑ گیا، اسے ہسپتال داخل ہونا پڑا تھا، وہ کتنے ہی دن خود سے بیگانہ رہا تھا، اس کا زندگی سے رشتوں سے محبتوں سے اعتماد اٹھ گیا تھا، اسے خود سے ہر چیز سے اپنی کامیابیوں سے نفرت ہو گئی تھی، وہ ارسلہ کی بے وفائی کے بعد قریب تھا کہ خودکشی کا فیصلہ کر لیتا جب اچانک اسے ماہ پارہ سے بات کرنے کا خیال آ گیا تھا۔

ایک لمبے عرصے کے بعد اس نے آنٹی سے نمبر لے کر ماہ پارہ سے بات کی تھی اور اس نے جو کچھ اسے بتایا وہ انتہائی حیران کن تھا، پارو نے اسے بتایا، وہ اپنے سسرال میں تھی، سلطان نے اسے کوئی خط نہیں دیا تھا جسے وہ ارسلہ کو دیتی، سلطان اپنی طرف سے من گھڑت قصے سنا رہا تھا، پارو نے ہی اسے بتایا تھا، یہ ساری چال سلطان کی تھی، وہ اسے رستے سے ہٹا کر اپنا رشتہ ارسلہ کے لئے بھجوا چکا تھا اور اب شادی کی تیاریاں چل رہی تھیں، اگر اسے اپنی محبت بچانا تھی تو وہ فوراً واپس پلٹ آئے اور زیان نے ایک دن بھی ضائع کیے بغیر واپس لوٹ آیا۔

یہاں اس کے آنے سے پہلے ہی پارو اور آنٹی نے ارسلہ کی پوری فیملی کو ہر سچائی بتا دی تھی، یوں زیان کو کسی کی سوالیہ نظر کو سہنا نہیں پڑا تھا، ارسلہ کے امی ابو جہاں سلطان کے دھوکے پہ خفا تھے وہیں زیان کے واپس آ جانے پہ خدا کے بہت مشکور تھے، جس کی وجہ سے ان کی بیٹی کی زندگی میں بہاریں دستک دینے لگی تھیں۔

ارسلہ کے امی ابو نے ایک لمبے عرصے بعد اپنی بیٹی کو اتنا شاد دیکھا تھا سو وہ مطمئن اور مسرور کیوں نہ ہوتے ان کی بیٹی بالآخر اتنے درد و کرب سہنے کے بعد زندگی کی حقیقی خوشیوں کو پا گئی تھی، ان کی سچی خالص صاف شفاف محبت کو خدا نے تکمیل کے مراحل سے گزار دیا تھا۔

☆☆☆

اور آج تاروں بھرا آسمان بھی ان کے ملن پہ خوشی سے مسرور تھا اور اندر شب زفاف مسکرا رہی تھی، جبکہ ارسلہ کے آنسو ایک تواتر سے گرتے تھے اور زیان ان کو چنتا بے ساختہ بوکھلاہٹ کا شکار تھا اور وہ بار بار ایک ہی بات دوہرا رہی تھی۔

''ہم تب کیوں نہیں ملے زیان؟'' جب وہ سارا کرب، سارا درد، ہجر کا ایک ایک دکھ اسے کھول کھول کر بتا چکی تھی، زیان نے نرمی، محبت اور ملائمت سے اس کا ایک ایک آنسو اپنی پوروں پہ چن لیا تھا، وہ اسے اپنی محبت، چاہت اور اعتماد سے شانت کر رہا تھا، اسے سکون اور طمانیت بخش رہا تھا، یوں کہ ارسلہ کے جلتے بلتے دل کو قرار آنے لگا تھا، اس کے آنسو تھمنے لگے تھے، اس کے دل میں سکون اترنے لگا تھا۔

''ہمیں اب ہی ملنا تھا میری جان، کہ لکھا ہوا کبھی مٹتا نہیں، ہونے والا کبھی ٹلتا نہیں۔'' زیان نے اس کا کپکپاتا ہاتھ تھام کر نرمی سے دبایا تھا، ارسلہ کے دل میں سکون بوندوں کی طرح گرنے لگا تھا۔

''اور سلطان نے کیا کیا؟ مجھے یقین نہیں آتا۔'' وہ سلطان کا قصہ چھیڑنا چاہتی ہی تھی جب زیان نے بے ساختہ اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ کر روک لیا۔

''تاریخ سلطان پہ کسی اور روز روشنی ڈال لیں گے، فی الحال تم مجھ پہ توجہ کرو۔'' زیان نے نرمی سے اسے موضوع سے ہٹایا تو ارسلہ کے ہونٹوں پر حیاء آلود تبسم پھیل گیا تھا۔

''تمہاری کہانی بھی سننے کے لئے عمر پڑی ہے، چلو پہلے نوافل ادا کر لیں۔'' ارسلہ اس کی بڑھتی پیش قدمی پہ بندھ باندھتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھی تو زیان بھی بے ساختہ حواس باختہ سا اٹھ گیا تھا۔

''تم نے کیا منت مانی تھی؟'' وہ مری مری آواز میں پوچھ رہا تھا۔

''ہاں پورے سو نفل کی، اپنے اور تمہارے ملن کے لئے، پچاس تم پڑھو گے پچاس میں۔'' ارسلہ اپنی جگہ سے اٹھ چکی تھی، اب وضو کرنے واش روم جا رہی تھی، جبکہ زیان سر پہ ہاتھ مار کر گہرا سانس کھینچتا اس کی تقلید میں اٹھ کھڑا ہوا تھا، پھر اس کا بازو پکڑ کر بے ساختہ بولا۔

''منت تو کل بھی پوری کی جا سکتی ہے، آج کے دن پورا کرنی ضروری تو نہیں نا؟'' اس کی چمکتی آنکھوں میں شرارت دیکھ کر ارسلہ بے ساختہ ہنسی تو پھر ہنستی چلی گئی تھی، باہر تاروں بھری رات بھی ان کے ملن پہ مسکراتی رہی تھی۔

☆☆☆

سعدیہ عابد

''خدیج! پلیز جانے دیجئے ناں۔'' وہ لجاجت سے بولی تھی لیکن ان کی تیز نظر سے خائف ہوتی مزید کچھ نہ کہہ سکی تھی اور بے توجہی سے پلیٹ میں چمچہ گھمانے لگی تھی۔

''ونی! کھانا کھایئے۔'' وہ اس کی بے توجہی محسوس کرتے ہوئے اسے ٹوک گئے تھے۔

''ہمیں بھوک نہیں ہے۔'' ان کے کہنے کا الٹا ہی اثر ہوا تھا اور اس نے پلیٹ ہی کھسکا دی تھی۔

''آپ سے پہلے بھی کئی بار کہہ چکے ہیں کہ ناراضگی کا اظہار کھانے کے سامنے بیٹھ کر نہ کیا کریں۔'' ان کے لہجے کی درشتگی اس کی آنکھیں نم کر گئی تھیں۔

''نشینا! ہماری دوست ہیں خدیج اور ہم کیا اپنی دوست کی سالگرہ تک میں نہیں جا سکتے۔'' بھیگے لہجے میں واضح شکوہ کیا گیا تھا۔

''نہیں، کہ آپ جا سکتی ہوتیں تو ہم جانے دیتے یوں آپ کو ہم سے بحث نہیں کرنا پڑتی، یہ جاننے کے باوجود کہ ہمیں بحث پسند نہیں ہے۔'' وہ قدرے ناگواری سے کہہ رہے تھے۔

''ہم بحث نہیں کر رہے خدیج، کہ بس ہم تو یہی چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں جانے کی اجازت دے دیں۔'' وہ کرسی کھسکا کر اٹھ گئے تھے مگر اس کی اگلی بات نے ان کے قدم روکے تھے اور وہ اس کے بھیگے چہرے کو دیکھنے لگی تھی۔

''ہم مناسب نہیں سمجھتے اگر مناسب سمجھتے تو اجازت دے دیتے اس لئے بہتر ہوگا کہ یہ ذکر آپ دوبارہ نہ کریں۔'' وہ بات مکمل کر کے نکل گئے تھے جبکہ اس کے آنسوؤں میں روانی آ گئی تھی۔

''اماں بی! خدیج کی کڑی نگاہیں، سخت لہجہ اور بے جا پابندیاں کسی دن ہماری جان لے لیں

مکمل ناول

گی۔'' وہ اماں بی کا ہاتھ اپنے کاندھے سے ہٹاتی روتے ہوئے بولی تھی۔

''بیٹا! خیر کی بات منہ سے نکالتے ہیں۔'' وہ تاسف سے بولی تھیں کہ اس کا رونا ان کو تکلیف دے رہا تھا۔

''دیکھ لیجئے گا، ایسا ہی ہوگا۔'' وہ غصہ میں وثوق سے کہتی انہیں پریشان چھوڑ کر نکلتی چلی گئی تھی۔

☆☆☆

''ونی! نے کھانا کھالیا؟'' اماں بی کے ہاتھ سے چائے کا مگ لیتے ہوئے پوچھا تھا۔

''آپ کوشش تو کرتیں اماں بی۔'' ان کا ناں میں جواب انہیں مضطرب کر گیا تھا۔

''کی تھی خدیجہ بابا! لیکن بیٹا دودھ تک لینے کے لئے راضی نہ ہوئیں کہ وہ تو اس وقت سے بس روئے جا رہی ہیں۔'' اماں بی کی بتائی ہوئی تفصیل ان کے اضطراب کو کئی گنا بڑھا گئی تھی۔

''آپ کھانا گرم کرکے ونی کے لئے لے کر چلیے، ہم آ رہے ہیں۔'' چائے کا مگ ٹیبل پر منتقل کیا اور لیپ ٹاپ سائیڈ میں کرتے بیڈ سے اتر گئے۔

''ونی! ہم آپ کو ایسی جگہ جانے نہیں دے سکتے جہاں سب آپ کے لئے اجنبی ہوں گے۔'' وہ رائٹنگ ٹیبل کے ساتھ لگی چیئر کھسکا کر بیٹھتے انتہائی نرم لہجے میں بولے تھے کہ وہ کافی زیادہ رو چکی تھی اس کا چہرہ متورم اور آنکھیں سرخی مائل ہو رہی تھیں اور اسے یوں دیکھنا ان کے لئے ہمیشہ ہی تکلیف کا باعث ہوتا تھا اس وقت بھی وہ دکھ تاسف میں مبتلا ہو گئے تھے۔

''ہمارے لئے تو پورا ہی جہان اجنبی ہے۔'' اس کی غیر متوقع بات پر ان کی آنکھوں میں تحیر سمٹ آیا تھا۔

''اور ہم ساری عمر لوگوں کی بھیڑ و دنیا کے میلے میں بھی ہر ایک کے لئے اجنبی ہی رہیں گے کہ اجنبیت کی دیواریں میل ملاپ سے گرتی ہیں اور آپ کی قید میں رہ کر یہ ممکن نہیں کہ ہم لوگوں سے مل کر اجنبیت دور کریں، روابط و شناسیاں بڑھائیں۔'' وہ دونوں ہی بے اختیار سا اسے دیکھنے لگے تھے کہ اس کے الفاظ ہی نہیں لہجہ بھی نظر انداز کرنے والا نہ تھا وہ بھی اس صورت میں کہ شکوہ اس کے لبوں سے پہلی دفعہ ادا ہوا تھا اور چہرے پر بدگمانی کی لکیریں سی بنیں تھیں۔

''آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟'' اندر کی الجھن لہجے سے قدرے عیاں ہو گئی تھی۔

''وہی جو آپ سمجھنا نہیں چاہتے۔'' ناراضگی سے ان کے خوبرو چہرے کو دیکھا تھا۔

''آپ سمجھائیں گی تو ہم سمجھ جائیں گے، کہیے جو کہنا ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولے تھے۔

''ہم نے کبھی کوئی ضد تو کیا کبھی کوئی فرمائش تک نہیں کی، آپ نے جیسے کہا ویسے کرتے چلے گئے۔'' وہ سوں سوں کرتے کہہ رہی تھی وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''مگر اب ہم کوئی چھوٹی بچی تو نہیں رہے ناں کہ آپ ہمیں اپنی انگلی کے اشارے پر چلاتے رہیں، ہم بڑے ہو گئے ہیں آپ اب تو ہمیں کم از کم اتنی آزادی تو دیں کہ ہم کچھ کہہ سکیں، دوست کے گھر جا سکیں۔'' وہ مزید کہتی کہ ان کی تیز نظر سے خائف ہوتی چپ کر گئی تھی اور وہ کچھ کہے بغیر بڑی تیزی سے وہاں سے نکل گئے تھے جبکہ اماں بی کچھ سوچنے لگی تھیں۔

☆☆☆

''آپ سچ کہہ رہے ہیں خدیجہ! ہم واقعی اپنی دوست کی برتھ ڈے پارٹی میں جا سکتے ہیں۔'' انہوں نے اسے اجازت کیا دی تھی بے

یقین کر ڈالا تھا مگر انہوں نے سنجیدگی سے اپنی بات دہرائی تھی اور اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

''تھینک یو سو ویری مچ۔'' وہ بچوں کی طرح پرجوش سی بولی تھی اور وہ اس کو مسرور پا کر بے اطمینانی کے باوجود مسکرا دیئے تھے کہ ان کے لئے اس کی خوشی بہت معنی رکھتی تھی۔

''جب جانا ہو بتا دیجئے گا آپ کو اور اماں بی کو ہم چھوڑ آئیں گے۔'' سنجیدگی سے کہتے صوفے کی جانب بڑھے تھے کہ اس کی اگلی بات پر رک کر اسے دیکھنے لگے تھے۔

''ہمیں کل جانا ہے خدیج! بٹ ہمیں شینا کے لئے گفٹ بھی تو چاہیے ہوگا۔'' اس کی خوشی اس کے من موہنے شہابی رنگت والے چہرے سے ٹپکی جا رہی تھی کہ انہوں نے اسے ایک غیر متوقع آفر کر دی تھی اس کی ساگر سی آنکھوں میں بے یقینی اتری تھی اور انہوں نے گویا مسکرا کر اپنے فیصلے کی توثیق کی تھی وہ بے انتہا خوشی کے احساس میں گھرتی ان سے لپٹ گئی تھی۔

''تھینک یو سو مچ خدیج! آپ بہت اچھے ہیں۔'' اس کا لہجہ اس کی اندرونی مسرت سے کھنک رہا تھا جبکہ وہ اس کی حرکت پر لمحہ بھر کو ساکت ہوئے تھے اور دوسرے ہی پل اسے ایک جھٹکے سے خود سے دور دھکیل گئے تھے۔

''بی ہو یور سیلف ہو بینا بخاری۔'' وہ چیختے لہجے میں درشتگی سے بولے تھے وہ ساکت سی انہیں نم پلکوں سے دیکھنے لگی تھی جو اچانک ہی بہت اجنبی بن گئے تھے۔

''اپنے جذبات، اپنے احساسات کو قابو میں رکھنا سیکھیے ہو بینا کہ آپ بچی نہیں رہیں۔'' ان کا بری طرح جھٹکنا، بری طرح ڈپٹنا اس کی حساس طبیعت پر چوٹ لگا گیا تھا، آنسو گرنے لگے تھے اور وہ شرمندگی سے منمنائی تھی۔

''سوری۔'' لیکن وہ اس کی معذرت سننے کو رکے نہیں بڑی تیزی سے ہال کمرہ عبور کر گئے تھے۔

☆☆☆

''ونی! ہم آپ سے معذرت چاہتے ہیں، ہمیں کل رات آپ کو اس بری طرح نہیں ڈانٹنا چاہیے تھا۔'' رات بھر رونے اور جاگنے کے سبب وہ بخار میں مبتلا ہوگئی تھی اور اس کی سوجی آنکھیں دیکھ وہ تمام غصہ ہی بھلا بیٹھے تھے اور معافی طلب کرنے میں بھی دیر نہیں کی تھی۔

''ہمیں آپ کی معافی کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ کے رویے سے ہی ہم بہت کچھ سمجھ گئے ہیں، بہت برے لگتے ہیں ناں ہم آپ کو، تو پرامس خدیج اب ہم چھٹیوں میں بھی ہاسٹل سے گھر نہیں آیا کریں گے۔'' اس کی آنکھوں کی سطح گیلی ہوگئی تھیں جبکہ لہجہ ناراضگی و غصہ کا مظہر تھا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے ونی بیٹا! آپ اس طرح کیوں کہہ رہی ہیں۔'' اماں بی گداز دل کے ساتھ بیڈ پر اس کے برابر ٹک گئی تھیں۔

''ایسا ہی ہے اماں بی، کہ ہم خدیج کے لئے بوجھ بن گئے ہیں، یہ ہم سے پہلے کی طرح نرمی سے بات نہیں کرتے، ہر وقت ڈانٹتے، غصہ کرتے رہتے ہیں ہم نہ ان کے سامنے آئیں گے اور نہ ہی انہیں ہمیں دیکھ کر غصہ آئے گا، اس لئے ہم آج ہی ہاسٹل واپس چلے جائیں گے۔'' وہ جیسے سارے فیصلے از خود لے چکی تھی۔

''فضول بات کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے کہ ہم آپ کو آپ کی غلطی پر سرزنش کرنے کا مکمل حق رکھتے ہیں اور رات آپ کو اسی لئے ڈانٹا کہ آپ ہمیں غلطی پر لگی تھیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے اسے مزید کچھ کہنے سے ٹوک گئے تھے۔

''اور یاد رکھیئے گا کہ ہم آپ کی آزادی کے

خلاف نہ ہوتے ہوئے بھی بہت چاہ کر بھی آپ کو آزادی نہیں دے سکتے کیونکہ آپ ہماری ذمہ داری ہیں اور اسی لئے آپ کی بہتری کے خیال سے آپ کے لئے چند اصولوں وضوابط مقرر کیے ہیں کہ آپ کو کہیں بھی آنے جانے کی اجازت نہیں دے سکتے آپ ہماری فکر کو غلط معنی پہنائیں تو یہ آپ کی غلطی ہے کہ آپ کی ناراضگی کے ڈر سے ہم اپنے اصول اور فکر کے زاویے نہیں بدل سکتے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنا موقف بیان کرنے کے بعد اس کی بات یا موقف سننے کو رکے تک نہیں تھے اور وہ روتے ہوئے اماں بی سے ہزار شکوے کرنے لگی تھی اور وہ سمجھتی تھیں کہ اس کی بات پر شکوہ اتنا بھی بے معنی نہیں مگر وہ یہ خدیج بخاری کو نہیں سمجھا سکتی تھیں کہ وہ اپنے ہی خول میں سمٹے ایک خاموش طبیعت انسان تھے اور ان سے کچھ کہنے کی ان کی ہمت نہیں پڑتی تھی مگر کب تک وہ اپنے ذہن و دل کی بات و خواہش کو دبائے رکھتیں؟ ہوینا بخاری کی باتیں سن کر وہ خدیج بخاری سے بات کرنے کا فیصلہ کر چکیں تھیں۔

☆☆☆

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں اماں بی۔'' وہ بتول بی کی بات سن کر بیٹھے سے کھڑے ہو گئے تھے ان کی آنکھوں میں بے یقینی اور لہجے میں لڑکھڑاہٹ سی تھی۔

''ایسا کچھ غلط نہیں کہا ہم نے کہ یقین کریں خدیجہ بیٹا حیات ہوتیں تو وہ بھی یہی فیصلہ لیتیں۔'' وہ ان کی حالت نظر انداز کیے اپنی بات پر زور ڈالنے کو ان کی ماں کا حوالہ دے گئی تھیں۔

''اماں بی! مت کہیں ایسا کچھ کہ ہم خود پر ضبط کھو دیں کہ وٹی کے لئے ہم اس انداز سے سوچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔'' وہ اماں بی کے احترام میں مٹھیاں بھینچے غصہ ضبط کرنے پر مجبور تھے۔

''خدیج بابا! آپ ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ کر دیکھیں یہ ایکدم درست فیصلہ ہوگا۔'' وہ اب بھی نرمی سے ہی بولی تھیں۔

''کیا ہو گیا ہے آپ کو اماں بی، ایک دفعہ کہہ دیا ہم نے کہ ایسا ممکن ہی نہیں ہے تو آپ کیوں خاموش نہیں ہو جاتیں۔'' وہ غصہ سے بھڑک کر بولے تھے وہ بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگی تھیں اور ان کے بوڑھے چہرے پر پھیلے تاریک سائے خدیج بخاری کے اعصاب ڈھیلے پڑتے چلے گئے تھے۔

''آئی ایم سوری اماں بی!'' وہ نہایت شرمندگی سے معذرت طلب کر رہے تھے۔

''معاف تو بابا آپ ہمیں کر دیں کہ ہمیں آپ سے اتنی بڑی بات کہنی ہی نہیں چاہیے تھی، گھر کی ملازمہ ہیں مگر اپنی حیثیت ہی بھول گئے تھے۔'' ان کے آنسو گرنے لگے تھے۔

''خدارا اماں بی ایسے نہ کہیں، آپ کو اماں بی صرف زبان سے کہا ہی نہیں ہے ہم آپ کو ایک ماں کا درجہ دیتے ہیں۔'' وہ ان کے سامنے آتے ان کے ہاتھ تھام گئے تھے۔

''آپ سے اس طرح بات نہیں کرنا چاہتے تھے مگر آپ کی بات پر ضبط کھو بیٹھے کہ وٹی ہمارے لئے بہت قابل احترام ہیں ہم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے اماں بی، آپ کے احترام میں بھی آپ کے فیصلے کا احترام نہیں کر سکتے۔'' وہ اماں بی کے سامنے سے نکلتے چلے گئے تھے۔

☆☆☆

''آپ ہی بتایئے ناں خدیج کہ ہم شینا کے لئے آخر کیا لیں؟ کہ ہمیں تو کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا۔'' وہ پہلی دفعہ شاپنگ مال آئی تھی اور اسی لحاظ

سے پر جوش تھی مگر ساتھ ہی نروس بھی ہو رہی تھی ایک ایک چیز کو بچوں کی طرح اشتیاق سے دیکھ رہی تھی انہوں نے اس کے بے حد حسین چہرے پر جوش اور بوکھلاہٹ کا حسین امتزاج دیکھا تھا اور اس کو گائیڈ کرنے لگے تھے اور ان کی ہی مدد سے اس نے نہ صرف شینا کے لئے بلکہ اپنے اور اماں بی کے لئے بھی کافی کچھ خرید لیا تھا۔

''سوچ کیا رہے ہیں خدیج! ہمیں پیسے آپ نے ہی دینے ہیں۔'' لمبا چوڑا بل بنوا دینے کے بعد وہ ان سے مزید پانچ ہزار طلب کرتی انہیں حیران کر گئی تھی مگر اس کے نروٹھے پن سے کہنے پر انہوں نے اگلے ہی پل ایک لفظ کہے بنا اس کی مطلوبہ رقم اس کی جانب بڑھا دی تھی۔

''آپ یہیں ٹھہریئے ہم آتے ہیں۔'' وہ پانچ ہزار کا نوٹ مٹھی میں دبے دبے جوش سے دبائی دھیمے سے بولی تھی۔

''آپ اکیلے کیسے جائیں گی ہم آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔'' اسے آگے بڑھتے دیکھ کر وہ اس کے ہم قدم ہوئے تھے کہ وہ رک گئی تھی۔

''خدیج! آپ پلیز یہیں رکیے ناں، ہم پانچ منٹ میں آجائیں گے گوڈ پرامس۔'' اس کے چہرے پر تجسس سا تھا آنکھوں میں اشتیاق وہ الجھ گئے تھے جبکہ وہ انہیں حیران چھوڑ کر وال گلاس دھکیلتی شاپ میں داخل ہو گئی تھی اور وہ بے چینی سے اس کے آنے کا انتظار کرنے لگے تھے وہ تقریباً گیارہ منٹ بعد ایک بیگ کے ساتھ لوٹی تھی جسے لینے کو انہوں نے ہاتھ بڑھایا تھا۔

''نہیں خدیج! یہ ہم خود پکڑیں گے۔'' وہ حیران تو ہوئے مگر اس کی رگ رگ سے واقف تھے لحہ کے ہزارویں حصے میں ساری صورتحال سمجھ گئے تھے اور اس کی خوشی میں خوش اسے شاپنگ کے بعد ڈنر کے لئے لے گئے تھے۔

☆☆☆

''اماں بی! آج ہم بہت خوش ہیں، دنیا اتنی خوبصورت ہے یہ احساس آج ہوا ہے ہمیں۔'' وہ اماں بی کے کاندھے تھامے کھنکتے لہجے میں بول رہی تھی۔

''آج ہم نے بہت زیادہ انجوائے کیا اور ہم نے خدیج کی آج اچھی خاصی جیب خالی کروا دی ہے۔'' وہ دھیمے سے ہنسی تھی ان دونوں نے ہی اس کی دائمی خوشیوں کی دعا دل ہی دل میں ڈالی تھی۔

''اچھی خاصی کیا مطلب؟''

''اماں بی! آپ کی ونی بٹیا نے پورے اسی ہزار کی شاپنگ کی ہے ہمیں کنگال کر دیا ہے۔'' آج انہوں نے اس کا بہت پیارا روپ دیکھا تھا اور اس کی خوشی کو قائم رکھنے اور بڑھانے کو شرارت کا مظاہرہ کر گئے تھے۔

''ہم جانتے ہیں آپ اتنے غریب نہیں ہیں کہ اسی ہزار میں ہی کنگال ہو جائیں۔'' وہ اماں بی کے سامنے سے ہٹتی یقین سے کہتی صوفے پر بیٹھ گئی تھی، اماں بی اور وہ مسکرا دیئے تھے، اماں بی کو یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا اور ان کی خواہش انہیں ستانے لگی تھی مگر ان کے رات کے ردعمل کے ذہن میں آتے ہی وہ اپنا دل محسوس کر رہ گئی تھی۔

''وہ تو ہم کچھ تھک گئے تھے اس لئے صرف اسی ہزار کی شاپنگ کی ورنہ ہمارے ارادے تو آج بڑے ہی خطرناک تھے۔'' وہ مزے سے ڈرانے والے انداز میں کہہ رہی تھی اور اپنی شرارت پر خود ہی کھلکھلائی تھی ان دونوں نے ہی اس کے چہرے سے نگاہ ہٹائی تھی کہ مبادا ان میں سے کسی کی نظر نہ لگ جائے، اماں بی کچن میں جانے لگی تھیں مگر اس کے بلانے پر صوفے پر آ

بیٹھی تھیں اور وہ اپنی شاپنگ انہیں دکھانے لگی تھی۔

''اماں بی ہم نے فرسٹ ٹائم اپنی پسند سے آپ کے لئے کچھ لیا ہے بتایئے نہ آپ کو کیسا لگا۔'' اس کی آنکھوں میں الجھن سی در آئی تھی جو ان کے تعریف کرنے پر دور ہو گئی تھی اور وہ وہاں سے اٹھ کر جانے لگے تھے کہ وہ ان کے سامنے آ گئی تھی۔

''خدیجہ! یہ آپ کے لئے۔'' وہ بیگ جو وہ پورے راستے بہت حفاظت سے سنبھالتی آئی تھی اس نے وہ خدیجہ کی جانب بڑھایا تھا جسے وہ مسکرا کر تھامتے ہوئے آگے بڑھے تھے۔

''خدیجہ! ہمارے سامنے کھول کر دیکھیے۔'' وہ آواز پر رکے اور صوفے پر بیٹھ گئے، وہ انہیں قدرے نروس ہو کر آس بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

''ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ آپ کی پسند اتنی اچھی ہو گی۔'' بلیک کلر کی گرے ڈاٹس والی ٹائی کو وہ ستائش بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے شرارت سے بولے تھے۔

''آپ کو سچ میں اچھی لگی ہے ناں، کہیں ہمارا دل رکھنے کو تو نہیں کہہ رہے۔'' وہ اب بھی نروس تھی وہ مسکرا دیئے تھے۔

''آپ کا دل نہیں رکھ رہے، یہ واقعی بہت اچھی ہے۔'' انہوں نے سچائی سے اس کی پسند کو سراہا تھا۔

''تھینک گاڈ، یہ آپ کو پسند آ گئی ورنہ ہم تو ڈر رہے تھے کہ نہ جانے آپ کو یہ پسند بھی آئے گی کہ نہیں۔'' وہ مسکرا رہی تھی۔

''یہ ہمیں بہت پسند آئی ہے اور اسے ہم ہمیشہ سنبھال کر رکھیں گے کیونکہ یہ ہمارے لئے بہت اہم ہے کیونکہ یہ ہمیں ہماری ونی نے بہت خلوص کے ساتھ گفٹ کی ہے۔'' وہ خلوص دل سے بولے تھے اور یکدم اسے اپنا گزشتہ رویہ یاد آیا تھا اور وہ بلا توقف ان سے معافی طلب کر گئی تھی۔

''آئی ایم سوری خدیجہ! اس وقت ہمیں پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا کہ ہم آپ سے اتنی بدتمیزی کر گئے۔'' اس کے من موہنے چہرے پر شرمندگی نے پنجے گاڑ دیئے تھے۔

''اٹس او کے بس اتنا یاد رکھیئے گا کہ آپ ہمارے لئے بہت اہم ہیں اور آپ کی پرواہ کے خیال سے آپ کی حفاظت کی نیت سے ہم نے آپ پر کچھ پابندیاں لگا دیں اور چونکہ ماں جی کی زندگی دیکھ چکے تھے اس لئے کبھی خیال ہی نہیں گزرا کہ آپ کو بدلتے حالات اور تقاضوں کے سبب تبدیلی کی آزادی کی ضرورت ہو گی۔'' وہ نرمی سے اپنا موقف کہہ رہے تھے۔

''ہمیں کبھی خود سے آزادی کا خیال نہیں آیا تھا مگر شینا نے ہمیں بار بار احساس دلایا کہ ہم ایک ابنارمل زندگی گزار رہے ہیں، ہماری زندگی میں بہت کچھ مسنگ ہے۔ بس اسی سب کے پیش نظر ہم اس طرح سوچنے اور کہنے پر مجبور ہو گئے، مگر یقین کریں ہمیں آپ کی کسی بات سے کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے لیکن......'' وہ بھیگے لہجے میں کہتی یکدم رک گئی تھی۔

''آپ کا رویہ ہمیں بہت تکلیف دیتا ہے آپ ہر بات سختی سے منع کر دیتے ہیں جبکہ آپ نرمی سے بھی تو ہمیں سمجھا سکتے ہیں۔'' وہ جھکا سر اٹھا کر یکدم ہی اس کے آنسوؤں سے بھیگتے چہرے کو دیکھنے لگے تھے۔

''آپ نہیں جانتے خدیجہ! کہ آپ کا سرد لہجہ، بے تاثر آنکھیں اور یہاں تک کہ آپ کی خاموشی بھی ہماری ہمت توڑ دیتی ہے، آپ نے

کیوں دھیرے دھیرے ہم سے اتنے فاصلے بڑھا لئے ہیں؟" وہ اب رونے لگی تھی۔

"دنی! ہم نے آپ سے فاصلے نہیں بڑھائے بس رشتے کی حقیقت ونزاکت کے پیش نظر محتاط ہو گئے اور چاہتے ہیں کہ آپ بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیں۔" وہ کافی دیر کی خاموشی کے بعد بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے تھے اور وہاں سے نکلتے چلے گئے تھے جبکہ وہ ان کی بات پر غور کرتی خاموش بیٹھی رہ گئی تھی کہ اسے اختلاف تھا بھی تو کہہ نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

خدیج بخاری کا ذہن بری طرح منتشر تھا اور وہ ہوینا بخاری کی باتوں اور اپنے رویے کو سوچتے وہ ماضی میں اترتے چلے گئے تھے۔

معارج بخاری کا تعلق سید گھرانے سے تھا وہ دو بھائی تھے، معارج بڑے تھے اور ان سے چھوٹے اریج بخاری تھے، معارج بخاری کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے تھا جہاں پردے کا خصوصی خیال رکھا جاتا تھا ان کے ہاں کی خواتین شرعی پردہ کرتی تھیں اور بہت ضرورت کے وقت گھر سے نکلا کرتی تھیں، معارج بخاری کی شادی تایا زاد خدیجہ سے ہوئی تھی جو حصول علم کے علاوہ کسی فضول کام کے لئے گھر سے نہیں نکلی تھی، خدیجہ نے بی اے کیا تھا، شادی کے دو سال بعد ان کی زندگی میں خدیج بخاری کی آمد نے گویا خوشگوار سی ہلچل مچا دی تھی، ننھے خدیج کی قلقاریوں سے ہر وقت "سید محل" گونجتا رہتا تھا کہ یکدم فضا مکدر سی ہو گئی اریج بخاری کی خواہش نے سید محل میں سرد سی فضا پیدا کر دی تھی کیونکہ اریج اپنی پھپھی زاد سے منسوب تھے لیکن وہ اپنی کلاس فیلو الوینا شاہ سے شادی کرنا چاہتے تھے جو پنجابی فیملی سے تعلق رکھتی تھی اس لئے اریج بخاری کی شادی کے سب سے بڑے مخالف تھے مگر اریج بخاری نے کسی کی بھی مخالفت کی پرواہ نہ کی اور الوینا شاہ سے کورٹ میرج کر لی لیکن جس دن وہ الوینا شاہ کو الوینا بخاری بنا کر سید محل میں لے کر آئے، سید محل پر ایک طوفان ٹوٹا ہوا تھا، معارج بخاری بلوچستان کے دو قبیلوں کی آپسی جنگ کی اندھی گولی کا شکار ہو کر چہیتی بیوی اور دو سالہ خدیج بخاری کو یتیمی کا دکھ دیتے دنیا سے چلے گئے تھے، بڑے بیٹے کی موت کا صدمہ ایسا تھا کہ عارج بخاری کو جیتے جی مار گیا تھا اور معارج بخاری کا جانا ایسا صدمہ تھا کہ زندگی کا ہر سکھ اور دکھ اس کے آگے کچھ بھی نہ تھا اس لئے الوینا بخاری کو نہ اچھا کہا گیا اور نہ ہی برا اور انہیں بہت خاموشی سے قبول کر لیا گیا لیکن آزاد ماحول کی پروردہ الوینا چند ماہ میں ہی گھبرا گئیں اور انہوں نے کراچی جہاں ان کا میکہ تھا وہاں جا کر رہنے کی فرمائش کر دی، جو اریج بخاری نے رد کر دی کیونکہ وہ اپنے باپ کو مزید دکھی نہیں کر سکتے تھے، ایسے میں الوینا کے جذبات سرد پڑنے لگے اور ان کے اور اریج بخاری کے درمیان کے جھگڑے روز کا معمول بن گئے، عارج بخاری ایک بیٹا موت کے ہاتھوں کھو چکے تھے دوسرے کی جدائی برداشت نہیں کر سکتے تھے وہ بیمار رہنے لگے تھے اور اسی سرد ماحول میں انہوں نے بیٹے کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اپنی ایک خواہش کا اظہار کر دیا اور وہ جو اپنی ذات سے اپنے باپ کو پہلے ہی بہت تکلیف پہنچا چکے تھے مزید حوصلہ نہ ہوا اور انہوں نے باپ کے جڑے ہاتھوں کی عزت رکھ لی جبکہ ایسا کرتے ہوئے نہ دماغ راضی تھا اور نہ دل اور جب الوینا کو اریج بخاری اور خدیجہ بخاری کے نکاح کا علم ہوا تھا انہوں نے زمین آسمان ایک کر ڈالے تھے ان کا اور اریج بخاری کا زبردست قسم کا جھگڑا ہوا تھا اور

وہ لڑ جھگڑ کر میکے سدھار گئی تھیں اور اریج بخاری
کی لاکھ منتوں محبت سے مجبور کرنے کے باوجود وہ
لوٹ کر نہیں آئی تھیں، خدیجہ کے لئے شوہر کی
موت کا صدمہ جھیلنا ہی مشکل تھا کہ عارج بخاری
کے مجبور کرنے پر وہ اریج بخاری سے شادی کر گئی
تھیں، لیکن جب الوینا انہیں چھوڑ گئیں تو وہ بے
سکون ہو کر رہ گئی تھیں، اریج بخاری کی خاموشی
ان کی اداس صورت انہیں بے چین کرتی تھی اور
وہ ان کے غم میں گھلتے گھلتے کینسر جیسے موذی مرض
میں مبتلا ہو کر سات سالہ خدیج بخاری کو روتا چھوڑ
کر دنیا سے چلی گئی تھیں، خدیجہ بخاری کی موت
کے بعد وہ الوینا بخاری کو واپس لانے کی کوشش
میں لگ گئے تھے اور انہوں نے واپسی کی ایک
شرط رکھ دی تھی جسے انہوں نے مان لیا تھا کہ وہ
ایک کے بعد ایک اپنے کی موت کے صدمے
سے دوچار اب کسی کو کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتے
تھے اسی لئے وہ بیوی کی بات مان کر ہمیشہ کے
لئے کراچی شفٹ ہو گئے تھے، خدیج ان کی
نظروں میں بری طرح کھٹکتا تھا وہ اس سے بہت
بری طرح پیش آتی تھیں، ماں سے دوری کے بعد
چاچی کا اتنا برا رویہ اس کے دل کو چھوٹ لگاتا اس
کی شخصیت کو مسخ کرتا جا رہا تھا اور یونہی تین سال
گزر گئے تھے مگر وہ تا حال اولاد کی نعمت سے محروم
تھے اور یہی محرومی دھیرے دھیرے الوینا بخاری
کے دل میں خدیج بخاری کے لئے محبت جگا گی،
چاچی کا اپنائیت بھرا رویہ پا کر خدیج بخاری خوش
رہنے لگا تھا اور اس کی سترہویں سالگرہ ہر سال کی
طرح بہت دھوم دھام سے منائی گئی تھی اور شادی
کے پندرہویں سال ان کا رب ان پر مہربان ہو
گیا تھا، مارے خوشی اور احساس تشکر کے ان کے
قدم ہی زمین پر نہیں ٹکتے تھے، خوشی کی خبر پا کر
اریج بخاری بھی بے حد مطمئن و خوش تھے اور جس
دن وہ بیٹی کے باپ بنے مارے تشکر کے سجدے
میں جا گرے تھے، ننھی ہوینا ان سب کی آنکھوں
کا تارا بن گئی تھی، گلابی گالوں والی بے حد پیاری
سی ہوینا کے ساتھ کھیلنا خدیج بخاری کو بے حد اچھا
لگتا تھا اور جیسے جیسے ہوینا بڑی ہو رہی تھی اس کے
ساتھ اٹیچ ہوتی جا رہی تھی، جس سال انہوں نے
فیشن ڈیزائنگ میں ماسٹرز کیا تھا اسی سال ہوینا
کی اسکولنگ اسٹارٹ ہوئی تھی، خدیج بخاری کے
شوق کو دیکھتے ہوئے اریج بخاری نے انہیں ایک
بوتیک بنوا دی تھی اور ان کے عملی زندگی میں قدم
رکھتے ہی الوینا بخاری چاہتی تھیں کہ ان کی شادی
کر دیں مگر وہ بڑی سہولت سے انہیں ٹال رہے
تھے کیونکہ الوینا بخاری ان کی شادی اپنی بہن کی
بیٹی سے کرنا چاہتی تھیں جبکہ وہ خود اپنی یونیورسٹی
فیلو سے محبت کرتے تھے مگر وہ فی الوقت یہ چاچی کو
نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ شمسہ کے جنون سے
واقف تھے کہ وہ ڈاکٹر بننا چاہتی ہے اور یہ اس
کے میڈیکل کا آخری سال ہے اسی لئے وہ شمسہ
کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد چاچی سے بات کرنا
چاہتے تھے لیکن رب کو کچھ اور ہی منظور تھا ہوینا
کی گیارہویں سالگرہ کی شام انجوائے کر کے وہ
لوگ گھر واپس آ رہے تھے کہ ان کی کار کا
ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا وہ اپنی بائیک پر آ رہے تھے
جبکہ ہوینا حادثہ میں معجزاتی طور پر محفوظ رہی تھی
اور وہ دونوں میاں بیوی زندگی کی بازی ہار گئے
تھے، الوینا بخاری تو موقع پر ہی دم توڑ گئی تھیں اور
وہ بھتیجے سے ملنے اسے بیٹی کی ذمہ داری سونپنے
تک زندہ رہے تھے، یہ حادثہ ایسا تھا کہ وہ سنبھل
نہیں پا رہے تھے کہ دعاؤں کا آخری سایہ بھی ان
کے سر سے اٹھ گیا تھا اور ہوینا کا تو بہت ہی برا
حال تھا وہ حادثہ سے خوفزدہ تھی اور ماں باپ کی
جدائی سے اذیت و تکلیف سے گزر رہی تھی اور وہ

ہو پانا کے لئے خود کو سنبھال گئے تھے اور اس میں پرانی ملازمہ اماں بی نے ان کا بہت ساتھ دیا تھا، والدین کی وفات کے وقت وہ آٹھویں جماعت میں تھی دو سال کیسے گزرے پتہ ہی نہیں چلا تھا اور اس نے میٹرک کرلیا تھا اس نے میٹرک بورڈ میں تیسری پوزیشن لی تھی وہ عرصہ بعد بہت خوش تھی اور خوشی خدیجہ سے بانٹنا چاہتی تھی اس لئے وہ دوپہر سے ان کی منتظر تھی مگر رات کے بارہ بجے بھی وہ گھر نہیں آئے تھے وہ ان کا انتظار کرتی سو گئی تھی اور اگلے دن جب شکوہ کیا تھا اور اپنی خوشی ان سے کہی تھی تو وہ اس کے شکوے کی پرواہ کیے بغیر اس کی خوشی محسوس کیے بنا، گہری سنجیدگی سے مبارکباد دیتے گھر سے چلے گئے تھے اس دن وہ بہت روئی تھی کہ اس نے اب تک خدیجہ بخاری کا نرم محبت لٹاتا لہجہ اور رویہ ہی دیکھا تھا پھر وقت نے ان کی ساری نرمی چھین لی تھی وہ نہیں جانتی تھی ایسا کیوں ہوا تھا نرم چھاؤں سے خدیجہ بخاری اس کے لئے چھاؤں ہو کر بھی بہت غیر اجنبی سے ہو گئے تھے اور اس کے بہت رونے منع کرنے کے باوجود بھی اسے ہاسٹل شفٹ کر دیا تھا، جہاں سے وہ ہر ویک اینڈ پر آیا کرتی تھی بی ایس سی پارٹ ون کے ایگزامز دے کر فارغ تھی اس لئے وہ ''سید ہاؤس'' آئی ہوئی تھی اور اماں بی آج کل اسے گھر داری سکھا رہی تھیں ہوسٹل میں اس کی دوستی شینا نامی لڑکی سے ہو گئی تھی، شینا نے اس سے دوستی اس کی خوبصورتی دیکھ کر کی تھی اور اس کی بیوقوفی اور سادگی نوٹ کرنے کے بعد اس کی برین واشنگ کرنے لگی تھی اور اس کی برین واشنگ کا ہی اثر تھا کہ اس نے خدیجہ بخاری سے شینا کی برتھ ڈے پارٹی میں جانے کی فرمائش کر ڈالی تھی اور جو ان کے انکار پر ضد میں ڈھلتی اس نے کافی بدتمیزی بھی کروا گئی تھی، اس کے اور

اماں بی کے احساس دلانے پر انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا اور چاچا، چاچی کی موت کے تقریباً سات سال بعد وہ پہلی دفعہ اسے اپنے ساتھ شاپنگ سینٹر لے گئے تھے وگرنہ ان کی موت کے بعد وہ کالج کے علاوہ کہیں نہیں گئی تھی اور آج جس طرح اس نے ان سے سوری کر کے شکوہ کیا تھا وہ اپنے دل وضمیر پر بوجھ محسوس کرنے لگے تھے۔

''شمسہ! ہم آپ کو کبھی معاف نہیں کریں گے، آپ نے ہماری اچھی بھلی زندگی تباہ کر ڈالی، ہمارے سارے رشتے بے رحم موت نے ہم سے چھین لئے تھے اور جو واحد رشتہ رہ گیا تھا وہ آپ نے اپنی تنگ دلی اور شک کی آگ میں جلتے ہوئے ہم سے چھین لیا، آپ بہت بری ہیں شمسہ، ہم آپ کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔'' وہ ماضی سے نکلتے کافی دیر خلاؤں میں گھورتے رہے تھے کہ کافی سے ہی وابستہ دل سے جڑے رشتے سے مخاطب ہو کر بولے تھے کہ کچھ بھی تھا، وہ کتنی ہی تکلیف میں تھے مگر اسے اس کی تمام بے رخی اور بدتمیزی کے باوجود بھول نہیں سکے تھے کہ دل میں آنے کے ہزار راستے ہوتے ہیں مگر دل میں آ جانے والے کو دل سے نکالنے کے لئے ایک بھی دروازہ نہیں ہوتا کہ محبت کی محبت، ایسا کوئی دروازہ کھولنے نہیں دیتی جو محبت سے دور کر دے، اسی لئے وہ بھی بند دروازوں سے ٹکراتے، دل کی ٹیسوں کو دل ہی میں دباتے زندگی گزار رہے تھے کہ نہ اسے دل سے نکال پا رہے تھے نہ ہی کسی اور کو دل کی حکمرانی سونپ رہے تھے اسی لئے ان کی زندگی جمود کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

''شینا! ہم آپ کی سالگرہ میں نہیں آ سکتے۔'' وہ قدرے شرمندگی سے بولی تھی جبکہ وہ

اس کی بات سن کر غصہ سے بھڑک اٹھی تھی مگر ہائے ری مجبوری وہ اسے دل ہی دل میں ہزار صلواتیں سناتی نہایت نرمی سے استفسار کرنے لگی تھی۔

''لیکن کیوں ونی! کل تو تم نے کہا تھا کہ تم آؤ گی؟'' وہ ضبط کے باوجود سرخ پڑ گئی تھی کہ ہوینا سامنے ہوتی تو وہ آج اسے کچا ہی چبا ڈالتی۔

''ہاں ہم نے کہا تھا بٹ شینا، یہ سب خدیج بخاری کو پسند نہیں ہے اور ہم وہ کام بہت چاہت کے باوجود بھی نہیں کر سکتے جس میں ہماری فیملی کی خوشی و رضا شامل نہ ہو۔'' وہ اپنی ازلی معصومیت سے بولی تھی۔

''فیملی واٹ فیملی ونی؟ وہ خدیج بخاری وہ محض تمہارا کزن ہے، تمہارا شوہر نہیں ہے جو تم اسے دھڑلے سے اپنی فیملی کہہ رہی ہو۔'' وہ مصلحت بالائے طاق رکھتی چبا چبا کر بولی تھی اور وہ تو ساکت رہ گئی تھی۔

''اور جب وہ کہیں آنے جانے سے قبل تم سے نہیں پوچھتا تو کس رشتے وحق سے تو تم نے خود کو محض ایک کزن کی مرضی و پسند کا پابند کر لیا ہے؟'' وہ اس کی خاموشی محسوس کر کے مزید کہتی چلی گئی تھی۔

''خدیج محض ہمارے کزن ہیں ہیں کہ وہیں تو واحد ہمارا خونی رشتہ، ہمارا سہارا ہیں۔'' اس سے کبھی اس طرح کسی نے کچھ نہ کہا تھا اس لئے وہ عجیب سی الجھن میں گھر چلی تھی اس کی آنکھوں میں آنسو مچلنے لگے تھے اور وہ بمشکل بھیگے لہجے میں بولی تھی۔

''مگر ان سے تمہارا کوئی شرعی رشتہ نہیں ہے، میرے کزن صفدر سے تو تم نے دوستی سے صاف انکار کر دیا تھا یہ کہہ کر کہ تم غیر مردوں سے دوستی نہیں کرتیں تو خدیج بخاری سے اپنے رشتے کو تم کیا نام دو گی کہ ایک طویل مدت سے تم ایک نامحرم کے ساتھ رہ رہی ہو، اب ان سے تمہارے رشتے کی نوعیت کیا ہے یہ تو تم اور وہ تمہارا لاڈلا خدیج ہی بہتر جانتا ہوگا۔'' وہ اپنی سطحی سوچ بیان کر رہی گئی تھی جبکہ وہ اس کی اتنی گھٹیا گفتگو پر باقاعدہ کانپنے لگی تھی، سیل فون اس کے ہاتھ میں لرز اٹھا تھا وہ خود کو ہوا میں معلق تصور کرنے لگی تھی جبکہ اس کی خاموشی سے اسے گویا شہہ مل گئی تھی مزید بکواس کرنے کی اس لئے وہ جو منہ میں آ رہا تھا کہتی جا رہی تھی۔

''تم خوبصورت ہو، جوان ہو تمہیں دیکھ کر تو بڑے بڑے عابد و زاہد بہک سکتے ہیں اس زندہ مثال تو خود میرا کزن صفدر ہے جو تمہاری ایک جھلک پر مرمٹا تھا اور جس کے کہنے پر بھی میں نے تم جیسی اٹھارہویں صدی کی لڑکی سے راہ و رسم بڑھائے تھے، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ تمہارے حسن کا جادو خدیج بخاری پر نہ چلا ہو؟ اور ایسے ہی تو تم اس کی ہر بات پر لبیک نہیں کہتیں یہ کرامات تو کسی خواہشات کا ہی پیش خیمہ لگتی ہیں؟'' وہ تنفر سے کہہ رہی تھی۔

''بکواس بند کیجئے اپنی۔'' وہ یکدم ہی حلق کے بل چیخ اٹھی تھی۔

''حقیقت پر تم پردہ نہیں ڈال سکتی ہو ہوینا بخاری اور اپنے خدیج سے ذرا فرصت ملے تو کرنا مجھ سے رابطہ کہ ایک صفدر ہی نہیں، بہت سے مرد تمہارے حسن کو خراج پیش کرنے کو دل و جان سے تیار ہو جائیں گے اور صفدر تو تمہیں کچھ گھنٹوں کی منہ مانگی قیمت ادا کر دے گا، بس ذرا اپنے خدیج سے ذرا سی بے وفائی کرنی پڑے گی۔'' اس نے کمینگی و عامیانہ پن کی بھی حد کراس کر دی تھی۔

''شٹ اپ شینا! ہمیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ آپ ہمارے بارے میں اس طرح سوچتی ہیں آپ کو اتنی گھٹیا گفتگو کرتے شرم آنی چاہیے۔'' وہ باقاعدہ کانپتی روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''بھئی مجھے تو یہ بھی پتہ کہ شرم کس چڑیا کا نام ہے؟ تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں ایک کال گرل ہوں اور تم میں مجھے نہیں وہ صفدر حیات کو انٹرسٹ ہے اور اس کے ہی کہنے پر میں نے تم سے دوستی کی کہ صفدر میرا کزن نہیں ہے میں اس کی منظور نظر ضرور ہوں اور اس کا نگاہ انتخاب جب تم پر ٹھہرا تو مجھے غصہ بھی آیا تھا حسد بھی محسوس ہوئی تھی مگر صفدر نے نوٹوں کی گڈیاں دے کر غصہ و حسد کو بھسم کر ڈالا۔'' اس نے آج ہر حقیقت عیاں کر ڈالی تھی اپنی سوچ سے، اپنے عزائم تک اور اس نے بے ساختہ منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا کہ صدمے و بے یقینی سے اس کا برا حال تھا۔

''مگر میں تم پر اپنا بہت وقت برباد کر چکی میں صفدر کو تمہارا موبائل نمبر دے دوں گی، پھر وہ جانے اور تم۔'' وہ اب اکتائے ہوئے انداز میں بولی تھی۔

''ہرگز نہیں، آپ کسی کو بھی ہمارا نمبر نہیں دیں گی۔'' وہ تڑپ کر چیخی تھی۔

''مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے، اللہ حافظ۔'' اس نے بکواس کر کے فون بند کر دیا تھا اور وہ سن سی بیٹھی رہ گئی تھی کہ اسی وقت اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تھی، اس نے اٹھ کر روم لاکڈ کر دیا تھا کہ وہ خدیج بخاری کی مخصوص دستک پہچان گئی تھی اسی لئے اب دروازے سے ٹیک لگائے بری طرح سسکنے لگی تھی کہ شینا کی باتیں اس کے کانوں میں گونجتیں اسے بے چین کر رہی تھیں۔

''ونی! دروازہ کھولیے، ہمیں بتائیے کیا ہوا ہے؟'' وہ جو دستک دینے کے بعد دروازہ کھلنے کے منتظر تھے اس کے رونے کی آواز سن کر متفکر سے بلند آواز میں کہہ گئے تھے۔

''آپ ہمارے کچھ نہیں لگتے خدیج! آپ سے ہمارا کوئی شرعی رشتہ نہ ہونا ہمیں ذلت و رسوائی کے پاتال میں دھکیل گیا ہے۔'' اس کی ہچکیاں بندھنے لگی تھیں اور شینا کے ذلت میں ڈوبے لفظ تیر کی طرح چبھنے لگے تھے۔

''ہم اب آپ کا کبھی سامنا نہیں کر پائیں گے، کبھی بھی نہیں خدیج، کہ شینا نے ہمارے رشتے، ہمارے کردار پر انگلی اٹھا کر ہمیں جیتے جی مار ڈالا ہے۔'' وہ متفکر سے دروازہ پیٹ رہے تھے، پریشانی سے اسے پکار رہے تھے اور وہ بلک بلک کر روتی خود سے کہے جا رہی تھی۔

''آپ دروازہ کھولیں ونی، ورنہ ہم دروازہ توڑ دیں گے۔'' تفکر پر جیسے ہی اشتعال غالب آیا وہ چیخ پڑے تھے اور ان کی بات سن وہ زمین سے اٹھی، اس کے ذہن میں یکدم ہی منفی سوچ ابھری تھی اور سوچ کے ابھرتے ہی اس کی نگاہ متلاشی انداز میں چکرانے لگی تھی کہ اسے روم فریج کے اوپر رکھی باسکٹ میں چھری نظر آ گئی تھی اور اس نے لپک کر جیسے اپنے قبضے میں لیا تھا اور آؤ دیکھا تھا نہ تاؤ، دائیں کلائی کی رگ بے دردی سے کاٹ ڈالی تھی۔

''آپ دروازہ توڑ دیں خدیج بابا کہ اب تو ان کے رونے کی آواز بھی نہیں آ رہی؟ مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے، اس طرح تو ونی بیٹا کبھی نہیں کرتیں۔'' اماں بی بھی چلی آئیں تھیں مگر ان کی بھی ہر کوشش اکارت گئی تھی اور آواز آنا بند ہوئی تھی تو وہ دونوں ہی نہ جانے کیوں بہت بے چین ہو گئے تھے اور جس وقت وہ دروازہ توڑ کر کمرے

میں داخل ہونے میں کامیاب ہوئے تھے گرے کارپٹ لہورنگ ہو رہا تھا وہ دونوں ہی دیوانہ وار اس پر جھکے تھے، خدیجہ بخاری نے اس کے آنسوؤں سے تر زرد چہرے کو دیکھتے ہوئے دل کی دھڑکن چیک کی تھی اور رفتار معمول سے کم ہونے کے باوجود کسی امید کے تحت اسے بانہوں میں اٹھائے ہاسپٹل کی جانب دوڑ گئے تھے اور اس کے بچپن کے حدود سے نکلنے کے بعد پہلی دفعہ تھا کہ انہوں نے اسے چھوا تھا کہ وگرنہ جب اس نے بچپن کو خیر باد کہہ کر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا وہ نہ اسے نظر بھر کر دیکھتے تھے اور نہ ہی دعا تک کے لئے اس کے سر پر دست شفقت رکھتے تھے کہ وہ اتنے ہی محتاط پسند تھے مگر ان کی تمام محتاط پسندی، اچھی و نیک تربیت و فطرت سب بے کار گئی تھی کہ برائی دیکھنے والی آنکھ نے برائی دیکھے بنا بھی مفروضوں کی بنیاد پر برائی نہ صرف دیکھی تھی بلکہ اس کا یوں کھلا اظہار کیا تھا کہ وہ خودکشی جیسے حرام فعل کی مرتکب ہوئے لمحہ بھر کو بھی کانپی تک نہ تھی جبکہ وہ تو اس کے اس اقدام کو لے کر مضطرب ہو گئے تھے، بے چینی سے آئی سی یو کے باہر ٹہل رہے تھے کہ آئی سی یو کا دروازہ کھلا تھا اور وہ بڑی بے قراری عجلت میں آگے بڑھے تھے کہ اپنے پورے وجود کے ساتھ ڈھے گئے تھے کہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کئی برس بعد اس دشمن جاں سے یوں سامنا ہوگا، ان کو دیکھ ساکت تو وہ بھی رہ گئی تھی مگر ان کی نسبت بڑی پھرتی سے خود کو کمپوزڈ کر گئی تھی جبکہ وہ اسے یک ٹک دیکھ رہے تھے ان کی آنکھوں میں یکدم وہی بے قراری چاہت ڈیرا جما چکی تھی جو اس کے لئے مخصوص تھی۔

''آپ کی پیشنٹ اب خطرے سے باہر ہیں، انہیں کچھ ہی دیر میں پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا جائے گا۔'' لحظہ بھر کو اس کا دل دھڑکا تھا مگر وہ دل کی آواز کو پہلے کی طرح نظر انداز کرتی پیشہ ورانہ سنجیدگی سے کہتی نکلتی چلی گئی تھی اور وہ ساکت کھڑے رہ گئے تھے، نہ اس کے پیچھے جا سکے تھے اور نہ ہی ونی کے لئے آگے بڑھ سکے تھے۔

☆☆☆

''ہمیں کیوں بچایا؟ ہمیں نہیں جینا، ہمیں مر جانے دیا ہوتا۔'' وہ اماں بی کو دیکھ کر سسکی تھی۔

''کیا ہو گیا ہے ونی بیٹا آپ کو، کیوں کر رہی ہو ایسی باتیں؟ جانتی ہو ناں آپ کہ خودکشی حرام ہے تو پھر کیوں مرنے جا رہی تھیں حرام موت۔'' وہ بھیگی پلکوں سے اس کے متورم زرد چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔

''ہم کچھ نہیں جانتے، ہمیں بس اتنا پتہ ہے کہ ہمیں نہیں جینا، ہم مر جانا چاہتے ہیں۔'' اس کے رونے میں شدت آ گئی تھی۔

''بکواس بند کیجئے اپنی۔'' خاموش تماشائی بنے خدیجہ بخاری پھنکارے تھے اور ان کی موجودگی سے لاعلم، ان کے سامنے اسے خائف وہ خود اذیتی سے لب چبانے لگی تھی۔

''ایسا کون سا طوفان آ کر گزر گیا جو آپ حرام موت مرنے چلی تھیں۔'' وہ اس کو ہاسپٹل لانے تک اور اس کی زندگی کی دعا کرتے جس اذیت و تکلیف سے گزرے تھے وہی اس پر ظاہر ہوئی تھی جو وہ یوں اس پر چیخ اٹھے تھے۔

''ہم نے جائز و حلال زندگی ہی کب گزاری ہے جو مرنے کا جائز اہتمام کریں، ایسی زندگی سے تو حرام موت ہی بہتر ہے۔'' وہ خود اذیتی کی انتہا کو چھوتی لرزتے لہجے میں بولی تھی ان دونوں کے ہی اضطراب میں اضافہ کر گئی تھی۔

''ونی! پلیز بتائیے ہمیں آپ کیوں اتنی

ڈسٹرب اور ڈس ہارٹ ہیں۔'' وہ اس کے لفظوں پر بے چین ضرور ہوئے تھے مگر اس کی دگرگوں حالت دیکھ کر خود کو کمپوز ڈ کرتے اسٹول کھینچ کر اس پر بیٹھے تھے اور نہایت شفقت سے پوچھا تھا۔

''آپ ہمارے لئے کیوں کس حق اور رشتے سے پریشان ہو رہے ہیں؟ چلے جایئے یہاں سے۔'' وہ جتنی نرمی و شفقت سے بولے تھے وہ اسی قدر بھڑک کر چیخی تھی۔

''بی ہیو یور سیلف، یہ گھر نہیں ہاسپٹل ہے، ہم یہاں کوئی تماشہ نہیں لگانا چاہتے۔'' وہ اس کے انداز پر دبے دبے غصہ سے بولے تھے۔

''آپ کس تماشے سے بچنا چاہتے ہیں، ہم تماشہ بن چکے ہیں، ہمارے پاکدامن پر شفاف کردار پر کیچڑ اچھالی گئی اور ہم چپ رہے کہ ہمارے پاس اپنی صفائی میں کہنے کو ایک لفظ نہیں تھا۔'' وہ کمزوری کے باوجود اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور چہرہ ہاتھوں میں چھپائے بری طرح بلک رہی تھی، اس کے ہاتھ میں لگی ڈرپ کے لئے لگیں نیڈلز نکل گئی تھیں اور خون رسنے لگا تھا۔

''ونی گڑیا! ہم آپ کی غیر مبہم لایعنی باتیں نہیں سمجھ پا رہے، آپ کو کس نے کیا کہا ہے ہمیں بتایئے پلیز۔'' وہ اس کی باتوں سے ہی نہیں اس کے بلکنے پر بھی تڑپ اٹھے تھے اور نہایت نرمی سے شفقت بھرے پچکارنے والے انداز میں استفسار کرتے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ گئے تھے اور گویا ایسا کر کے انہوں نے قیامت کو آواز دے ڈالی تھی۔

''مت چھوئیں ہمیں، دور ہو جائیں ہم سے، ہمارا آپ سے کوئی رشتہ نہیں ہے، آپ ہمارے محرم نہیں ہیں، نہ آپ ہمارے باپ ہیں نہ ہمارے شوہر، تو پھر کس حق سے آپ نے ہمیں چھوا؟'' وہ ان کا ہاتھ اپنے کاندھے سے بے دردی سے جھٹکتی ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی اور کب سے ضبط کرتے اشتعال کو دباتے خدیج بخاری اپنا ضبط کھو بیٹھے تھے اور اس پر ہاتھ اٹھا لیا تھا۔

''زبان سے ایک لفظ مزید نکالا تو ہم آپ کو جان سے مار دیں گے۔'' خونخوار لہجے میں کہتے نکلتے چلے گئے تھے جبکہ وہ گال پر ہاتھ رکھے مزید بلکنے لگی تھی اس کے چیک اپ کے ارادے سے آئیں ڈاکٹر شمسہ واپس پلٹ گئی تھیں کہ ان کا دل جلنے لگا تھا اور دماغ سلگ اٹھا تھا جبکہ حیران پریشان سی اماں بی روتے ہوئے اسے چپ کرانے کی ناکام کوشش کرنے لگی تھیں۔

☆☆☆

''اماں بی! ونی کو دیکھنے آج شام کچھ لوگ آئیں گے، آپ تیاری کر لیجئے گا۔'' وہ ناشتہ کرتے ہوئے کہتے اماں بی کو ساکت کر گئے تھے۔

''خدیج بابا! ابھی بٹیا مکمل صحت یاب نہیں ہوئی ہیں، یہ وقت اس مسئلہ کو اٹھانے کا نہیں ہے کہ آپ ان کی ذہنی حالت سے بھی واقف ہی ہیں۔'' وہ کہے بغیر نہیں رہی تھیں۔

''سب جانتے ہیں اماں بی اور جو نہیں جانتے وہ بتانے کو راضی نہیں ہیں مگر ہم نہ بچے ہیں نہ ہی کوئی کم عقل انسان ہیں، ان کے رد یے و باتوں سے جتنا سمجھ پائے ہیں اسی کی روشنی میں یہ قدم اٹھا رہے ہیں کہ ہم جلد از جلد اپنے فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتے ہیں۔'' وہ بہت ٹھہرے ہوئے انداز میں بولے تھے کہ چاہے اس نے کچھ واضح انداز میں نہیں کہا تھا مگر وہ جتنا سمجھ پائے تھے اس کا لب لباب یہی تھا کہ وہ ان سے کوئی شرعی رشتہ نہ ہونے کے سبب پریشان ہے اور وہ اس سے شرعی رشتہ جوڑ بھی نہیں سکتے

تھے اس لئے اس کی ذمہ داری سے آزاد ہو جانا چاہتے تھے۔

''ہمیں بھی لگتا ہے کہ کسی نے بٹیا کو آپ کے حوالے سے کچھ غلط کہا ہے اسی لئے ہم چاہتے تھے کہ آپ ونی بٹیا سے نکاح کر لیں۔'' انہوں نے اندازہ ظاہر کر کے اپنا مطالبہ بھی دہرایا تھا۔

''اماں بی! ہم کسی کے الزام کی تردید کے لئے اپنی سوچ کا زاویہ نہیں بدل سکتے کہ ونی ہمارے لئے رشتوں کی پاکیزگی ہیں، ان کے بارے میں ایسا سوچنا بھی ہمارے لئے حرام ہے۔'' وہ ادھ پیا چائے کا کپ رکھتے کھڑے ہو گئے تھے۔

''ونی کے گزشتہ رویے کا سبب کیا ہے نہیں جانتے؟ اگر وہی ہے جو آپ اور ہم سمجھ رہے ہیں اس کے باوجود بھی ہم ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے کہ ہماری نیت کل بھی صاف تھی، آج بھی صاف ہے، بندوں کی عدالت میں چاہے ہم پر کتنی ہی انگلیاں اٹھ جائیں، ہمیں سو کوڑے سر راہ مار لئے جائیں، مگر ہماری سوچ ہمارا عمل اللہ کی عدالت میں کامیاب ٹھہریں گے کہ ہماری اوقات نہیں تھی کہ ہم ونی کی ذمہ داری اٹھانے کے اہل ہو پاتے، مگر جس نے ذمہ داری ڈالی تھی اسی رب نے ہمیں آج تک ہمیں ہمارے عمل میں سرخرو کیا ہے اور آگے بھی کرے گا۔'' وہ بہت سنجیدہ تھے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنا موقف بیان کر گئے تھے۔

''آپ مہمانوں کے لئے انتظام کر لیجئے گا وہ چھ بجے تک آ ئیں گے۔'' وہ وہاں سے نکلتے چلے گئے تھے اور ان کے کہے کے مطابق وہ وقت پر آ گئے تھے، لڑکے کا نام شاغل حمید تھا جو خدیج بخاری کا منیجر تھا اور اس کی نیک فطرت اور دھیما سنجیدہ مزاج دیکھتے ہوئے ہی انہوں نے خود شاغل سے شادی کی نہ صرف بات کی تھی بلکہ اس کے اور اس کی فیملی کے دیکھنے کے لئے ہوینا کی تصویر بھی دی تھی، زرد لمبی قمیض اور چوڑی دار پاجامے میں دوپٹہ سلیقہ سے سر تک اوڑھے (اماں بی نے اس کی تربیت بہت اچھے خطوط پر کی تھی وہ نائنتھ کلاس سے دوپٹہ سر تک لے رہی تھی) تمام تر سادگی میں اپنی کھلتی ہوئی رنگت اور متناسب سراپے کے ساتھ پہلی ہی نگاہ میں شاغل حمید کو پسند آ گئی تھی اور اس نے خدیج بخاری کا دیا پرپوزل اور تصویر والدین تک پہنچا دی تھی، تصویر دیکھ کر تو انکار کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی اور جو طبقاتی فرق تھا اس کا احساس مگر بیٹے کو دلایا ضرور مگر وہ خدیج بخاری کے رکھ رکھاؤ اور عادات کے سبب اس فرق کو بھول گیا تھا اسی لئے اس نے ان کے دیئے پرپوزل پر حامی بھر لی تھی اور اس کی تصویر دیکھ کر تو انکار کی گنجائش ہی نہ رہی تھی اس لئے وہ اپنے والدین کو لے کر خدیج بخاری کے گھر پہنچ گیا تھا اور اس سب میں اللہ کی رضا شامل تھی اس لئے تمام معاملات طے ہوتے چلے گئے تھے انہوں نے محض پندرہ دن بعد کی تاریخ دی تھی اور دن کیسے گزرے وہ جان ہی نہیں سکے تھے اور شادی کا دن آن پہنچا تھا اور انہوں نے اس کی خوشیوں اور سلامتی کی دعا کرتے ہوئے اسے شاغل حمید کے ساتھ بڑی شان و شوکت سے رخصت کر دیا تھا۔

☆☆☆

شاغل حمید پر بے اختیاری کا دور اترا ہوا تھا وہ اسے یک ٹک دیکھ رہا تھا جو مکمل سولہ سنگھار کیے اس کی سیج سجائے بیٹھی تھی اور اس کے ٹکٹکی باندھے دیکھنے پر اس پر گھبراہٹ سوار ہو گئی تھی، پلکیں لرزنے لگیں تھیں، چہرہ لہو چھلکانے لگا تھا، وہ لب دانتوں تلے کچلنے لگی تھی کہ اس نے

مسکراتے ہوئے استحقاق بھرے انداز میں اس کا حنائی چوڑیوں سے بھرا ہاتھ تھام لیا تھا، وہ اس کے لمس پر بے اختیار اسے دیکھنے لگی تھی اور اس کے اسمائل پاس کرنے پر، پر حجاب سی حیا کے ساتھ اپنے اندر ہی سمٹ سی گئی تھی۔

''اوہوں، کیسی ہیں آپ مسز ہونا شاغل؟'' اس نے ہاتھ کھینچا چاہا تھا اس لئے شرارتی انداز میں تنبیہ کی تھی اور مسرور سے انداز میں استفسار کیا تھا۔

''ہم اچھے ہیں۔'' وہ نگاہ جھکائے منمنائی تھی اس کے لہجے میں واضح لرزش تھی جو اس کے لبوں پر اجلی سی مسکان کھلا گئی تھی۔

''آپ کو دیکھنے سے پہلے تک، میں بھی بہت اچھا تھا۔'' اس کا نرم شاہستہ لہجہ شرارت کی چغلی کھا رہا تھا وہ بے اختیار اسے دیکھنے لگی تھی اور اس کے خوبرو چہرے پر بکھری نرم سی دوستانہ مسکراہٹ دیکھ کر اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی تھی۔

''آپ ہماری شادی سے خوش ہیں ہونا؟ آپ کو مجھ سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہوا؟'' گمبھیر لہجے میں استفسار کیا تھا۔

''جج...... جی...... نہیں۔'' اس کی نگاہ خود پر محسوس کرتی وہ گھبرائے سے لہجے میں منمنائی تھی۔

''آپ کو اعتراض کیوں نہیں ہوا؟ کیا میں آپ کو اچھا لگا تھا؟'' اس کا گھبرایا سا معصومانہ انداز اسے شرارت پر مزید اکسا گیا تھا۔

''نن...... نہیں...... تو۔'' اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوا تھا۔

''اوہ...... میں آپ کو اچھا کیوں نہیں لگا تھا؟'' اس کے لبوں پر تبسم نگاہوں میں شرارت تھی جسے محسوس کرتے ہوئے بھی وہ روہانسی ہوگئی تھی۔

''جب آپ ہمارے گھر آئے تھے ہم نے آپ کو غور سے دیکھا ہی نہیں تھا مگر پھر بھی ہمیں شادی پر اعتراض نہیں ہوا کیونکہ آپ کو ہمارے لئے خدیج نے منتخب کیا تھا اور وہ ہمارے لئے کوئی غلط فیصلہ نہیں لے سکتے اور ان پر یقین کے سبب ہم آج آپ کے سامنے موجود ہیں۔'' وہ خود کو کمپوز کرتی دھیمے مگر نرم لہجے میں کہتی چلی گئی تھی۔

''سر نے جب آپ کا پرپوزل میرے سامنے رکھا مجھے حیرانگی ہوئی تھی کہ آپ اور ہمارے اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے اور جب اس فرق کی جانب میں نے اشارہ کیا تو سر نے بڑی خوبصورتی سے اس مسئلے کو ٹال دیا یہ کہہ کر کہ یہ اللہ کی مصلحت ہے وہ چاہے جسے جو عطا کر دے، بس پھر میں نے رضامندی دکھائی اور سر نے آپ کی تصویر مجھ دیکھنے کے لئے دے دی اور میں پہلی نظر میں ہی آپ کے معصوم حسن کا اسیر ہو گیا۔'' وہ بہت نرمی سے تمام تر تفصیل ہی نہیں حکایت دل بھی اس کے گوش گزار کر گیا تھا اس کے چہرے کی سرخی میں حیا کی کچھ اور ملاوٹ ہو گئی تھی اور آنکھیں الگ حیا کے بارے مزید جھکتی چلی گئی تھیں مگر ذہن کے کسی کونے میں یہ بات سرسرانے لگی تھی کہ خدیج بخاری نے آگے بڑھ کر شاغل حمید سے اس کی شادی کی بات کی تھی اور یہ سرسراہٹ اسے بے چین کر رہی تھی کہ کیوں انہوں نے خود سے بات کی؟ وہ مزید بھی کچھ کہہ رہا تھا مگر اس کی توجہ بٹ چکی تھی اور تب ہی شاغل حمید کا سیل فون بڑی شدومد سے بجنے لگا تھا ان فسوں خیز لمحات میں یہ مداخلت اسے سخت بری لگی تھی اس لئے اس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی کہ میسج ٹون سن کر اس نے لامحالہ سائیڈ پر پڑا سیل فون اٹھا لیا تھا۔

''تمہارے ساتھ تو بڑی ناانصافی ہوگئی ہے میرے یار، تمہارے نکاح میں جو لڑکی آئی ہے وہ

خدیج بخاری کی اترن ہے۔'' وہ میسج تھا کوئی قیامت تھی جو اس پر سے گزر گئی تھی، اس کا چہرہ خطرناک حد تک سرخ پڑ چکا تھا اور وہ بیڈ سے اٹھ گیا تھا اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''تمہاری شادی ایک ایسی لڑکی سے ہو گئی ہے جس نے رشتہ تو اپنے کزن خدیج بخاری سے رکھا ہوا تھا مگر دلہن تمہاری بن گئی ہے کہ اس سے خدیج بخاری کا دل بھر گیا تھا تب ہی تو خود آگے بڑھ کر تم سے بات کی اور تم اس کی چکنی چپڑی باتوں اور دولت کی لالچ میں آ گئے، تف ہے تمہاری مردانگی پر جو تم ایک ایسی لڑکی کے ساتھ اپنی گرہستی بنانے جا رہے ہو جو کسی کی اترن ہے۔'' دوسرا میسج اس نے میکانکی انداز میں کھول کر پڑھا تھا مگر اس کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا تھا، ماتھے کی سبز رگیں ابھر آئی تھیں اور اس نے تیسری میسج ٹون پر موبائل ہی دیوار پر دے مارا تھا۔

''اتنا بڑا دھوکہ۔'' وہ جو کچھ دیر قبل اسے پیار سے دیکھتا نرمی سے بات کر رہا تھا اشتعال کی زد پر کھڑا خونخوار نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے بڑبڑایا تھا۔

''تم جو بھی فیصلہ لو بہت سوچ سمجھ کر لینا کہ یہ جو امیر لوگ ہوتے ہیں محض اپنے مفاد کے ہوتے ہیں، اس رشتے کے پیچھے ان کا کیا مفاد ہے، ہم نہیں سمجھ سکتے، بس تم سوچ لو کہ کہیں زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ غلط طے نہ ہو جائے۔'' اس کی بڑبڑاہٹ کے درمیان ہی میں اسے اپنے کانوں میں اپنی ماں کی آواز گونجتی سی محسوس ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں مرچیں سی بھرنے لگیں تھیں، اشتعال کی زد پر آتا وہ اس کی طرف بڑھا تھا اور بازو سے جکڑ کر جارحانہ انداز میں اسے بیڈ سے نیچے گھسیٹ لیا تھا وہ اس افتاد پر انگشت بدنداں رہ گئی تھی، اس کا وجود یوں کھینچے جانے پر لڑکھڑائی تھی مگر وہ اسے اپنے مقابل کھڑا کر چکا تھا۔

''تمہارا خدیج بخاری سے کیا رشتہ ہے؟''

تمام خوش کن احساسات سمندر کی جھاگ کی مانند بیٹھ گئے تھے، وہ قہر آلود نگاہوں سے اس کے حسین چہرے کو دیکھتا تنفر سے پوچھ رہا تھا۔

''چپ رہیں، یا جھوٹ بولا، زندہ زمین میں دفن کر دوں گا۔'' وہ مارنے مرنے پر تلا تھا اور وہ خوف سے کانپنے لگی تھی۔

''ان سے ہمارا کوئی شرعی رشتہ نہیں ہے، وہ ہمارے کزن ہیں، ہمارے لئے عزت و تحفظ کا شجر سایہ دار۔'' وہ خوف کے باوجود اس کو جواب کا منتظر پا کر دھیمے لہجے میں بولی تھی کہ اشتعال کی آخری منزل پر کھڑا شاغل حمید اس پر ہاتھ اٹھا گیا تھا۔

''چٹاخ!''

''عزت کی دہائی تو مجھے کم از کم نہ دینا کہ تحفظ کی آڑ میں تم نے اس شخص کے ساتھ مل کر جو بے حیائی کے کھیل کھیلے ہیں، سب جان گیا ہوں، تمہیں اور اس بے غیرت خدیج بخاری کو کیا لگا تھا کہ سچائی مجھ سے پوشیدہ رہے گی، لیکن نہیں تم دونوں کے سارے کالے کرتوت مجھ پر عیاں ہو گئے ہیں۔'' پھنکارتے ہوئے اسے خود سے دور دھکیل دیا تھا۔

''میں چاہوں تو اتنا بڑا فریب دینے کے جرم میں تمہیں وہ سزا دوں کہ تم کسی کو منہ تک دکھانے کے قابل نہ رہو، مگر حرف تو میری عزت، میری غیرت پر بھی آئے گا اور میں اس خدیج بخاری کی طرح نفس پرست نہیں ہوں کہ حسن دیکھ کر شرعی تقاضے اور خدا کا فرمان ہی فراموش کر ڈالوں کہ ویسے بھی میں کسی کے تھوکے ہوئے کو

چاٹنے والوں میں سے نہیں ہوں، صبح ہوتے ہی یہاں سے دفع ہو جانا، ورنہ کہیں میں اشتعال میں آ کر تمہارے ناپاک خون سے اپنے ہاتھ ہی نہ رنگ بیٹھوں، اس لئے واپس اپنے یار کے پاس چلی جانا۔'' وہ اس کے بے دردی سے دھکیلنے پر منہ کے بل ٹھنڈے فرش پر گری تھی اور اٹھ بھی نہ پائی تھی کہ وہ نفرت سے اسے دھتکارتا ٹھوکر مارتا کمرے سے ہی نکلتا چلا گیا تھا جبکہ کمرے میں وہ بے گناہ و پاکدامن ہوتے ہوئے بھی کسی کی گندی سازش کا شکار ہوتی اپنی بدبختی پر بلک بلک کر رو رہی تھی مگر اس کے بین سننے اور اس کی مدد کو آنے والا کوئی نہ تھا اور وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی معتوب ٹھہرا دی گئی تھی۔

☆☆☆

''ونی!'' وہ جو چائے پیتے ہوئے چڑیوں پر نگاہ جمائے کھڑے مطمئن سے مسکرا رہے تھے، دروازہ کھلنے کی آواز پر ان کی توجہ ہٹ گئی تھی اور کھلے دروازے سے اندر داخل ہوتی اجڑی ہوئی سی ہوینا بخاری کو دیکھ وہ بے تابانہ اس تک آئے تھے ان کی پکار میں دنیا جہاں کی فکر سمٹ گئی تھی جبکہ وہ ان کو خالی نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔

''ونی! آپ اس وقت یہاں کیسے آئی ہیں؟ بتایئے ہمیں۔'' وہ سرخ عروسی جوڑا پہنے ہوئے تھی، میک اپ کے مٹے مٹے نشانات سرخ متورم چہرہ زرتار آنچل کی جگہ اس کے وجود سے لپٹی سیاہ کشمیری شال، وہ دیکھ کر اتنی بری سچوئیشن میں بھی چونک اٹھے تھے، جب ہی کھلے دروازے سے کوئی اندر داخل ہوا تھا اور اسے دیکھ کر تو زمین و آسمان انہیں ایک ہوتے محسوس ہوئے تھے۔

''کل رات ایک سرجری کی وجہ سے مجھے لیٹ نائٹ تک ہاسپٹل میں اسٹے کرنا پڑا تھا اور اذانوں کے وقت جب میں ہاسپٹل سے نکلی تو مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہوینا سے میرا اس طرح ٹکراؤ ہو جائے گا۔'' وہ خود پر سوالیہ نگاہیں محسوس کرتیں کہتی چلی گئی تھیں۔

''یہ لیکن آپ کو ملیں کہاں؟'' وہ جو میکانکی انداز میں اندر کی جانب بڑھنے لگی تھی وہ اس کا بازو جکڑتے اسے روکتے ان سے مخاطب ہوئے تھے۔

''میرے گھر کے نزدیکی اسٹاپ پر یہ اچانک میری گاڑی کے سامنے آ گئی تھیں میں نے بروقت بریک لگا کر انہیں نقصان سے بچا لیا اور انہیں پہچان کر آپ کے پاس لے آئی، یہ تو میں خود نہیں جانتی یہ وہاں کیسے پہنچی تھیں اور اس حال میں خودکشی کیوں کرنا چاہتی تھیں۔'' وہ سنجیدگی سے تفصیل بتا رہی تھیں جب وقت انہوں نے اسے بمشکل اپنی گاڑی میں بیٹھنے پر راضی کیا تھا تب اس کے کاندھے پر جھولتا اس کا زرتار عروسی آنچل اس کے وجود سے گر گیا تھا تب انہوں نے کئی برسوں سے ڈیش بورڈ پر رکھی سیاہ کشمیری شال اٹھا کر اس کے وجود کی زینت بنا دی تھی، کہ جس شام وہ ان سے بدگمان ہو کر ان سے بچھڑیں تھیں اس سے ایک ماہ قبل کی شام بہت حسین تھی جب انہوں نے اسے بڑی خوبصورت رنگ پہنائی تھی اور سیاہ کشمیری شال یہ کہہ کر گفٹ کی تھی کہ یہ ان کی ماں کی ہے جو وہ ان کی جانب سے ان کی بہو کو بطور شگن دے رہے ہیں، انہوں نے جسے مسکرا کر لیا تھا اور ڈیش بورڈ پر رکھ دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ جب عروسی جوڑا پہن کر بابل کی دہلیز عبور کریں گی تب ان کی ماں کی شال کو سر پر دعاؤں کی صورت سجا لیں گی مگر یہ دن آنے سے قبل ہی وہ ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے اور ان میں اتنی ہمت بھی کبھی نہ ہوئی تھی کہ اسے وہاں سے اٹھا کر ہی پھینک دیتی کہ ان

سے بدگمان ہونے کے باوجود کئی برس گزر جانے کے باوجود بھی اس کی انگلی میں ان کے نام کی ہی انگوٹھی سجی تھی جو انہوں نے کسی اور کے نام کی سرخ رداد اوڑھ لینے کے باوجود بھی نہ اتاری تھی۔

''وِنی! خدا کے لئے آج چپ نہ رہنا، ہمیں بتاؤ کیا ہوا ہے؟ شاغل نے آپ سے کیا کہا۔'' وہ اسے شانوں سے تھام کر جھنجھوڑتے ہوئے بولے تھے۔

''شاغل حمید نے ہمیں آپ کی اترن کہہ کر بے دردی سے ٹھکرا دیا۔'' وہ کسی روبوٹ کی طرح بولی تھی اور وہ گویا کرنٹ کھا کر اس کے شانوں سے ہاتھ کھینچتے فاصلے پر ہو گئے تھے۔

''میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی خدیج بخاری، آپ نے محبت کی مجھ سے، مگر رشتہ رکھنا چاہتے ہیں ہوینا بخاری سے، اسی سے تعلق بنانا تھا تو مجھ سے کیوں کی محبت؟ کیوں دکھائے مجھے سپنے اور جب میں آپ سے محبت کرنے لگی ہوں، شادی کرنا چاہتی ہوں تو آپ کہتے ہیں کہ آپ مجھ سے محبت نہیں کرتے تو شادی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، میں نہیں ہوں تو پھر وہی حسین بلا ہوینا ہی آپ کی محبت ہے ناں، جس کے لئے میری محبت جھٹلا رہے ہیں۔'' برسوں پہلے کے کہے ان کے لفظ کانوں میں گونج اٹھے تھے۔

''انہیں ہم پر بھروسہ نہیں ہے، ہماری پاکدامنی پر شک ہے۔'' وہ اب سسکنے لگی تھی اور وہ ماضی سے اس کی آواز کے سبب واپس حال میں لوٹ آئے تھے کہ نگاہ کچھ فاصلے پر تماشائی بنیں ڈاکٹر شمسہ پر اٹھی تھی اور پھر ماضی کانوں میں گونج اٹھا تھا۔

''محبت کو آپ نے محض منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے استعمال کیا، باہر مجھے آپ نے وقت کو رنگین بنانے کا ذریعہ بنایا اور گھر میں تو ہے وہ آپ کی لاڈلی ونی آپ کے وقت کو رنگین و حسین بنانے کو جس کی فکر میں ڈوب کر نہ آپ کو کھانا یاد رہتا ہے، نہ لاکھوں کے نقصان سے فرق پڑتا ہے، جب سے کچھ طے تھا تو میری زندگی کیوں برباد کی؟'' وہ اس پر سے نگاہ ہٹا گئے تھے جس کی آنکھوں میں آج بھی تنفر اور بدگمانی رچی تھی۔

''آپ ہم سے پوچھ رہے تھے ناں کہ ہم نے خودکشی کی کوشش کیوں کی تھی؟ مگر ہم نے محض کوشش نہ کی تھی خدیج، سچ میں ہم مر جانا چاہتے تھے کہ ایسی زندگی کا کیا فائدہ جس میں لوگوں کے طعنے اور اٹھی انگلیاں برداشت کرنی پڑیں، ہماری دوست شینا نے بھی ہم سے یہی کہا تھا۔'' وہ بات جو ایک ماہ قبل نہ بتائی تھی آج وہ کہتی چلی گئی تھی اس کے چہرے پر تمسخر در آیا تھا جبکہ ان کا چہرہ خطرناک حد تک سفید پڑ چکا تھا۔

''شینا کے ہر الزام کو دو سے ضرب دے کر شاغل حمید نے کل رات ہمیں یوں ذلیل کیا ہے کہ ہم آپ سے تو کیا خود سے بھی نظر ملانے کے بھی قابل نہیں رہے۔'' وہ سبز گھاس پر گرتی چلی گئی تھی وہ بلکتے ہوئے شاغل حمید کا ہر الزام اپنے منہ سے بتا رہی تھی اور قطرہ قطرہ زندگی اسے بہتی محسوس ہو رہی تھی۔

''ہم شینا کی باتوں کی وجہ سے ڈسٹرب تھے کبھی بھی شادی کے لئے راضی نہ ہوتے مگر ہم نے آپ کی اور اماں بی کی باتیں سن لی تھیں۔''

''آپ نے اماں بی سے کہا تھا کہ آپ ہم سے رشتے کے معانی نہیں بدل سکتے چاہے کوئی کچھ کہے کیونکہ آپ اپنے عمل سے مطمئن ہیں، آپ کو یقین ہے کہ آپ اللہ کی عدالت میں سرخرو ہوں گے اس لئے بندوں کی عدالت آپ کو اچھا کہے یا برا کہہ کر سنگسار کر ڈالے آپ کو فرق نہیں پڑتا کہ اصل کامیابی اللہ کے آگے سرخرو ہونے

ہیں ہے مگر آپ بھول گئے تھے خدیج کہ اللہ تو بہت مہربان، غفور ورحیم ہے، وہ بندے کی ہر خطا کے باوجود اسے معاف کر کے سرخرو کر دیتا ہے اور بندے اپنی خود ساختہ عدالت میں بنا جرم کے بھی ایسی سزا سناتے ہیں کہ بندہ جیتے جی مر جاتا ہے، جیسے ہم مر گئے ہیں۔''

وہ کل رات سے مستقل رو رہی تھی مگر وہ ایسے طوفان سے گزری تھی کہ آنسو اور گریہ زاری ختم ہونے کے بجائے بڑھتی جا رہی تھی اور اتنی دیر میں پہلی دفعہ ڈاکٹر شمسہ تھرا کر کانپ اٹھی تھیں اور ترحم بھری نگاہوں سے گھٹنوں کے بل بیٹھی اس لڑکی کو دیکھنے لگی تھیں جس سے انہیں بے انتہا نفرت تھی کہ وہی تو انہیں ان کی خوشیوں کی قاتل لگتی تھی۔

''اپنی تمام تر اچھائی اور پاکدامنی کے باوجود ہم خود کو باکردار ثابت نہ کر پائے اور بد کرداری کا طعنہ لئے واپس لوٹ آئے ہیں کہ دنیا سامنے کی چیز دیکھتی ہے اور سامنے آپ اور ہم ہیں، ہمارا غیر شرعی رشتہ ہے، ہمارے ذہن و دل میں ایک دوسرے کے لئے کیا ہے یہ جاننے کی کوئی کوشش نہیں کرتا، سامنے کا منظر دیکھ پورا ڈرامہ تیار کر لیا جس میں ہم و آپ بدکردار ٹھہرے ہیں۔'' وہ بلک رہی تھی جبکہ وہ کسی مجسمے کی مانند ساکت و جامد کھڑے تھے اور اس کی گریہ وزاری ڈاکٹر شمسہ کی آنکھیں نم کرنی لگی تھی۔

''ہم شاغل کو ان کے بے اعتباری کے سبب بتا ہی نہیں پائے کہ آپ کے اور ہمارے درمیان بھائی کی محبت بھی رہی، باپ کی بیتا بھی، بہن کا مان بھی رہا، ماں کی ممتا بھی، بس نہیں رہا کبھی ہمارے درمیان کچھ تو وہ مرد و عورت کے درمیان کی نفس و ہوس نہ رہی۔'' اس کے رونے میں اذیت و تڑپ تھی جو ڈاکٹر شمسہ کو بھی تڑپا گئی تھی اور وہ بت بنے خدیج بخاری کو دیکھنے لگی تھیں کہ جیسے وہ مشاغل حمید کو اپنی بے گناہی کا یقین دلائے بغیر آ گئی تھی یہی تو کچھ برس پہلے انہوں نے بھی کیا تھا، اماں بی بھی وہاں چلی آئی تھیں اور اسے بلکتے دیکھ رہی تھیں جس کی آنکھوں میں انہوں نے اور خدیج بخاری نے آنسو نہیں آنے دیئے تھے فقط ایک رات میں مشاغل حمید نے اسے خون کے آنسو رلایا تھا۔

''ونی! خدا دکھائی نہیں دیتا، محسوس ہوتا ہے اور رشتے محسوسات کا ہی تو نام ہیں، پاکیزگی و پاکدامنی کا تعلق بھی محسوسات سے ہے، جب اللہ کا وجود محسوس ہوتا ہے تو بندے اور اس کا رشتہ استوار ہوتا ہے، حاکم اور غلام کا رشتہ وجود میں آتا ہے، محسوسات کے بغیر حاکم و غلام کا رشتہ وجود میں نہیں آ سکتا باوجود اس کے کہ اللہ ازل سے موجود ہے، بندہ اللہ کو محسوس نہ کر پائے اس سے اللہ کے وجود پر کوئی فرق نہیں پڑتا، اللہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔'' لان میں موت کا سا سناٹا چھا گیا تھا، وہ بول بول کر تھک چکی تھی اور اس سناٹے میں اس کی سسکیاں دراڑیں ڈال رہی تھیں جب وہ بت پاش پاش ہوا تھا اور گھٹنوں کے بل عین اس کے سامنے بیٹھ گئے تھے اور انہوں نے اس کے آنسو صاف کیے تھے اور ٹھہرے ہوئے لہجہ میں کہنا شروع کیا تھا یکدم اس کی سسکیاں تھم گئی تھیں، خاموش فضا میں ان کی آواز رقص کرنے لگی تھی۔

''پاکیزگی و پاکدامنی کا تعلق بھی محسوسات سے ہے، سمندر میں پانی کے کتنے ہی قطرے جمع ہیں اور ہر قطرہ نہ ناپاک ہے اور نہ ہی پاک، ایسے ہی نہ ہر شرعی رشتہ پاک ہے نہ ہی ہر غیر شرعی رشتہ ناپاک ہوتا ہے، لوگ تو شرعی رشتے کی آڑ میں بھی گناہ کرنے سے باز نہیں آتے اور ہم پر تو

اللہ کا کرم ہے کہ ہم کسی رشتے کے نہ ہوتے ہوئے بھی پاکیزہ زندگی گزارتے رہے اور پاکیزگی کا تعلق جب دیکھنے سے ہے ہی نہیں تو ہماری سوچ وعمل کی پاکیزگی کسی کو کیسے نظر آئے گی؟ لوگ تو اللہ کو محسوس کرنے میں ناکام ہوتے ہیں اس کے وجود سے انکاری ہو کر بت تراش کر بیٹھ جاتے ہیں، لوگ جب اللہ کو نہیں بخشتے تو اس حاکم کے غلاموں کو کیسے بخشیں گے؟ کہ اٹھی انگلیاں کب تک اٹھی رہیں گی تھک کر خود ہی جھک جائیں گی، بس اچھائی و نیکی نہیں جھکنی چاہیے، آپ نے جب کچھ غلط کیا ہی نہیں تو کیوں آزردہ ہیں؟ باطل کبھی حق سے جیتا ہے؟ جیت تو حق کی ہوتی ہے ناں، تو بس حق پر قائم رہیے، اللہ راستے خود بنا دے گا، یہ تو آپ کی آزمائش ہے۔'' وہ بہت نرم حلاوت بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

''ہم اس آزمائش کے اہل نہیں ہیں خدیج! ہم لوگوں کی نگاہوں میں نفرت، لبوں پر اپنے لئے انگارے اگلتے دیکھ نہیں سکتے۔'' وہ ان کی بات کے درمیان نم لہجے میں بولی تھی۔

''آپ کو لوگوں کی پرواہ ہے، جن سے آپ کا تعلق، ہر واسطہ کب سانسوں کی ڈور کے ساتھ ٹوٹ جائے آپ کو اندازہ تک نہیں ہے، جبکہ آزمائش تو زندگی دینے والے رب کی جانب سے ہے آپ اور ہم تو خوش نصیب ہیں کہ اللہ نے ہمیں اپنی آزمائش وامتحان کے قابل سمجھا، آپ اتنے سے گھبرا گئیں، آپ بھول گئیں آزمائش تو آپ کی دینی ماں حضرت عائشہؓ کی بھی ہوئی تھی، مگر وہ پاکدامن خاتون تھیں، انہوں نے صرف اللہ سے لو لگائی اور اللہ نے ان کی پاکدامنی کو یوں ثابت کیا کہ ہر اٹھی انگلی ٹوٹ گئی، زبانیں بند ہو گئیں اور نگاہیں جھک گئیں اور آپؓ دنیا و آخرت میں سرخرو ٹھہریں، اگر آپ بھی غلط نہیں ہیں، پاکدامن ہیں تو خود اللہ آپ کی پاکدامنی کے ثبوت کے لئے راہیں نکال دے گا اور تہمت صرف آپ پر نہیں، ہم پر بھی لگی ہے مگر ہم اپنا فیصلہ اپنے اللہ پر چھوڑ چکے ہیں، اب آپ کی مرضی چاہے جو کریں، صبر سے اللہ کی رحمت کا انتظار کریں یا رو رو کر زمین آسمان ایک کرتے ہوئے حرام موت کو گلے سے لگا کر اللہ کی عدالت میں معتوب ٹھہریں۔'' وہ ان کے سامنے سے اٹھے تھے اور نکلتے چلے گئے تھے جبکہ ان کے الفاظ و لہجے میں کوئی سحر تھا جو اسے باندھ گیا تھا اس کے اندر سے صدا آنے لگی تھی کہ وہ صبر کرے گی، اللہ کی رحمت کا انتظار کرے گی کہ اللہ کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں ہے، اس نے آنسو پونچھ لئے تھے اور ڈاکٹر شمسہ اس کے مطمئن ہو جانے والے چہرے کو محض ایک نظر ہی دیکھ پائی تھیں اور شکستگی سی محسوس کرتیں خود کو ان کا مجرم پاتیں، ہارے ہوئے انداز میں دہلیز عبور کر گئی تھیں کہ وہ بہت چاہ کر بھی وہاں اب نہ ٹھہر سکتی تھیں، نہ ہی اپنے کیے کی، اپنی سوچ کی معافی طلب کر سکتی تھیں کہ وہ دونوں ہی اپنا فیصلہ رب پر چھوڑتے انہیں شکستہ چھوڑ گئے تھے۔

☆☆☆

''السلام علیکم!'' چائے پیتے خدیج بخاری نے آواز پر سر اٹھایا تھا اور تین ماہ بعد مشاغل حمید کو سامنے پا کر ان کے چہرے کے عضلات تن سے گئے تھے، جبکہ اماں بی کے ساتھ بیٹھی ہوینا کی رنگت لٹھے کی مانند سفید پڑ گئی تھی۔

''اب یہاں کیا لینے آئے ہو، اسی وقت یہاں سے اپنی مکروہ صورت لے کر دفعان ہو جاؤ۔'' اماں بی غصہ سے پھنکاری تھیں۔

''پلیز اماں بی غصہ نہ کیجیے، مشاغل

ہمارے مہمان ہیں اور ہم گھر آئے مہمان کو بے عزت نہیں کر سکتے۔" مشاغل حمید کی رنگت متغیر ہو گئی تھی مگر وہ کچھ بول نہیں پایا تھا مگر وہ جب بولے تھے اپنے مخصوص نرم ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے تھے اور اسے بیٹھنے کو کہہ دیا تھا، مشاغل حمید ان کے رکھ رکھاؤ اور نرمی پر خود کو بہت چھوٹا محسوس کرنے لگا تھا۔

"ہوینا! مجھے معاف کر دیں۔" اس میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ وہاں سے چلی جاتی اور گزری رات کی اذیت اس کے چہرے سے عیاں ہونے لگی تھی، اس کے آنسو موتیوں کی طرح رخساروں پر لڑھکتے جا رہے تھے کہ وہ اس تک آیا تھا اور اس کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے تھے اس کے اس عمل پر وہ دونوں ششدر رہ گئے تھے جبکہ اس کی سسکیاں کمرے میں گونجنے لگی تھیں۔

"میں نے آپ کے کردار پر انگلی اٹھائی، آپ پر تہمت لگائی، مجھے معاف کر دیں ہوینا۔" اس کا لہجہ بھیگ گیا تھا کہ حالات بعض اوقات انسان کو اس نہج پر لے جاتے ہیں کہ وہ جلد بازی میں ایسا قدم اٹھا لیتا ہے کہ اس کا عمل پچھتاوا بن جاتا ہے جیسے وہ اپنے عمل پر پچھتاتا آج مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔

"شادی کی شب مجھے ایسے میسجز موصول ہوئے کہ میں اپنے سوچنے سمجھنے کی ہر صلاحیت کو ہی فراموش کر گیا۔" وہ اس کے رونے پر مزید پشیمان ہوا تھا اور بھیگے لہجے میں کہتا چلا جا رہا تھا اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ کوئی اس کی بات سننا بھی چاہتا ہے یا نہیں، وہ لب بھینچے کھڑے تھے اور اس کی سسکیاں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بلند ہوتی جا رہی تھیں۔

"اگر میں آپ پر الزامات کی بوچھاڑ کرنے کی بجائے اپنے شک کی تصدیق کر لیتا تو حالات یکسر مختلف ہوتے، نہ آپ اذیت میں ہوتیں اور نہ میں پشیمان ہوتا، مگر میں وہ گھٹیا قسم کے میسجز پڑھ کر آپ سے اور سر سے بدگمان ہو گیا اور آپ کو نفرت سے دھتکار کر اپنے گھر سے نکل جانے کو کہہ دیا اور میں تین ماہ اسی گھمنڈ میں رہا کہ میں نے ایک بدکردار عورت کو اپنے گھر میں نہ بسا کر بہت بڑا کارنامہ سر انجام دیا ہے مگر کل رات مجھ پر منکشف ہوا کہ جھول آپ کے کردار میں نہیں، میری نیت میں تھا، میری جلد بازی کا سارا قصور تھا اور کل ہی میرا سارا گھمنڈ چکنا چور ہو گیا اور مجھے اپنا وجود پاتال میں گرا محسوس ہو رہا ہے کہ میں کیسے اتنا اندھا ہو گیا کہ بغیر کسی ثبوت کے ایک عورت پر تہمت لگائی۔" اس کے لہجے سے یاسیت و پشیمانی عیاں ہو رہی تھی اور وہ اب تک اس کے سامنے ہاتھ جوڑے اور نظر جھکائے کھڑا تھا اور تفصیل بتانے لگا تھا کہ کیسے اس پر تمام حقیقت کھلی، صفدر حیات کا اسی صبح کی شام جب وہ اجز کر لوٹ آئی تھی بہت برا ایکسیڈنٹ ہوا تھا جس میں اس کا پورا جسم مفلوج ہو گیا تھا، اس کی دولت اور اس کی دوستیاں اور رشتے کچھ کام نہیں آ رہا تھا، ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کا ہر رشتہ اس سے دور ہو گیا تھا اور وہ ہاسپٹل کے بیڈ پر کسی ناکارہ شے کی مانند پڑا تھا اور وہ اسی ہسپتال میں تھا جس میں ڈاکٹر شمسہ اپنے فرائض انجام دے رہی تھیں وہ انہی کا پیشنٹ تھا، انہیں ہر گزرتے دن کے ساتھ ہی لگتا تھا کہ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر اس کی حالت میں کسی قسم کا سدھار نہ تھا اور دو ہفتے قبل اس کی حالت بہت بگڑ گئی تھی اور اس کے اشارے سمجھتے ہوئے انہوں نے اسے کاغذ پنسل پکڑائی تھی، جس پر اس نے اپنی تمام تر طاقت لگا کر تین نام درج کر دیئے تھے۔

''ہوینا...... خدیجہ...... مشاغل۔'' وہ ناموں کو دیکھ کر ہی چونک اٹھی تھیں۔
''یہ نام، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' وہ بے قراری سے پوچھ رہی تھیں مگر اس کی حالت بگڑنے لگی تھی اور وہ اس کے معالج ہونے کے باوجود اس کا ٹریٹمنٹ نہیں کر پائی تھیں کہ وہ تو ناموں پر الجھی تھیں۔
''بتاؤ مجھے کیسے جانتے ہو انہیں، کیا کہنا چاہتے ہو؟'' اس کی حالت نظر انداز کیے انہوں نے اس کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے اور اس نے بگڑتی ہوئی حالت کے ساتھ کچھ اشارے کیے تھے جو وہ پریشانی میں محسوس نہیں کر پائی تھیں اور وہ ان کے سوالوں کا جواب دیے بغیر اذیت سے تڑپتے ہوئے معافی کی خواہش دل میں لئے دنیا سے چلا گیا تھا اور وہ مستقل اس کے بارے میں ہی سوچ رہی تھیں اس کے والدین سے بھی ملی تھیں لیکن سب بے سود رہا تھا اور وہ ایک ہفتہ بیمار رہنے کے بعد پھر سے ہاسپٹل آنے لگی تھیں۔
''ڈاکٹر صاحبہ! کیا آپ اس شخص کو جانتی تھیں جو اس کے دیئے اشارے کو سمجھ گئی تھیں کہ ان ناموں کے ذریعے مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔'' نرس کے ذہن میں جو سوال گردش کر رہے تھے وہ پوچھے بغیر نہیں رہی تھی اور وہ یہ نہیں بولی تھیں کہ وہ اس شخص کو نہیں، ان ناموں کو جانتی تھیں۔

''نہیں اور مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا کہ میں یہ جان نہیں پائی کہ آخر وہ کہنا کیا چاہتا تھا؟'' وہ یاسیت سے بولی تھیں۔
''ڈاکٹر صاحبہ! آپ نے شاید اس وقت نوٹ نہیں کیا تھا مگر مجھے لگا تھا جیسے وہ موبائل فون کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔'' نرس کی بات پر وہ چونک اٹھی تھیں۔
''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟'' بے قراری سے بولی تھیں۔
''اس وقت آپ بھول گئی تھیں کہ آپ ڈاکٹر ہیں اور اس مرتے ہوئے شخص کا آپ نے علاج کرنا ہے اسی لئے میں نے ڈاکٹر وارثی کو بلانے کے لئے اپنے سیل فون سے انہیں کال کی تھی، جب میں نے اس کی نگاہیں محسوس کی تھیں اور مجھے یہی لگا تھا جیسے وہ کسی سے بات کرنا چاہتا ہے۔'' نرس آگے بھی کچھ کہہ رہی تھی مگر ان کے کانوں میں سسکتی ہوئی بھیگی آواز گونج اٹھی تھی۔
''مشاغل ہم سے بہت نرمی وعزت سے بات کر رہے تھے کہ ان کے موبائل پر کال اور میسجز آنے لگے اور پھر ان کا ہم سے رویہ بدل گیا، انہوں نے ہمیں نفرت سے دھتکار دیا۔'' نرس اور ہوینا کی باتیں گڈمڈ ہونے لگیں اور انہوں نے دوڑ لگا دی، دیوانوں کی طرح بھاگتے ہوئے پارکنگ تک پہنچی تھیں اور ریش ڈرائیونگ کر کے وہ صفدر حیات کے گھر پر موجود تھیں اس کی والدہ انہیں دیکھ چڑ سی گئیں تھیں کہ پہلے ہی انہوں نے ان کا بہت وقت برباد کیا تھا۔
''صفدر کا سیل فون مجھے نہیں پتہ کہاں ہے؟ آپ پلیز یہاں سے جاؤ، اب آپ نے ہمارے گھر آ کر ہمیں پریشان کیا تو ہم پولیس سے رابطہ کریں گے۔'' انہوں نے چھوٹتے ہی صفدر کے موبائل کا پوچھا تھا تب وہ قدرے غصہ سے بولی تھیں۔

''آپ صرف ایک بار مجھے صفدر کے کمرے میں اس کا موبائل ڈھونڈنے دیں، باخدا اس کے بعد میں آپ لوگوں کو پریشان نہیں کروں گی۔'' انہوں نے باقاعدہ ملتجی انداز میں کہتے ہوئے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے اور انہوں نے

نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں اجازت دے دی تھی، صفدر کا سیل فون اس کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھا ہوا با آسانی مل گیا تھا کیونکہ اللہ نے اس کی بے گناہی اسی طور ثابت کرنی تھی اور جس دن صفدر کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا وہ سیل فون ساتھ نہیں لے گیا تھا کہ ویسے بھی یہ اس کا خفیہ نمبر تھا اسی سے وہ اکثر لڑکیوں کو تنگ کرتا تھا، ڈاکٹر شمسہ نے سب سے پہلے کانٹیکٹ لسٹ اوپن کی تھی مگر انہیں ہوینا کا یا مشاغل کا نمبر نہیں معلوم تھا اس لئے وہ کانٹیکٹ لسٹ میں ان دونوں کے نمبر موجود ہونے کے باوجود پہچان کا مرحلہ طے نہیں کر سکی تھیں اور انہوں نے ڈائل کیے نمبرز اوپن کیے تھے، صفدر نے رات کے ڈھائی بجے کانٹیکٹ لسٹ میں ''رقیب'' کے نام سے محفوظ نمبر پر تین مسڈ بیلز دی تھیں کہ کال ریسیو نہیں کی گئی تھی، انہوں نے ڈیٹیلز کو بغور دیکھا دوبارہ ریڈ کیا تھا اور تاریخ انہیں چونکا گئی تھی کیونکہ سولہ اگست کو وہ خدیج بخاری سے بچھڑی تھیں اس لئے یہ تاریخ انہیں فراموش نہیں ہوتی تھی اور جس صبح انہوں نے اسے بخاری ولاز چھوڑا تھا اس دن سولہ اگست تھی اور آخری کی گئی کال سولہ اگست دو بج کر پینتیس منٹ کی تفصیل ظاہر کر رہی تھی، ان کا ذہن کچھ اور ہی سوچنے لگا تھا وہ اصل بات کی تہہ میں تقریباً اتر گئی تھیں اور کچھ سوچ کر اب انہوں نے میسجز اوپن کیے تھے اور جیسے جیسے ''رقیب'' کے نمبر پر سینڈ کیے میسجز وہ پڑھتی جا رہی تھی ان کے چہرے کی رنگت بھی بدلتی جا رہی تھی، کہ میسجز پر انتہائی گھٹیا الفاظ لکھے گئے تھے ایک کے بعد ایک میسج اوپن کر کے انہوں نے پانچ میسجز پڑھے تھے جبکہ جسے بھیجے گئے تھے اس نے آخر کے دو میسج تو پڑھے ہی نہ تھے کہ تین میسجز ہی اسے بدگمان کر گئے تھے ایک کے بعد ایک میسج اوپن کرتے ہوئے چھٹا میسج انہوں نے اوپن کیا تھا۔

''شینا ڈارلنگ! میں نے جو سوچا تھا وہ انجام بھی دے گیا ہوں کہ جس لڑکی پر صفدر حیات کا نظر انتخاب ٹھہرا تھا وہ اگر صفدر حیات کی بانہوں میں نہیں آ سکتی تو اسے اتنی آسانی سے کسی اور کا بھی بننے نہیں دوں گا کہ میں تو اس کے حسن کے جلوے سوچ سوچ کر بے بسی محسوس کروں اور وہ میرا رقیب جو اسے لے اڑا ہے اس کے ساتھ مزے کرے تو ایسا نہیں ہوگا کہ جو کچھ میں اس کو میسج کے ذریعے کہہ چکا ہوں اس کے بعد بھی عزت سے تو کیا نفرت کے ساتھ بھی اپنے گھر میں بسائے گا تو اس سے بڑا بے غیرت دنیا میں نہ ہوگا۔'' ان کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے کہ وہ بے خیالی میں وہ ٹیکسٹ بھی پڑھ چکی تھیں جو شینا کو کیا گیا تھا، انہوں نے خود کو بہت ملامت کی تھی کہ انہیں خود میں اور صفدر حیات میں کوئی فرق نظر نہیں آ رہا تھا کہ اس نے ہوینا بخاری کی کردار کشی کی تھی اور انہوں نے خدیج بخاری کی وہ سیل فون اپنے ساتھ لے آئی تھیں اور اپنے نمبر سے رقیب کا نمبر ڈائل کیا تھا اور اس سے مل کر سیل فون اسے دے دیا تھا ان کی ہی مانند مشاغل حمید بھی منہ کے بل گرا تھا۔

''مجھے معاف کر دیں ہوینا۔'' جیسے ہی تمام تر تفصیل کا اختتام ہوا تھا کمرے میں سناٹا چھا گیا تھا اور سناٹے میں اس کا رونا بلکنا دراڑیں ڈالتا جا رہا تھا کہ وہ ہارے ہوئے شکستہ انداز میں گھٹنوں کے بل اس کے قدموں میں جھک گیا تھا اور نہ صرف اپنے جرم کی معافی لبوں سے مانگی تھی اس کے پاؤں بھی پکڑ لئے تھے۔

''میں آپ کا گناہ گار ہوں ہوینا، مجھے بخش دیں۔'' وہ اس کے پاؤں پکڑے بچوں کی طرح رو رہا تھا کہ وہ دو قدم پیچھے ہو گئی تھی۔

''ہم انہیں معاف نہیں کر سکتے، معاف نہیں کر سکتے۔'' وہ اذیت زدہ لہجے میں بولی تھی اور وہ اپنے آنسو صاف کرتے اس تک آئے تھے۔

''ہم نے آپ سے کہا تھا ناں کہ اللہ سب سے بڑا منصف ہے وہ ضرور ہمارے ساتھ انصاف کرے گا، آپ کو آپ کے صبر کا پھل مل گیا ہے ونی اور جس اللہ کے لئے آپ نے صبر کیا تھا اسی اللہ کے لئے مشاغل کو معاف بھی کر دیں کہ اللہ معاف کرنے والوں کو بہت پسند کرتا ہے۔'' ان کا وہی نرم عاجزانہ سا انداز تھا وہ رونا بھول کر انہیں دیکھنے لگی تھی، اس کی آنکھوں میں واضح شکوہ تھا اور وہ اس کی آنکھوں کی تحریر پڑھتے دھیمے سے مسکا دیئے تھے۔

''ہم آپ کی جگہ ہوتے تو تب بھی ہم اتنی آسانی سے اپنے مجرم کو معاف کر دیتے۔'' انہوں نے اس کی آنکھوں کی تحریر زبان سے کہی تھی اور اس کے آنسو گرنے لگے تھے۔

''ہاں کیونکہ کردار کشی صرف عورت کی نہیں ہوتی کہ انگلیاں اٹھانے والے مرد کے بے داغ کردار کو بھی اپنے شک کی آگ سے جلا کر خاکستر کر دیتے ہیں جس اذیت سے آپ محض چار ماہ گزری ہیں ہم نے یہ اذیت چھ سال برداشت کی ہے۔'' ان کی آنکھیں یکدم لہو رنگ ہو گئی تھیں اور وہ تینوں ہی انہیں دیکھنے لگے تھے۔

''اور پھر بھی ہم انہیں معاف کر چکے ہیں کہ ہم نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا اور اس منصف نے جب انصاف کر دیا ہے ہمیں اپنی رحمت سے بندوں کی عدالت میں بھی سرخرو کر دیا ہے تو ہم کیوں اپنے رب کی نافرمانی کے مرتکب ہوں کہ ہمارا اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور ہماری دی ایک معافی اگر ہمیں ہمارے اللہ کے قریب کر سکتی ہے اس کے پسندیدہ لوگوں کی صف میں جگہ دے سکتی ہے تو ہزار تو لاکھوں اذیتیں بھی فراموش کی جا سکتی ہیں اور ہم نے اپنے رب کی رضا کے لئے انہیں معاف کر دیا ہے اور آپ مشاغل کو معاف کرتی ہیں یا نہیں، یہ آپ کا ذاتی فعل ہوگا، بس ہم تو یہی چاہتے ہیں کہ آپ خوش رہیں۔'' ان کے خوبرو چہرے پر سکون واطمینان رقم تھا اور انہوں نے فیصلے کی ڈور انہیں سونپ کر بات ہی ختم کر دی تھی اور اس نے اپنے سر پر ٹھہرے ان کے دست شفقت پر سکون سے ایک فیصلہ لے لیا تھا کہ جب وہ اتنے اچھے اور پرسکون تھے تو ان کی پرورش و تربیت انہی کے ہاتھوں میں ہوئی تھی اس لئے وہ ان کی سوچ کی مخالفت نہیں کر پائی تھی اور مطمئن سی ان کی روش پر چل پڑی تھی کہ یہی سیدھا اور فلاح کا راستہ تھا۔

☆☆☆

''ہم نے آپ کو معاف کی رمشہ!'' ان کے الفاظ کیا تھے اس کے رونے میں شدت آ گئی تھی کہ اس نے جس وقت انہیں ایک ٹیکسٹ کیا تھا تو اسے امید نہیں تھی کہ وہ آ جائیں گے اور اس کی آنکھوں میں حیرت دیکھ کر بولے تھے۔

''آپ کی پکار پر ہم سے رہا نہیں گیا، ہم آپ کے بلانے کے سبب اور مقصد سے انجان صرف یہاں تک اس لئے آئے کہ آپ کو انتظار کی اذیت نہیں سونپنا چاہتے تھے۔'' وہ انہیں دیکھ کر کچھ بول نہیں پائی تھی کہ وہ اپنے ازلی سنجیدہ لہجے میں شروع ہو گئے تھے اور اس کے آنسو گرنے لگے تھے کہ وہ اس کے بلانے کا مقصد ہی جان گئے تھے اور وہ ندامت سے کوئی معافی کے لئے اپنے منہ سے کوئی لفظ ادا کرتی کہ وہ اسے معافی نامہ ہی دے گئے تھے۔

''یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟'' ان کے خود ہی

بنا معافی طلب کیے معاف کر دینے پر وہ خود کو بہت چھوٹا سمجھنے لگی تھی اور وہ جو جانے لگے تھے ان کے پاؤں جکڑ گئی تھی اور وہ تو اپنے پورے وجود سے کانپ اٹھے تھے۔

''میں آپ کی مجرم ہوں خدیجہ، گناہ سرزد ہوا ہے مجھ سے، مجھے یوں اتنی آسانی سے معاف نہ کریں، مجھے سزا دیں کہ میرا گناہ معافی کے لائق نہیں ہے۔'' وہ اس سے اپنے پاؤں چھڑاتے فاصلے پر ہوئے تھے اور وہ بلکتے ہوئے کہتی چلی گئی تھی۔

''آپ خود کو ہمارا مجرم مانتی ہیں ہوسکتا ہے ایسا ہو مگر ہمارے دل کی عدالت میں آپ ہمیشہ سرخرو رہی ہیں اور جب ہمارا دل ہی آپ کو مجرم نہیں مانتا، تو ہم دماغ کی خاطر کیسے آپ کو مجرم تسلیم کر کے سزا دے ڈالیں کہ آپ کو سزا دینے کا مطلب ہے خود کو سزا دینا اور ہم تو پچھلے کئی طویل سالوں سے سزا جھیل رہے ہیں، مزید کسی سزا کسی تکلیف و آزار کے متحمل نہیں ہوسکتے۔'' وہ جذباتی لہجے میں اذیت کے رنگ سجائے کہتے چلے گئے تھے اور وہ رونا بھول کر انہیں دیکھنے لگی تھی۔

''درد جتنا گہرا ہوتا ہے، محبت اتنا ہی اثر رکھتی ہے اور ہم نے تو آپ سے ہر سود و زیاں کے امتیاز کو بھلا کر محبت کی تھی، آپ نے جب تک محبت کا جواب محبت سے دیا ہم آپ کے رہے اور جب آپ کی محبت نے نفرت، بدگمانی و شک کے رنگ اپنائے ہم تب بھی آپ کے ہی رہے کہ بدگمان تو آپ ہوئیں تھیں، ہماری محبت، ہمارے کردار پر تو آپ کو شک تھا، ہمیں نہیں، تو ہم کیسے آپ کی محبت دل سے نکال کر آپ کو فراموش کر دیتے؟'' وہ اس کی آنکھوں کی بے یقینی کو پڑھتے ہوئے آزردگی سے بولے تھے۔

''آپ میری بدگمانی کو دور تو کر سکتے تھے؟ مجھے بتا سکتے تھے ناں کہ میں غلط ہوں۔'' وہ ان کے عین سامنے آن رکی تھی۔

''آپ کو ہم پر ہماری محبت پر اعتبار نہیں تھا، ہماری خاموشی پر آپ کو اعتبار نہ آیا تو آپ ہماری زبان سے نکلے کسی لفظ پر اعتبار کر لیتیں؟'' وہ سرخ آنکھوں سے ان کے متورم چہرے کو دیکھتے دلگرفتگی سے سوال کر گئے تھے اسے برزخ میں اتار گئے تھے۔

''مجھے اعتبار کرنا محبت کرنا ہی نہیں آیا، میں آپ سے محبت کرنے کے باوجود شک کی اندھی آگ میں جھلستی آپ کو خود سے دور کر گئی، اتنے سال آپ سے دور رہی، بدگمان رہی، کبھی خیال آیا بھی کہ آپ ایسے نہیں ہیں، آپ ایسے ہو نہیں سکتے، اپنے ہی خیال کو جھٹک کر بدگمانی کو مضبوط کرتی رہی، آپ سے بیک وقت محبت و نفرت کرتی رہی، ہوینا سے نفرت کرتی رہی اس کے لئے بد دعائیں کرتی رہی۔'' وہ ان کے قدموں میں ہی گرتی چلی گئی تھی۔

''میں نے آپ سے بہت محبت کی تھی اور جب آپ ہوینا کے لئے اپنی فکر دکھاتے تھے تو مجھے اچھا نہیں لگتا تھا مگر میں نے کبھی ظاہر ہی نہیں کیا اور جب آپ نے مجھ سے شادی سے انکار کیا تو مجھے لگا کہ میرے خدشے جیت گئے، ہوینا نے آپ کو مجھ سے چھین لیا ہے۔'' وہ ہچکیوں کے درمیان بول رہی تھی اور وہ دو قدم پیچھے لے گئے تھے اور ضبط سے اس کو سن رہے تھے۔

''آپ کی آنکھوں میں صرف میں رہنا چاہتی تھی اور جب آپ نے شادی سے انکار کیا تو میں نے وہ تمام اسباب گھڑ لئے جو سوچے تک نہ تھے اور میرے لگائے ہر الزام کو آپ نے خاموشی سے سن لیا، میں آپ کی طرف سے بے اعتبار و بے یقین ہوگئی تھی تو آپ نے بھی مجھے یقین و

اعتبار سوچنے کی کوشش نہ کی۔'' وہ نم آنکھوں میں شکوے لئے انہیں دیکھنے لگی تھی۔

''ہم آپ کی سوچ سے انجان تھے، نہیں جانتے تھے کہ آپ ونی کے بارے میں کس طرح سوچتی ہیں کہ وہ تو اس وقت محض میٹرک کی اسٹوڈنٹ تھیں ہم انہیں ایک بچی کی طرح ٹریٹ کرتے تھے، وہ دنیا میں ہمارا واحد رشتہ ہیں اسی لئے ہم ہمیشہ ان کے لئے فکر مند رہے، آپ ان کے لئے کس حد تک غلط گمان کرتی ہیں یہ تو ہمیں اس دوپہر پتہ چلا جب ہم نے آپ سے شادی نہ کرنے کی بات کی، ہم تو حیران رہ گئے تھے کہ ہمارے انکار سے ونی کا کیا تعلق؟ اور جب آپ نے ونی اور ہمارے متعلق مغلظات اپنی زبان سے نکالے تو ہمارے دل نے خواہش کی تھی کہ زمین پھٹے اور ہم اس میں سما جائیں لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا رمشہ! آپ کہتی رہیں اور ہم سنتے رہے، ہم نے وہ سب سنا جو ذہن و دل کے پردے پر کبھی نہیں لہرایا تھا مگر ہم نے اپنی صفائی میں ایک لفظ نہیں کہا کہ اپنی صفائی پیش کر دیتے تو آپ شرمندہ ہوتیں اور ہم آپ کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔'' وہ ان سے قدرے فاصلے پر کارپٹ پر گر سے گئے تھے۔

''آپ کو صفائی پیش کر دیتے تو آپ شادی کا مطالبہ کرتیں، ہم سے شادی نہ کرنے کا جواز مانگتیں جو ہم نہیں دے سکتے تھے اس لئے آپ کو بدگمان ہی چھوڑ کر آپ سے جدا ہو گئے، لیکن آپ کی جدائی نے ہمیں جتنا نہیں مارا، جتنا آپ کے لفظوں آپ کے شک نے ہم سے لمحہ لمحہ جینے کا حق چھینا ہے، آپ اتنی بے رحم کیسے ہو سکتی ہیں رمشہ، کہ آپ نے یوں ہمیں اپنی نظروں سے گرا دیا؟ خود کو ہم سے چھین لیا؟ ہمیں اذیتوں کے حوالے کر دیا، ہم سے ہماری ونی کو چھین لیا، وہ

ونی جو ہمارے چاچا کی بیٹی تھیں، جنہیں ہم بیٹا کہتے تھے، جو ہمارے ہاتھوں میں پلی بڑھی تھیں، ہمارا ہاتھ ان کے سر پر دست شفقت بن کر ٹھہرتا تھا اور آپ نے محض اپنے شک و بدگمانی کے سبب ونی کو بے سائباں کر دیا، ہم نے ان سے نرم لہجے میں بات کرنی چھوڑ دی، ان کے سر سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، وہ ہماری طرف لپکتی رہیں اور ہم ان سے کنارہ کشی کرتے گئے اور پھر بھی ہماری ذات ہمارا کردار پھر سوال بن گیا، شاغل حمید پر بھروسہ کیا اور انہوں نے بھی آپ کی روش اپنائی، ونی کو بے اعتبار کر ڈالا، ہم کہا غلط تھے رمشہ؟ جو ہمارے ساتھ آپ نے اور شاغل نے اتنی سنگدلی دکھائی ہمارا ہر سانس ہمارے لئے آزار بنا دیا۔'' ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

''آپ کو کھونے سے ڈرتی تھی اور جب آپ نے جدائی کا پروانہ تھمایا تو مجھے یہی لگا کہ آپ ہوینا کی وجہ سے مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے میرے سوچنے، سمجھنے کی ہر صلاحیت ہی مفلوج ہو گئی تھی۔'' وہ سسک اٹھی تھی۔

''اور ایسی کیا بات تھی کہ آپ نے میری غلط فہمی دور نہ کی، بتائیے مجھے کیوں کیا تھا آپ نے مجھ سے شادی سے انکار کہ آج آپ کو میں چپ نہیں رہنے دوں گی، آپ کی خاموشی کی میں نے پہلے ہی بہت سزا جھیلی ہے، صفدر حیات کے موبائل فون کے ذریعے سچائی مجھ پر نہ کھلتی تو مزید جھیلتی رہتی، دنیا تو اپنی خراب کر ہی لی تھی، دو پاک باز لوگوں پر بہتان باندھنے کے سبب میری آخرت بھی خراب ہوتی۔'' اس کے رونے میں بدستور اضافہ ہو رہا تھا۔

''ہم نے آپ کو معاف کر دیا ہے اور اللہ سے دعا کریں گے کہ آپ کو معاف کر دیں۔'' وہ آستین کے کف سے آنسو رگڑتے کھڑے ہو گئے

تھے۔

''جواب دیئے بغیر نہیں جا سکتے آپ خدیج!'' وہ ان کا بازو تھام گئی تھی۔

''گزرا وقت آ نہیں سکتا رمشہ! جو ہوا اسے بھول جایئے اور یہ یقین رکھیئے گا کہ آپ کے ہر الزام نے کیسے ہی ہمارا جگر چھلنی کیا ہو، آپ کے الفاظ کی بازگشت ہماری نیند کی راہ میں آتی رہی ہو ہم نے آپ کے لئے کبھی دست بد دعا بلند نہ کیا، ہمیشہ اللہ سے آپ کے لئے دعا کی، ہم نے مشکل وقت کو اللہ کی رضا جان کر گزارا اس لئے آپ کو معاف کرنے نہ کرنے کا سوال ہی نہیں ہے۔'' وہ اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہتے چلے گئے تھے۔

''ہم آپ کے اطمینان کے لئے ذہن و دل کی سچائی و آمادگی سے کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے آپ کو معاف کیا، آپ خود کو ہمارا مجرم سمجھنا چھوڑ دیں۔'' وہ نرمی سے اس کا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹا گئے تھے۔

''خاموشی اور ایثار ہر مسئلے کا حل نہیں ہوا کرتے خدیج اور آپ نے جو غلطی چار سال پہلے کی تھی اس کو دہرا رہے ہیں، مجھے میری الجھنوں کے ساتھ چھوڑ کر جا رہے ہیں، جبکہ سوال کے جواب نہ ملیں تو بدگمانی کو جنم دیتے ہیں، پہلے شاید میری محبت کی شدت نے مجھے آپ سے بدگمان کر دیا تھا اور ایسا پھر ہوا تو اس میں آپ کی اچھائی کا ہاتھ ہوگا۔'' اس کی نم مگر بھاری آواز پر ان کے قدم تھم گئے تھے۔

''جب آپ کو پہلی دفعہ یونیورسٹی میں دیکھا تھا ہم نے تب ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ آپ سے ہی شادی کریں گے اسی لئے تو ماں جی کی شال آپ کو دی تھی۔'' وہ ان دونوں کی یادوں ان خوشگوار لمحات میں کھو سے گئے تھے۔

''مگر ہم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ قسمت ہمارے ساتھ اتنا بھیانک مذاق کرے گی، ہمیں اپنی خواہشات، اپنے ارمان اپنے ہی قدموں تلے روند کر آپ سے اپنی راہیں الگ کرنی پڑیں گی۔'' انہوں نے اذیت سے اپنے لب بھینچ کر گویا خود کمپوز کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔

''آپ کی خوشیوں، آپ کی آسودگی اور آپ کے وجود کی تکمیل کے لئے ہمیں ایک ایسا فیصلہ لینا پڑے گا کہ ہم اندر سے مر جائیں گے مگر ہم نے آپ کے لئے اپنا نہیں سوچا، ہمارے ساتھ میں آپ کی ناآسودگی پھن پھیلائے بیٹھی تھی اس لئے ہم نے آپ سے کہہ دیا کہ ہم آپ سے شادی نہیں کر سکتے کہ رمشہ ہم ایک حادثے میں بہت بڑی کمی کا شکار ہو گئے تھے اور ہم سے شادی کے بعد جس کی آپ بھی شریک بن جاتیں اور یہ ہمیں گوارہ نہیں تھا رمشہ، کہ ہم آپ کو دھوکا دیتے، آپ کو آپ کے حق سے محروم کر دیتے۔'' ان کے چہرے پر اذیت کا جال بچھا ہوا تھا۔

''ہم باپ نہیں بن سکتے رمشہ۔'' اس نے یکدم ان کے چہرے کی جانب دیکھا تھا ان کا چہرہ آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں اور وہ اس وقت ایسی اذیت سے گزر رہے تھے جیسی اذیت انہوں نے یہ روح فرسا خبر سن کر محسوس کی تھی اور وہیں کھڑے کھڑے مر سے گئے تھے۔

''اور ہم آپ کو اپنی کمی کا شریک نہیں بنا سکتے تھے اس لئے شادی سے انکار کیا اور آپ نے ہماری تکلیف کو جانے بنا ہمارے اقدام کو سمجھے بنا ہمیں اپنی ہی نہیں خود ہماری نظروں سے بھی گرا دیا، آپ کے الزام پر جتنا دکھ نہیں ہوا تھا جتنی تکلیف ونی کے حوالے نے دی تھی اور جب جب آپ کے الفاظ کی بازگشت بڑھی ہم نے سوچا کہ ہم آپ کو معاف نہیں کر پائیں گے کہ

آپ نے ہم سے ہمارا واحد رشتہ چھین لیا تھا لیکن جب آپ نے ٹیکسٹ کیا کہ آپ ہم سے ملنا چاہتی ہیں ہم آپ کے گھر آ جائیں تو ہم انکار نہیں کر سکے آپ کا مان نہیں توڑ سکتے تھے۔'' وہ لب اور مٹھیاں بھینچے خود کو کمپوز کرنا چاہ رہے تھے۔

''آپ کی اچھائیاں تو سنہرے حروف سے لکھے جانے کے لائق ہیں خدیج، بس ہم ہی آپ کی قدر نہیں کر سکے اور چاہے آپ نے ہمیں بد دعا نہ دی ہو مگر آپ کی دعا خاموش آہ ہمیں لگ گئی، آپ ہمیں آسودہ دیکھنا چاہتے تھے لیکن آسودگی ہم سے دو ماہ میں ہی روٹھ گئی، کہ ہم نے آپ پر بہتان باندھا تھا آپ نے چاہے کچھ کہا نہیں مگر اللہ تو سب سے بڑا منصف ہے اس نے ہمیں سزا دی، آپ سے جدا ہونے کے اگلے ماہ ہی ارشد سے شادی کر لی تھی کہ دل کے نہ چاہتے ہوئے بھی بابا کے جڑے ہاتھوں کا مان میں نے رکھ ہی لیا تھا مگر محض دو ماہ بعد ارشد ایک کار ایکسیڈنٹ میں مجھے اتنی بڑی ذمہ داری سونپ کر چلے گئے، وہ وقت جیسے میں نے گزارا یہ بس میں ہی جانتی ہوں کہ اس معاشرہ میں اکیلی عورت کا جینا جیسے ناممکن سا ہو گیا ہے، میری بیوگی کا صدمہ بابا جھیل نہیں سکے تھے وہ فقط تین ماہ بعد ہی مجھے چھوڑ گئے، مجھے کوئی خدیج نہ مل سکے جو میرے لئے سائبان بن جاتے، مجھے دنیا کی میلی نظروں سے بچا لیتے کہ میں ہوینا کی طرح خوش نصیب نہیں تھی، میری مشکلات خود میری خریدی ہوئی تھیں اور میں نے اکیلے ہی دنیا کا مقابلہ کیا، میرے بچوں کے دنیا میں آنے سے ان کی دیکھ بھال و تربیت تک ہر کام میں نے اکیلے کیا، جب گرنے لگتی تو خود ہی سنبھل گئی مگر جب مجھ پر حقیقت منکشف ہوئی تو احساس ہوا کہ رشتے انسان کے لئے کتنی بڑی اماں ہوتے ہیں اور بے اماں ہو جانے والی ہوینا بخاری کو آپ نے کن حالات میں سائبان بخشی تھی، ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجئے گا خدیج کہ میں نے آپ کو اور ہوینا کے بارے میں غلط گمان کیا، آپ کے پاکیزہ رشتے کو اپنی سوچ کی گندگی سے پراگندہ کر دیا، میں جان گئی ہوں کہ رشتے تو احساس کے انسانیت کے ہوتے ہیں کہ خون کے رشتے بھی کس طرح بدل جاتے ہیں خوب جان گئی ہوں کہ آپ نے ہوینا سے کزن کا رشتہ بھی یاد رکھا اور اللہ کے احکامات وہدایات بھی فراموش نہ کیں اور میرا سگا ماں جایا، خون کا رشتہ بھی بھول گیا، اسے اللہ کے احکامات بھی یاد نہ رہے ہیں یہاں بے اماں اپنی آبرو کی جنگ اکیلے ہی لڑتی رہی اور میرا بھائی وہاں دیار غیر میں بسا رہا میری کسی پکار پر لوٹ کر نہیں آیا کہ اس کے اندر کا احساس ہی مٹ گیا ہے اور اسی لئے میں خود اکیلے ہی اپنا اور اپنے بچوں کے سروائیول کی تگ و دو میں لگی ہوں۔'' وہ بری طرح بلک رہی تھی۔

''کیونکہ یہی مکافات عمل ہے، انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے، میں نے آپ کے اور ہوینا کے لئے کانٹے بوئے جو میرے ہی دامن سے آن لپٹے ہیں۔'' اس کی گریہ و زاری بڑھتی جا رہی تھی کہ اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو گیا تھا۔

''ہم نے تو صرف عزت و محبت کے بیج کاشت کیے تھے تو ہم نے کیوں نفرت و شک کی فصل کاٹی؟'' اس کا رونا ان کی برداشت سے باہر تھا مگر وہ بہت ضبط و حوصلہ سے کام لیتے رہے تھے کہ یکدم اس کو کاندھوں سے تھام کر جھنجھوڑتے سوال کر گئے تھے۔

''یہ آپ کی آزمائش تھی خدیج! جس میں آپ کھرے اترے ہیں اور ہم شکست کھا گئے

اسی لئے آج خود سے آپ سے ہو بنا سے نظر تک ملانے کے قابل نہیں رہے۔'' مستقل رونے سے اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

''مصائب اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں رمشہ، کہ اللہ کو مصیبت یا راحت دینے کے لئے اسباب کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' وہ اس کے شانے آزاد کرتے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''مکافات عمل اور آزمائش کا تعلق صرف ہماری سوچ سے ہے، کسی مصیبت پر ہماری سوچ کہتی ہے کہ یہ آزمائش ہے اور کوئی مصیبت ہمیں ہمارے لئے کی سزا لگنے لگتی ہے، جبکہ درحقیقت ہر چیز، ہر مصیبت، ہر راحت صرف اللہ کا فیصلہ، اس کی مرضی ہوتی ہے، آپ کا ہماری زندگی میں آنا اللہ کی رضا تھا، آپ کا چلے جانا بھی اللہ کی رضا تھا، آپ کا ارشد کی بیوی بننا، ان کا اور آپ کا ساتھ طویل نہ ہونا یہ بھی اللہ کی رضا تھا جسے آپ سزا سمجھ رہی ہیں کہ یہ آپ کی آزمائش بھی تو ہو سکتی ہے اور ہم بھی تو کوئی فرشتہ نہیں ہیں، نہ جانے دن بھر میں کتنی غلطیاں، کتنے گناہ کرتے ہیں پتہ نہیں ہمارا کون سا عمل ہمارے اللہ کو پسند نہ آیا ہو اور اس کے عوض ہمیں ذلت کے روپ میں سزا ملی ہو۔'' وہ رونا بھول کر ان کو دیکھنے لگی تھی۔

''ہم اللہ کی حکمت اس کی مصلحت تک نہیں پہنچ سکتے رمشہ، تو ہم کیسے ہی خود سے مکافات عمل اور آزمائش کی پریشانیاں تراش لیتے ہیں جبکہ اللہ صرف لے کر تو نہیں آزماتا، دے کر بھی تو آزماتا ہے، کبھی اولاد کا نہ ہونا آزمائش تو کبھی اولاد کا ہونا سب سے بڑی آزمائش۔'' وہ نہایت ٹھہرے ہوئے لہجے میں ایقان کی شدت سے کہہ رہے تھے۔

''جو ہوا اسے بھول جائیے کہ وہ سب ویسے ہی ہونا تھا کہ وہ سب آپ کی اور ہماری تقدیر لکھنے والے اللہ کی رضا تھی اور دعا سے صرف تقدیر بدلتی ہے، اس لئے اللہ کی رضا میں راضی رہنا سیکھیے زندگی خود بہ خود سہل ہو جائے گی۔'' وہ اپنے آنسو پونچھ گئے تھے اور تب ہی کسی ننھی پکار پر رمشہ متوجہ ہوئی تھیں جبکہ وہ بری طرح چونک اٹھے تھے، آواز کی جانب رخ کیا تھا، بے بی پنک کلر کی خوبصورت سی فراک میں گلابی چہرے والی وہ تقریباً پانچ سال کی بچی دوڑ کر رمشہ کے پیروں سے لپٹ گئی تھی جسے رمشہ نے اپنی گود میں اٹھا لیا تھا۔

''خدیج! یہ آمنہ ہے میری بیٹی۔'' رمشہ نے بھیگے لہجے میں تعارف کی رسم نبھائی تھی خدیج بخاری نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا تھا اس کے متورم چہرے پر نرمی سی پھیل گئی تھی۔

''ہم سے شادی کریں گی رمشہ؟'' وہ جو بیٹی کی کسی بات کی وجہ سے پوری طرح اس کی جانب متوجہ تھی ان کی بات پر بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔

''کچھ نامکمل ہم ہیں رمشہ، کچھ کمیاں آپ میں ہوں گی اور ہم ایک دوسرے کی کمیوں کو بانٹ لیں گے، آپ ہماری کمی کے ساتھ سمجھوتہ کر لیجئے گا اور ہم آپ کے رشتوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیں گے۔'' وہ نہایت ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہر بات کہہ گئے تھے، خود سمجھوتہ کرنے ان کی بیٹی کو اپنانے کے لئے تیار تھے اور ان سے کہہ رہے تھے کہ وہ ان کی کمی کو بھی اپنا لیں۔

''ہم آپ کے لائق نہیں ہیں خدیج!'' اس کی آنکھوں سے پھر اشک رواں ہو گئے تھے۔

''یہی تو ہمیں لگا تھا رمشہ کہ ہم آپ کے لائق نہیں ہیں اس لئے خود آپ کی زندگی سے نکل گئے تھے جس طرح ہم نے سوچا اور فیصلہ کیا ویسے ہی آپ بھی سوچ کر فیصلہ کریں گی تو ہم ایک بار

پھر الگ ہو جائیں گے اور اب کے ہم آپ کو کھونا نہیں چاہتے رمشہ۔'' ان کے لہجے میں یاسیت ہی نہیں جذبے بھی بول اٹھے تھے، وہ بھیگی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی تھیں اور ٹھوکریں کھا کر انسان کی اتنی تو پرکھ آ گئی تھی کہ وہ ان کی آنکھوں سے ہی جان گئی تھیں کہ وہ یہ فیصلہ آج بھی صرف ان کی خوشی کے لئے لے رہے تھے اور یہ احساس اس کو بے چین کر گیا تھا کہ جس شخص کو اس نے محبت کے نام پر ذلیل کیا تھا وہ آج بھی ان پر مہربان تھا۔

''پلیز رمشہ! ہاں کہہ دیں کہ ہم آپ کی بیٹی کو اپنی بیٹی کی طرح چاہے چاہ نہیں سکیں گے لیکن ان کے احترام و عزت میں کبھی کمی نہیں آنے دیں گے، وٹی کی طرح ان کو پیار و عزت سے بہتر زندگی فراہم کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے، بس آپ ایک بار ہم پر اعتبار تو کر کے دیکھیں؟'' وہ دھیمے سے لہجے میں ملتجی ہوئے تھے اور وہ خود کو بہت چھوٹا محسوس کرنے لگی تھی کہ اس شخص نے ان سے آج بھی اپنے لئے کچھ نہیں مانگا تھا اور انہوں نے مسکرا کر اقرار کر لیا تھا کہ وہ ان کی اچھائی کی ہی نہیں تقدیر کی بھی متعارف ہو گئی تھی اور اس کی تقدیر میں ان کا ساتھ اسے ہی لکھا تھا اس لئے وہ راضی ہو گئی تھی کہ اس پر یہ راز بھی عیاں ہو گیا تھا کہ اس کی بیٹی کے لئے خدیجہ بخاری کے علاوہ کوئی شجر سایہ دار نہ تھا کہ جس کی اماں میں وہ اور ان کی بیٹی سکھ و عزت سے رہ سکیں، ان کو مسکراتے دیکھ کئی برسوں بعد وہ بھی مطمئن سے مسکرا دیئے تھے کہ ان کے اقرار پر انہیں یہی لگا تھا کہ اللہ ان سے راضی ہے اسی لئے ان پر ایک اور ذمہ داری ڈال دی ہے وہ سرخروئی کی دعا دل میں کرتے رمشہ کی گود سے آمنہ کو لے لیا تھا اور اس ننھی پری کو گود میں لیتے ہوئے انہیں یہی احساس ہوا تھا کہ جیسے وقت بہت پیچھے چلا گیا ہو اور انہوں نے ہو بہو بینا بخاری کو لیا ہو، ان کی آنکھیں احساس تشکر سے بھیگتی چلی گئی تھیں۔

☆☆☆

''سال نو مبارک ہو خدیجہ۔'' وہ گزرے دو سالوں میں اور بھی حسین ہو گئی تھی وہ اس کی آواز پر پلٹے تھے اور اس کے سامنے آ کر دلکشی سے کہنے پر مسکرا دیئے تھے۔

''آپ کو بھی نیا سال مبارک ہو، اللہ آپ کو یہ سال مبارک کرے، یہ سال آپ کا دامن خوشیوں سے بھر دے۔'' انہوں نے اس کے سر پر دست شفقت رکھا تھا۔

''آمین۔'' رمشہ مسکرا کر ان دونوں کے پاس آن ٹھہری تھی اور وہ خدیجہ بخاری کے سامنے سے ہٹ کر رمشہ سے ملنے لگی تھی۔

''شاغل بھائی کہاں ہیں؟'' رمشہ کا انداز شرارت لئے ہوئے چھیڑنے والا تھا۔

''آئے تو ہم ان کے ہی ساتھ ہیں مگر وہ اندر کیوں نہیں آئے پتہ نہیں، ہم جا کر دیکھتے ہیں۔'' وہ جھینپ کر کہتی جانے کے ارادے سے پلٹی تھی کہ شاغل حمید کو آتے دیکھ رک گئی تھی کیونکہ وہ اپنے بیٹے کو گود میں اٹھائے اور آمنہ کی انگلی تھامے وہیں چلا آیا تھا۔

''باہر نئے سال کا جشن منانے کے لئے لوگوں نے جو پٹاخوں اور پھلجھڑیوں کا انتظام کیا ہوا ہے ان دونوں شرارتیوں کی ضد پر وہی دیکھتے رک گیا تھا، آپ ناحق میری تلاش میں نہ نکلیں کہ میں لوٹ آیا ہوں۔'' شاغل کا انداز نہایت لاپرواہ اور شرارت کا عنصر اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔

''یہ اللہ کا ہم پر کرم تھا کہ ہم دونوں ہی وقت پر لوٹ آئے تھے۔'' رمشہ کی آنکھیں بھیگنے

لگی تھیں۔

''آج سال کا پہلا دن ہے، ہم صرف اچھے دنوں کو یاد کریں گے تاکہ پورا سال ہمارا احساس تشکر میں گزرے۔''

''خبردار جو آپ دونوں میں سے کسی نے کوئی فضول سی بات سے خوشگوار لمحات کو پھیکا کرنا چاہا۔'' وہ ڈپٹنے والے انداز میں مدبرانہ لہجے میں بولی تھی۔

''جو حکم ملکہ عالیہ!'' شاغل کی بات پر وہ جھینپ گئی تھی اور وہ دونوں مسکرا دیے تھے، رمشہ ان کو دیکھنے لگی تھی جو ہوینا کے دو سالہ بیٹے کو پیار کرتے، آمنہ کی جانب بھی متوجہ تھے کہ وہ ان سے کوئی فرمائش کر رہی تھی اور وہ مسکرانے لگے تھے، گزرے تین سالوں کے لمحہ لمحہ نے انہیں احساس دلایا تھا کہ ان کا فیصلہ درست تھا۔

''آپ خدیجہ کو ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں، نظر لگانے کا ارادہ ہے۔'' ہوینا نے اس کی چوری نہ صرف پکڑی تھی متبسم لہجے میں بھانڈا بھی پھوڑ دیا تھا اور وہ خفیف سی ہو کر نگاہ جھکا گئی تھی، وہ ان کے شرمائے ہوئے چہرے کو دیکھ مطمئن سے مسکرا دیئے تھے کہ وہ اپنی ہی نہیں ہوینا کی زندگی سے بھی مطمئن تھے کہ شاغل حمید نے اپنے برے رویے کی نہ صرف معافی مانگی تھی گزرے سالوں میں اس کا ازالہ بھی بڑی خوبصورتی سے اسے چاہت وعزت دے کر کر دیا تھا وہ شاغل حمید کے ساتھ ایک خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کر رہی تھی اور وہ خود رمشہ کے ساتھ میں مطمئن تھے کہ بے اعتباری کے بادل چھٹ گئے تھے، ہوینا کو شاغل ''سید ہاؤس'' میں اسی حق و مان کے ساتھ لے کر آتا تھا جیسے کوئی بھی بہن، بیٹی اپنے میکے جاتی ہے اور رمشہ نے اپنی محبت اور توجہ سے ان کی ہر تکلیف کا نہ صرف ازالہ کیا تھا انہیں آسودہ زندگی کے سارے رنگوں سے متعارف کروا دیا تھا اور وہ چاروں ایک دوسرے سے بات کرتے، ایک دوسرے کو حق و مان سے چھیڑتے رشتوں کے احساس کو جی رہے تھے کہ بے اعتباری کے بادلوں کے چھٹنے سے اچھائی و صاف نیت اور اللہ پر کامل یقین کی جیت ہوگئی تھی کہ ایمان کی کبھی ہار نہیں ہوئی۔

☆☆☆

وہ جیسے ہی جاب سے لوٹی گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر صحن میں رکھے اماں کے مخصوص تخت کی طرف اٹھی، جو کہ آج خالی تھا، اسے اچنبھا ہوا کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا، وہ جب بھی سکول سے لوٹتی تھی اماں وہاں موجود ہوتی تھیں، پرسوچ انداز میں چاروں طرف نظر دوڑاتی وہ اس خالی تخت پر بیٹھ گئی، ہاتھ میں پکڑی کتابیں اور بیگ سائیڈ پہ رکھتے ہوئے اس نے اپنے پیروں کو سینڈل کی قید سے آزاد کرائے اور پاؤں اوپر کر کے ان کو دبانے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا جب اس کی نظر کے سامنے چائے کا کپ ٹھہر گیا۔

اس نے حیرانگی سے نظر اٹھا کر اوپر دیکھا اس کے سامنے سعدیہ کھڑی تھی۔

''سعدیہ تم......؟ آج کالج نہیں گئی کیا؟''

اس نے چائے کا کپ تھام کر حیرت بھرے انداز میں پوچھا۔

''نہیں آپی۔'' وہ سامنے پڑی چیئر پر بیٹھتے

ناولٹ

ہوئے مزید بولی۔

''آپ کو بتایا تو تھا، فیس جمع کروانے کی آج آخری تاریخ تھی، کالج کل وارننگ دی تھی اگر کل بھی فیس جمع نہ کروائی تو پرنسپل کے آفس میں لے جائیں گے، مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا اس طرح پرنسپل کے سامنے جانا، ہر ایک کو پتا لگ جاتا ہے کہ میں نے فیس جمع نہیں کروائی، آپ نے کہا تھا آج آپ پیسے لے آئیں گی، اگر آپ آج لے آئی ہیں تو مجھے دیں کل میں جا کر جمع کروا دوں گی۔'' اس نے خاصی تفصیل سے اس کے سوال کا جواب دیا تھا۔

''مگر آج تمہارا اتنا اہم ٹیسٹ تھا سعدیہ۔''

چائے ہاتھ میں پکڑے وہ بھول چکی تھی۔

''ٹیسٹ اہم تھا، مگر آپی میں انسلٹ کروانا

نہیں چاہتی تھی۔" اس نے منہ بسورا۔

"میری وجہ سے تمہارا ٹیسٹ مس ہو گیا۔"

اسے شدید افسوس نے آن گھیرا، سعدیہ کچھ بولتی مگر سائیڈ کمرے سے نکلتی فوزیہ نے تیزی سے کہا۔

"افسوس تو ایسے کر رہی ہو جیسے نجانے کیا ہو گیا ہو، ایک ذرا سا ٹیسٹ ہی تو تھا نہیں ہوا تو نہ صحیح کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"بہت فرق پڑتا ہے اماں، میڈیکل کی لف پڑھائی میں تو ایک چھٹی سے بھی بہت نقصان ہو جاتا ہے۔" عائزہ نے انہیں سمجھایا۔

"کوئی نقصان نہیں ہوتا، میڈیکل پڑھ کر اس نے کون سا ڈاکٹر لگ جانا ہے، ڈاکٹر بننے کے لئے بہت روپیہ درکار ہوتا ہے اور یہاں تو کھانا پینا مشکل ہے، نجانے تمہیں کیوں شوق چڑھ آیا ہے اسے ڈاکٹر بنانے کا، جبکہ یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتی ہو، تمہارا یہ شوق لا حاصل ہے۔" اس کے برابر میں بیٹھتی فوزیہ نے تیز لہجے میں کہا تھا۔

"کوئی لا حاصل نہیں اماں، آپ اس معاملے میں کچھ مت بولا کریں میری شدید آرزو ہے میری بہنیں کامیاب انسان بن جائیں اور اس کے لئے مجھے جتنی بھی محنت کرنا پڑے گی میں کروں گی، بس آپ انہیں کچھ مت کہا کریں۔" عائزہ نے التجا کی تھی۔

"اونہہ۔" فوزیہ سر جھٹک کر رہ گئی، عائزہ نے بیگ سے پیسے نکال کر سعدیہ کی طرف بڑھائے۔

"یہ میں کچھ ایڈوانس لے کر آئی ہوں کم از کم تم تو اپنی فیس جمع کرواؤ، باقی سب باتیں ذہن سے نکال کر بس اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔"

سعدیہ خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھی اس سے فیس کی رقم لی اور اندر کی طرف بڑھ گئی، جب فوزیہ نے اس سے کہا۔

"اس کی فیس کے لئے رقم تو تم لے آئی، میں نے تمہیں تین دن پہلے کہا تھا تمہارے ابا کی ساری دوائیاں ختم ہو گئی ہیں اس کے لئے تم پیسے نہیں لائی؟"

"لائی ہوں اماں، یہ ابا کی دوائیاں میں خود لے کر آئی ہوں۔" اس نے کتابوں کے ساتھ رکھا دوائیوں کا لفافہ ان کی طرف بڑھایا۔

"آدھی تنخواہ تو ایسے ہی ختم ہو گئی، باقی آدھی تنخواہ میں پورا مہینہ کیسے گزرے گا۔" انہوں نے بڑبڑاتے ہوئے شاپر پکڑ لیا۔

اس کی چائے ٹھنڈی ہو کر بے ذائقہ ہو چکی تھی، اس نے کپ پرے سرکا دیا، اماں نے کچھ غلط تو نہیں کہا تھا، آگے پورا مہینہ پڑا تھا اور پیسے کہاں سے آئیں گے۔

اس کا تعلق مڈل گھرانے سے تھا، پڑھنے کا شوق تھا اپنی ہی کوششوں سے اس نے جیسے تیسے ایم اے انگلش کر ہی لیا، ساتھ ساتھ نوکری بھی جاری رکھی، یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اتنے مشکل حالات میں اس نے ایم اے پاس کر لیا، ایم اے مکمل ہوتے ہی اس نے ایک اسکول میں اپلائی کیا، پرائیویٹ سکول تھا اسے نوکری مل ہی گئی، تنخواہ گو کہ زیادہ نہیں تھی مگر اس مہنگائی کے حالات میں سات ہزار بھی بہت بڑی رقم تھی، گھر کی واحد کفیل وہ خود تھی، ابا مختلف بیماریوں کی زد میں آ کر چارپائی سے لگ کر گھر کی ہر ذمہ داری سے آزاد ہو گئے، اس کے علاوہ اس کی تین بہنیں اور ایک بھائی تھا اس کی شدید خواہش تھی اس کے بہن بھائی پڑھ کر کچھ بن جائیں تا کہ ان کی غربت کے دن ختم ہو جائے، اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے وہ جی جان سے محنت کرتی تھی مگر سات

ہزار میں کہاں تک خواہش پوری ہو سکتی تھیں اتنے میں ضرورتیں ہی پوری ہو جاتی تو بڑی بات تھی یہی وجہ تھی اگر ایک خواہش پوری ہوتی تو دوسری ادھوری رہ کر اسے احساس دلاتی کہ وہ ابھی انہیں مکمل خوشیاں دینے میں کامیاب نہیں ہوئی ہے۔

''اماں تم فکر مت کرو اللہ ہماری مدد کرے گا۔'' اس نے فوزیہ سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی، فوزیہ نے ایک خاموش نظر اس کے سپرد کی اور کمرے کی طرف بڑھ گئی، تو وہ بھی گہری سانس لے کر اپنا سامان سمیٹتی وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

فوزیہ پورے انہماک سے سبزی کاٹنے میں مصروف تھی جب کسی نے پوری قوت سے دروازہ بجا کر اس کا انہماک توڑا تھا۔

''ہائے ہائے کیا دروازہ توڑنے کا ارادہ ہے، دم تو لو، آ رہی ہوں۔'' وہ وہیں سے اونچی آواز میں چلا کر بولی۔

پھر اپنے سامنے پڑی سبزی ہٹا کر پاؤں نیچے کیے تخت کی سائیڈ میں پڑی چپل پہنی اور چھری ہاتھ میں لئے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔

''کون؟'' دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے احتیاطاً پوچھا۔

''میں ہوں کلثوم۔''

''کلثوم۔'' اس نے زیر لب بڑبڑایا اور دروازہ کھول دیا، اپنے سامنے موجود ہستی کو دیکھ کر وہ حیرت بھرے انداز میں بولی۔

''تم آج یہاں کا راستہ کیسے بھول گئی؟'' اپنے دروازے پر کھڑی بڑی سی گاڑی پر نظر پڑی تو وہ مرعوب سی ہو نو وارد خاتون نے کہا۔

''آج تمہاری یاد آئی تو چلی آئی، اب تم راستہ دو تو میں اندر آ جاؤں۔'' کلثوم پوری طرح دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی تھی، اس کی بات پر ایک دم کھسیا کر راستہ چھوڑتی بولی۔

''میری یاد آئی اور تم چلی آئی، بات ہضم کرنا تھوڑا مشکل ہے مگر چلو کر ہی لیتے ہیں۔'' اس کے لبوں پہ طنزیہ مسکراہٹ در آئی تھی۔

مگر کلثوم برا منائے بنا اسی طرح مسکرائی آگے بڑھی اور صحن میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئی، فوزیہ دروازہ بند کرتی اس کے نزدیک چلی آئی اور اس کے سامنے تخت پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''کیا لو گی؟''

''کسی بھی تکلف کی ضرورت نہیں ہے میں ابھی ناشتہ کر کے آئی ہوں، تم بتاؤ بچے کہاں ہیں تمہارے؟ گھر پر اکیلی ہو کیا؟''

''ہاں اس وقت میں اکیلی ہوتی ہوں بچے سب پڑھنے گئے ہیں۔'' فوزیہ نے بتایا۔

''اچھا..... اور عائزہ کیا کر رہی ہے آج کل، اس کا ایم اے مکمل ہو گیا؟'' اس کی دلچسپی اپنے بچوں میں دیکھ کر وہ ایک بار پھر حیران ہوئی تھی اس کی حیرت بجا تھی، کلثوم گو کہ اس کی تایا زاد کزن تھی کبھی ان کے حالات بھی انہی کی طرح ہوا کرتے تھے مگر جب سے کلثوم کا بڑا بیٹا باہر گیا تھا تب سے ان کے حالات بھی سدھر گئے اور یہ خود بھی بدل گئے، غریب رشتے داروں سے ہر تعلق ختم کر کے انہوں نے اپنی الگ دنیا بنالی تھی، لوگوں کے ذہن سے وہ بھولنے لگے تھے کہ اچانک اس کی آمد اور وہ بھی اس طرح کہ وہ خود اس کے بچوں میں دلچسپی لے رہی تھی اور تو اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ عائزہ ایم اے کر چکی ہے، فوزیہ کے لئے آج حیرت کا دن تھا، اپنی حیرت پر قابو پا کر اس نے کہا۔

''ہاں عائزہ کا ایم اے کب کا مکمل ہو گیا ہے آج کل وہ ایک سکول میں پڑھا رہی ہے،

سات ہزار روپے کماتی ہے۔'' اس کے انداز میں ذرا سا فخر در آیا تھا، جب کلثوم مسکرا کر بولی۔

''سات ہزار میں کیا ہوتا ہے، مہنگائی اس قدر بڑھ گئی ہے خدا کی پناہ اور کمال بھائی تو بیمار رہتے ہیں عائزہ بیچاری اکیلی پورا گھر سنبھالے ہوئے ہے۔'' فوزیہ بری طرح چونکی تھی، کلثوم ان کے حالات سے اس قدر باخبر، حیرت در حیرت تھی۔

''تم یہ سب کیسے جانتی ہو؟'' اس نے پوچھ ہی لیا۔

''لو یہ کون سی مشکل بات ہے، تم میری بہن ہو بس ذرا مصروفیات میں میں ملنے نہیں آ سکی ورنہ جو بھی ملنے آتا تھا میں اس سے تمہاری خبر ضرور لیتی تھی۔'' انہوں نے اس کی حیرت دور کی، اسے یقین تو نہیں آیا مگر اقرار میں سر ہلا دیا۔

''اچھا یہ بتاؤ عائزہ کی منگنی کر دی کیا؟'' انہوں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا تھا۔

''آپ یہ کیا پوچھ رہی ہے۔'' فوزیہ نے آنکھیں سکیڑ کر اس کے چہرے کے تاثرات سے کچھ جانچنا چاہا۔

مگر کلثوم پوری طرح بے نیاز بنی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی، وہ کچھ بھی اخذ نہیں کر پائی۔

''یہ سبزیاں اگا کر اچھا کیا تم نے گھر کی سبزیوں کی تو بات ہی الگ ہوتی ہے۔'' اپنی پہلی بات کا جواب جانے بنے اس نے بات کر دی۔

''ہاں یہ عائزہ کو شوق ہے وہی آئے دن کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہے۔'' فوزیہ ذرا سی الجھن کا شکار ہوئی تھی۔

ایک کے بعد ایک سوال اور جواب سننے کا وقت بھی نہیں، گہرا سانس بھرتی وہ خود ہی بتانے لگی۔

''عائزہ کی منگنی کہیں نہیں کی میں نے۔''

''کیوں؟ ایم اے کیے اسے دو سال تو ہو گئے ہیں پھر کیوں نہیں کی؟'' اب کہ انہوں نے اپنی نظریں اس کی طرف موڑ دی، گویا کہ مکمل توجہ۔

''تمہاری بات کا جواب تم خود بھی جانتی ہو کلثوم، ابھی کچھ دیر پہلے تم خود کہہ رہی تھی عائزہ اکیلی پورا گھر سنبھالے ہوئے ہے، تو جب ہمارے گھر کی ذمہ داری عائزہ پر ہے تو پھر ہم اس کی شادی کیسے کر سکتے ہیں؟ اور بالغرض ہم اس کی شادی کا سوچ بھی لیں تو ان حالات میں کیسے شادی ہو سکتی ہے، شادی کے لئے بہت سی رقم چاہیے ہوتی ہے، بہت سے خرچے ہوتے ہیں، کہاں سے ہوگا یہ سب؟ اور پھر سب سے بڑی بات شادی کے لئے لڑکے کی ضرورت ہوتی ہے ہمارے جیسے غریبوں کے گھروں میں کون رشتہ لے کر آئے گا۔'' وہ تو جیسے پھٹ ہی پڑی تھی۔

''گھر کے مسئلوں سے توجہ ہٹے تو اس طرف سوچتی یہ میں نے تو آج تک عائزہ کی شادی کا نہیں سوچا۔'' فوزیہ آخر میں دھیمی آواز میں بڑبڑائی تھی۔

''مگر مجھے سمجھ نہیں آ رہا تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو؟'' بالآخر اس نے اپنی الجھن بیان کر ہی دی۔

''میں عائزہ کے رشتے کے لئے آئی ہوں۔'' انہوں نے اپنے آنے کی وجہ کیا بیان کی فوزیہ تو جیسے اچھل ہی پڑی۔

''تم اور عائزہ کے رشتے کے لئے؟'' حیرت، بے یقینی، خوشی، آس نجانے کیا کچھ تھا اس کے سوال میں۔

''ہاں میں اپنے احسان کے لئے عائزہ کا رشتہ چاہتی ہوں۔''

"احسان تمہارا بڑا بیٹا، وہی جو باہر کے کسی ملک میں رہتا ہے؟" اس نے استفسار کیا۔

"ہاں وہی۔" انہوں نے اقرار میں سر ہلایا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا تم میری بیٹی کا رشتہ چاہتی ہو، تمہیں تو ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی مل سکتی ہے۔"

"بالکل مل سکتی ہے مگر مجھے عائزہ پسند ہے۔"

"اس پسندیدگی کی وجہ جان سکتی ہوں؟" اس نے فوراً پوچھا تھا۔

"اور احسان تو باہر ہوتا ہے پھر عائزہ کا مستقبل کیا ہوگا نہ یہاں کی نہ وہاں کی۔"

"دیکھو فوزیہ! تم نے اب تک بیٹی کی شادی کا سوچا تک نہیں جبکہ اس کی شادی کی عمر ہو چکی ہے اور تم نے اب تک ایسا اس لئے نہیں سوچا، کیونکہ وہ تمہاری کماؤ بیٹی ہے جس نے پورا گھر سنبھال رکھا ہے۔"

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں؟" اپنی بات درمیان میں روک کر اس نے استفہامیہ اس کو دیکھا جواباً وہ نظر چرا گئی۔

کیونکہ یہ سچ ہی تھا اپنی خودغرضی میں وہ اس حد تک ڈوبی ہوئی تھی کہ آج تک اس طرف اس کی توجہ گئی ہی نہیں تھی، کلثوم مزید گویا ہوئی۔

"میرا احسان باہر ہوتا ہے دو مہینے سے وہ یہاں آیا ہوا ہے اس کے جانے میں مزید ایک مہینہ باقی ہے میں چاہتی ہوں اس بار اس کی شادی کر دوں وہ وہاں اکیلا ہوتا ہے ٹھیک طرح اپنا خیال بھی نہیں رکھ پاتا، بس اسی لئے میں نے سوچا ہے اس کی شادی کر دوں اس کی دلہن کے ساتھ بھیجوں، بیوی ساتھ ہوگی تو میں مطمئن ہو جاؤں گی کہ وہاں اسے گھر کا سا سکون میسر ہوگا،

اب مجھے لڑکی تلاش تھی ملنے کو اور بھی بہت سی لڑکیاں مل سکتی تھیں مگر فوزیہ میں اور لڑکیوں کی گارنٹی نہیں دے سکتی کہ وہ وہاں جا کر ہمارے بیٹے کو بھی ہم سے دور کر دے وہ ہمیں بھول ہی جائے پیسے وغیرہ بھیجنا بند کر دے، بس اسی لئے میں نے اور کسی لڑکی کا سوچا ہی نہیں میرے ذہن میں عائزہ کی صورت اتر آئی عائزہ محنتی بچی ہے گھر کو سنبھالا ہوا ہے اگر اس کی احسان سے شادی ہو جاتی ہے تو وہ احسان کے ساتھ باہر چلی جائے گی وہاں عورتیں بھی کام کرتیں ہیں، احسان کی طرف سے کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی، عائزہ وہاں نوکری کر لے گی بدلے میں جو تنخواہ ہوگی تم لوگوں کو بھجوا دے گی، تم لوگوں کو بھی فائدہ ہو جائے گا حالات سدھر جائیں گے، بس عائزہ کو احسان کا خیال رکھنا ہوگا، باقی جو بھی وہ کرنا چاہے گی کر سکے گی۔" انہوں نے بڑی تفصیل سے اپنی بات اسے سمجھائی تھی، فوزیہ جو خاموشی سے اسے سن رہی تھی اس کے چپ ہونے پر بولی۔

"احسان کی بیوی ہونے کے ناطے اس کا خیال رکھنا تو عائزہ کا فرض ہوگا، اس بات کی فکر نہیں ہے مجھے، مگر تمہاری دوسری بات میرے دل کو لگی ہے۔"

"عائزہ اتنی محنت کر کے یہاں سات ہزار کماتی ہے اتنی ہی محنت وہاں کرے گی تو لاکھوں کمائے گی۔" اس کی آنکھوں میں بڑی معنی خیز سی چمک ابھری تھی، کلثوم مسکرا دی۔

وہ اچھی طرح فوزیہ کی فطرت جانتی تھی، اسی لئے اس نے اپنی بات اس انداز میں اس کے سامنے رکھی تا کہ وہ اس کی بات پوری طرح سمجھ کر اس سے متفق ہو جائے۔

"اگر اس نے پیسوں کے لالچ میں اب تک عائزہ کی شادی نہیں کی تھی تو پیسوں ہی کے

لالچ میں وہ اس کی شادی کر بھی سکتی تھی۔"
کلثوم کی بات میں کافی دم تھا، فوزیہ پوری طرح اس سے متفق ہوتی نظر آ رہی تھی، جب سامنے کے کمرے سے کمال کھانستا ہوا باہر نکلا۔
"کون آیا ہے؟"
"کلثوم ہے میری تایا زاد بہن۔" اس نے اونچی آواز میں بتایا، کمال ان کے قریب آ گیا۔
"السلام علیکم بھائی!" کلثوم نے فوراً سلام کیا تھا۔
"وعلیکم السلام بہن کیسی ہو؟" کمال نے فوزیہ کے برابر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
"میں ایک دم ٹھیک ہوں۔" اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بتایا۔
"آج ادھر کیسے آنا ہوا؟"
"یہ عائزہ کے رشتے کے لئے آئی ہے۔" جواب فوزیہ کی طرف سے آیا تھا۔
"عائزہ کے لئے؟" وہ حیرت سے پورے کا پورا فوزیہ کی طرف مڑ گئے۔
"ہاں۔" پھر فوزیہ نے کلثوم کی پوری بات ان کے گوش گزار کی کمال ایک دم سوچ میں پڑ گئے۔
"کیا یہ ٹھیک ہو گا؟" انہوں نے کلثوم کی طرف نظر کی تھی۔
"ہاں بھائی مجھے پورا یقین ہے انشاء اللہ یہ ہمارے حق میں اچھا ہو گا، میں نے بہت سوچ سمجھ کر عائزہ کا انتخاب کیا ہے۔"
"آپ لوگوں کو کوئی اعتراض ہو تو بتائیں۔" وہ تیر پھینک چکی تھی جو پہلے ہی نشانے پر لگ چکا تھا مگر پھر بھی کمان ان کے ہاتھ میں پکڑا دی۔
"اعتراض تو کوئی نہیں، مگر پتا نہیں عائزہ راضی ہو گی بھی یا نہیں۔" کمال نے ہلکا سا اعتراض کیا تھا۔
"کیوں راضی نہیں ہو گی، وہ ضرور راضی ہو گی میں منا لوں گی اسے۔" فوزیہ نے فوراً ان کا اعتراض رد کیا تھا۔
"ہاں آپ لوگ عائزہ سے معلوم کر لیں، احسان کے جانے میں ایک مہینہ باقی ہے، ہمیں پہلے نکاح کرنا ہو گا، پھر عائزہ کا ویزہ وغیرہ کا کام ہونے میں ہی یہ مہینہ لگ جائے گا تو وہ احسان کے ساتھ باہر چلی جائے گی۔" کلثوم نے ایک بار پھر انہیں مستقبل کا خواب دکھایا تھا۔
"ہاں ہاں کیوں نہیں میں آج ہی عائزہ سے پوچھوں گی وہ انکار نہیں کرے گی تم بس ہاں ہی سمجھو۔" فوزیہ نے اپنی طرف سے حامی بھر لی۔
"شکریہ فوزیہ، تم پھر بھی عائزہ کی مرضی جان لو، میں پھر آؤں گی، ابھی میں چلتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
"کچھ کھا تو لیتی۔" فوزیہ کو اخلاق میزبانی نبھانا پھر سے یاد آیا تھا۔
"رہنے دو پھر کبھی صحیح ابھی ڈرائیور باہر کھڑا ہے میں چلتی ہوں۔" وہ الوداعی سلام کرتی مڑی اور واپسی کے لئے نکل گئی۔
جبکہ فوزیہ اور کمال اس رشتے کے متعلق گفتگو کرنے لگے، کلثوم کی آفر ان کے دل کو لگی تھی، روشن مستقبل ان کی نظروں کے سامنے گھومنے لگا تھا، وہ اس رشتے سے مکمل متفق تھے اور عائزہ کو بھی راضی کر لینے کا خیال رکھتے تھے۔

☆☆☆

آج اس کے سکول میں پہلا پیپر تھا جس کی وجہ سے وہ آج معمول سے تھوڑا لیٹ گھر لوٹی تھی، جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوئی اس کی نظر منتظر بیٹھی فوزیہ کی طرف اٹھی۔
فوزیہ کے چہرے پر بڑی واضح خوشی کی

چمک اور بے چینی نمایاں تھی، وہ شدید تھکی ہوئی تھی مگر پھر بھی مسکرا کر ان سے بولی۔

''کیا بات ہے اماں بہت خوش دکھائی دے رہی ہیں۔'' کتابیں برابر میں رکھتی وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔

''ہاں آج اماں کی لاٹری نکل آئی ہے۔'' سعدیہ ہنستی ہوئی کچن سے برآمد ہوئی اس کے پیچھے ثمن پانی کا گلاس لئے آ رہی تھی۔

''اچھا وہ کیسے؟'' اس نے معاملے میں دلچسپی ظاہر کی۔

ثمن نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا جبکہ سعدیہ سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئی، اس نے خاموشی سے گلاس پکڑا تو ثمن بھی سعدیہ کے برابر جا بیٹھی۔

''آپ کے لئے بڑا زبردست پرپوزل آیا ہے۔'' سعدیہ نے خوشی سے بتایا، پانی کا گھونٹ اس کے حلق میں پھنس گیا۔

''پرپوزل...... میرے لئے؟'' اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں بالکل۔'' فوزیہ جوش سے کہتی اسے تفصیل سے بتانے لگی۔

''وہ تمہاری کلثوم خالہ ہے ناں جس کا بڑا بیٹا باہر ہوتا ہے وہ ہی کلثوم اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آئی تھی۔''

''احسان کا رشتہ میرے لئے؟'' اس نے بھنویں سکیڑ کر پوچھا، اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا اس اچانک ملنے والی خبر پر کیا ردعمل ظاہر کرے۔

''تمہیں یقین کیوں نہیں آ رہا عائزہ تم کسی سے کم ہو کیا؟'' فوزیہ نے کہا۔

''ہاں...... نہیں تو اماں مگر مجھے شادی نہیں کرنی۔'' جب اسے کچھ نہیں سوجھا تو انکار کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اتنے اچھے رشتے سے انکار کر رہی ہو تم؟'' فوزیہ کو جیسے شاک لگا۔

''ہاں اماں۔'' اس نے جھک کر کتابیں اور پیپر اٹھائے اور جانے کے لئے آگے بڑھ گئی، پھر ذرا سا گردن موڑ کر ان سے بولی۔

''اور نہ ہی میرے حالات مجھے شادی کی اجازت دیتے اور سچ تو یہ ہے میں نے کبھی شادی کا سوچا ہی نہیں ہے، میرے اوپر اتنے فرض ہیں اس زندگی میں وہ پورے ہو جائیں میرے لئے یہی بہت ہوگا۔'' پھر ان کو سنے بنا وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔

اس کی ساکن زندگی میں کسی نے پتھر مار کر ہلچل پیدا کرنے کی کوشش کی تھی یہی وجہ تھی اس ہلچل نے اس کو ڈسٹرب کیا تھا، مگر وہ اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں کو کس طرح بھول سکتی تھی، سو اس نے انکار کر کے اس پتھر کو واپس پھینکنے کی کوشش کی تھی۔

کتابیں اور پیپر بک ریک میں رکھ کر وہ چادر بچھے پلنگ پر آ بیٹھی فوزیہ اس کے پیچھے کمرے میں چلی آئی۔

''اماں کیا ہوا؟'' انہیں دیکھ کر اس نے انجان بننے کی کوشش کی۔

''میں تمہیں اس رشتے سے انکار کرنے نہیں دوں گی۔'' اس کا انداز حتمی تھا۔

''اماں میں آپ کو اتنی خود غرض نظر آتی ہوں، شادی کر کے میں اپنی زندگی میں مگن ہو جاؤں اور پھر یہاں آپ سب کا کیا ہوگا؟ ابھی معید پڑھ رہا ہے سعدیہ، ثمن، صدف میں سے کوئی بھی گھر سنبھالنے کے لائق نہیں ہوا ہے آپ کیوں یہ سب بھول رہی ہیں۔'' وہ ان کی ایک ہی تکرار سے زچ ہو گئی تھی۔

''میری بچی ایسے نہ کرنے کو تمہیں کون کہہ

رہا ہے؟'' فوزیہ اس کے برابر میں آ بیٹھی۔

''تو پھر۔'' وہ استفہامیہ ان کو دیکھنے لگی۔

''کلثوم کا کہنا ہے جو تم شادی کر کے احسان کے ساتھ باہر چلی جاؤ گی وہاں تم احسان کا خیال رکھنا وہ نوکری پر چلا جائے تو تم خود بھی نوکری پر جا سکتی ہو، یہاں تم سات ہزار کما رہی ہو وہاں تم لاکھوں کماؤ گی وہ پیسے تم ہمیں بھیج سکتی ہو تم پہ کوئی پابندی نہیں ہوگی، سوچو تم اتنی رقم کماؤ گی تو ہماری زندگیاں کتنی بدل جائیں گی، یہ ترس ترس کے جینا ختم ہو جائے گا بیٹی، تمہارا ایک فیصلہ ہم سب کی زندگی سدھار دے گا۔'' فوزیہ نے اسے سمجھانا چاہا۔

''اماں وہاں کے لاکھوں سے اچھے یہاں کے سات ہزار ہیں میں آپ لوگوں کے ساتھ ہوتی ہوں اور وہاں جا کر کیا ہوگا یہ آپ خود بھی سوچ سکتی ہیں۔'' وہ ابھی بھی ماننے کو تیار نہیں تھی۔

''تو کیا ہوا ہمارا ایک ساتھ رہنا لازمی تو نہیں ہے آج نہیں تو کل تمہیں شادی کر کے یہاں سے چلے ہی جانا ہے تو اب کیوں نہیں۔'' انہوں نے ابھی بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔

''اماں مجھے پھر بھی شادی نہیں کرنی ہے بس میرے بہن بھائی کسی قابل ہو جائیں ان کی شادیاں کر دوں گی، میرے لئے یہی بہت ہو گا۔'' اس نے قطعی انداز میں کہا اور کپڑے تبدیل کرنے واش روم میں چلی گئی۔

فوزیہ کچھ دیر تو بیٹھی رہی پھر بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کر وہاں سے اپنے کمرے میں آ گئی، وہ کپڑے بدل کر باہر آئی تو کمرہ خالی تھا وہ سکون کا سانس لیتی سونے کے لئے لیٹ گئی، یہ اس کا معمول تھا سکول سے آ کر تھوڑی سی نیند لیتی پھر رات کا کھانا بناتی سکول کا کوئی کام ہوتا تو اسے مکمل کرتی، سکول سے واپسی پر وہ بہت تھکن اور نیند محسوس کر رہی تھی مگر اس وقت لاکھ کوشش کرنے پر بھی نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی ایک دم ہی اس کی نیند ختم ہو گئی تھی، زبردستی کرنے پر سر میں درد ہونے لگا تو اٹھ بیٹھی۔

''پتا نہیں کیا مصیبت ہے اچھی بھلی گزر رہی تھی، یہ کلثوم خالہ کہاں سے ٹپک پڑی۔'' وہ جھنجھلا گئی۔

کافی دیر خالی ذہن بیٹھی یونہی سوچتی رہی پھر اٹھ کر باہر آ گئی، صحن میں کوئی بھی نہیں تھا وہ اماں، ابا کے کمرے میں چلی آئی، اس وقت سب وہاں موجود تھے، اس نے ایک نظر سب پر ڈالی۔

فوزیہ ذرا غصے میں دکھائی دے رہی تھی جبکہ اس کے بہن، بھائی بہت زیادہ خوش دکھائی دے رہے تھے، معید کی نظر اس پر پڑی تو تیزی سے اس کے پاس آیا۔

''آپی آپ باہر جا کر اپنی پہلی تنخواہ میں سے مجھے لیپ ٹاپ بھیجنا میرے ہر دوست کے پاس لیپ ٹاپ ہے بس میرے ہی پاس نہیں ہے۔'' ایک حسرت تھی جو اس کے انداز سے عیاں ہو رہی تھی۔

''اور مجھے پیسے بھیجنا ڈھیر سارے، میں بہت اچھے کالج میں داخلہ لوں گی پھر بڑی ڈاکٹر بنوں گی، آپ کی خواہش یہی ہے ناں؟'' سعدیہ کہاں پیچھے رہنے والی تھی۔

وہ ابھی بھی اپنی اوقات سے بڑھ کر ان کے لئے محنت کر رہی تھی مگر پھر بھی ان کی وہی نا تمام خواہشات، وہ ایک دم تھکنے لگی، ثمن اور صدف بھی اپنی فرمائشیں نوٹ کروا رہی تھیں۔

اس نے ان سب کو غور سے بہت غور سے سنا تھا، پھر ایک نظر اپنے ماں باپ کی طرف کی، کمال انہیں سنتے ہوئے مسکرا رہے تھے جبکہ فوزیہ

خاموش تھی، اس نے پھر ایک نظر اپنے بہن بھائیوں کی طرف کی، دبا دبا جوش، خواہشات کی تکمیل کی آس اور نجانے کس بات کی خوشی اس کے دور چلے جانے کا دکھ تو ان میں سے کسی کے بھی چہرے پر دیکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''میں ساتھ رہوں یا نا رہوں ان کے شوق ان کی خواہشات ان کی آرزوئیں پوری ہو جائیں بس، تو پھر میں کیوں ان کی آرزوؤں کی تکمیل میں رکاوٹ بنوں؟''

''جب مجھے یہاں بھی یہی سب کرنا ہے تو وہاں کیوں نہیں۔'' اس کے ارادے بدلنے لگے۔

''مگر اپنے پیاروں کی یاد، ان کا ساتھ؟'' اس کے دل نے دوہائی دی تھی۔

''تو کیا ہوا وہ تو وہاں بھی ساتھ ہوگا۔'' اس نے دل کو جھڑک دیا، دل خاموش ہو گیا ایکدم چپ، بہت غور کرنے پر محسوس ہوا یہ دھڑک رہا ہے، مدھم مدھم، سست، رکا رکا سا، اسی کا ارادہ پختگی کی منزل پہ آن پہنچا، اس نے ایک آخری نظر ان کے چہروں پر ڈالی۔

کیا پتا کہیں کچھ ویسا مل جائے جس کی اسے چاہ تھی، مگر ایسا ہوا ہی نہیں وہ افسردہ ہونے لگی تھی جب اس کے فرائض بھرے احساسات نے اسے ہمت بخشی۔

''تم ہار نہیں سکتی۔'' وہ لب بھینچ کر مسکرا دی، نظریں جھکائے اس نے خود کو کہتے سنا۔

''میں اس شادی کے لئے تیار ہوں۔'' وہ مڑی اور کمرے سے جانے لگی، اس نے دوبارہ مڑ کر ان کے چہروں کو نہیں دیکھا تھا جانتی تھی اب وہاں کیا ہوگا؟

خوشی اور بے تحاشا خوشی؟ اور واقعی اس کے اقرار نے ان کے دل خوشی سے بھر دیئے تھے، تیاری کے نام پر ان کے پاس کیا تھا؟ کچھ بھی نہیں اور پھر کلثوم نے کچھ بھی کرنے سے منع کیا تھا۔

ان کے گھر میں ایک دم ہی خوشیاں اس طرح برسی تھی کہ ان سے سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی، شوق کا یہ عالم تھا کہ وہ یہ خبر سب کو سنانے کو بے چین ہو گئے۔

☆☆☆

وہ جس جگہ رہتے تھے وہ ایسا علاقہ تھا جن میں گھر اور لوگ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے، ذرا جو کچھ ہوتا خبر سب تک پہنچ جاتی، فوزیہ نے خوشی سے معمور لہجے میں عائزہ کی اچانک چمک اٹھنے والی قسمت کی خبر ساتھ والی ہمسائی کو دی تھی، آس پڑوس کے لوگوں نے جیسے ہی سنا ان کی خوشی میں شامل ہونے کے لئے مبارک باد دینے چلے آئے، وہ سب عائزہ کی قسمت پر رشک کر رہے تھے، کچھ نے تو یہاں تک کہہ ڈالا۔

''کاش عائزہ جیسی قسمت ہر لڑکی کو ملے۔''

بے وقوف لوگ بنا سوچے سمجھے کچھ بھی مانگ لیتے ہیں کسی بھی چیز کی فرمائش کر دیتے ہیں، ذرا سا کسی کو عروج پر جاتا دیکھ کر جھٹ سے خود بھی اس بلندی تک پہنچنے کی دعائیں کرنے لگتے ہیں، یہ جانے بنا آگے یہ عروج عروج ہی رہے گا؟ یا بدترین زوال ثابت ہوگا۔

نتائج سے بے خبر انہوں نے خواہش کی فوزیہ کا سینہ فخر سے کچھ اور پھول گیا، آخر کو عائزہ اس کی بیٹی تھی اور جب یہ خبر عائزہ کی بیسٹ فرینڈ آسیہ تک پہنچی تو وہ گویا اڑتی ہوئی عائزہ کے پاس پہنچی تھی۔

''عائزہ یہ میں کیا سن رہی ہوں؟''

''کیا سن لیا تم نے؟'' سر جھکائے پیپر چیک

کرتی وہ حد درجہ انجان بنی تھی۔
''تم تو جیسے جانتی ہی نہیں ہو ناں۔'' وہ جھنجھلا گئی۔
''تو تم بتا دو۔'' اب کہ اس نے سر اٹھا کر اس کو دیکھا تھا۔
''تم شادی کر رہی ہو؟'' اس نے پوچھا۔
''ہاں۔'' اس نے اقرار میں سر ہلایا۔
''اور شادی کر کے اتنی دور چلی جاؤ گی، تمہیں پتا بھی ہے وہ لڑکا کہاں رہتا ہے، کس ملک میں؟'' وہ اشتیاق بھرے انداز میں بولتی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔
''ہاں یہ تو معلوم ہے شادی کر کے دور چلی جاؤں گی مگر یہ نہیں معلوم کہاں جاؤں گی؟'' اس کا اطمینان ہنوز برقرار تھا۔
''تم نے پوچھا نہیں؟''
''نہیں تو اور ویسے بھی اس سے کیا فرق پڑتا ہے میں کہیں بھی جاؤں اب جانا تو ہے ناں۔'' بڑا سکون بھرا جواب ملا تھا لگتا تھا اس نے خود کو مضبوط کر لیا ہے۔
''ہاں یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔'' آسیہ نے اقرار میں سر ہلایا پھر مزید بولی۔
''خالہ بتا رہی تھی تم وہاں جا کر بھی نوکری کرو گی لاکھوں روپے کماؤ گی۔'' عائزہ کے لبوں پہ بے ساختہ مسکراہٹ رینگی تھی، عجیب سی مسکراہٹ۔
''پیسہ اور بس پیسہ، انسان کا اس کے جذبات کا تو جیسے کوئی مول ہی نہیں تھا۔''
''ہاں ارادہ تو یہی ہے۔'' اس نے دوبارہ نظریں پیپرز پر مرکوز کر دی۔
''اچھا تو پھر مجھے کیا بھیجو گی؟'' اس کے سوال پر عائزہ نے ایکدم چونک کر نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تھا، اس کے دل کو گہرا دھچکا لگا تھا، آنکھوں کی سطح پر یکدم نمی جھلملائی تھی۔
کوئی ایک تو ایسا ہوتا جسے میرا دور چلے جانا سوہان روح لگتا، اس نے سوچا تھا کوئی اور نہ صحیح آسیہ جب اس کے دور جانے کی خبر سنے گی تو اس سے لڑے گی، اس کی منت کرے گی۔
''مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔'' مگر ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا، لب بھینچ کر اس نے اسے دیکھا تھا۔
''تم بھی آسیہ، تم تو میری بیسٹ فرینڈ تھی تمہیں تو مجھ سے دوری کا احساس ہونا چاہیے تھا۔'' وہ صرف سوچ کر رہ گئی، درد کی ٹیسوں کو ایک دکھی مسکراہٹ میں سمیٹے اس نے کہا۔
''جو تم کہو گی وہی بھیجوں گی۔''
''اوہ تم واقعی میری اچھی دوست ہو۔'' وہ خوشی سے اس سے لپٹ گئی تھی، کلثوم خالہ نے ایک مہینے کا وقت دیا تھا۔
''چلو مجھ سے نہ صحیح میری ذات سے کسی کو خوشی مل جائے یہ بھی بہت ہے۔'' گہری سانس ہوا کے سپرد کرتی وہ اس کی فرمائشوں کو سننے لگی۔

☆☆☆

دو دن بعد انتہائی سادگی کے ساتھ اس کا نکاح ہوا تھا۔
بڑا ہی عجیب ملن تھا سب کے دل تو خوش تھے مگر خوشی کا کوئی سماع نہ تھا، نہ تو اس کے ہاتھوں پر مہندی لگی تھی نہ ہی اس نے سہاگ کے نام کا جوڑا پہنا تھا بنا کسی ہار سنگھار کے وہ عائزہ کمال سے عائزہ احسان ہو گئی۔
مہمانوں کے نام پر اس کے محلے کے چند لوگ اور کلثوم خالہ کے ہمراہ آئی اس کی فیملی شامل تھی جن کی خاطر تواضع کے لئے زیادہ تکلف کرنے کی بجائے چائے اور مٹھائی پر اکتفا کیا گیا تھا، نکاح کی رسم کے بعد سب کچھ معمول پر آ

گیا۔
ابھی اس کے بعد تھوڑے دن باقی تھے یہ دن گھر میں بیٹھ کر گزارنے کے بجائے اس نے سکول جاری رکھا تھا، عام سی روٹین کے ساتھ یہ دن بھی گزر گئے، اب اس کے جانے میں دو دن رہ گئے تھے جب فوزیہ نے اس کے لئے بنائے چند نئے جوڑے اور مختلف ضروریات کی اشیاء بیگ میں ڈال کر اس کی پیکنگ مکمل کی تھی۔
آخری دن وہ اپنی فیملی کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی، اس نے سکول سے ریزائن کر دیا تھا، اس کے دل کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی، سب کے درمیان بیٹھی بس انہیں دیکھے جاتی تو کبھی اونچی اونچی آواز میں بولنے لگ جاتی، فرمائش کر کے اس نے اپنا من پسند کھانا بنوایا اور جب کھانے بیٹھی تو ایک لقمہ بھی حلق سے نہ اتارا گیا، بالآخر کھانا جوں کا توں چھوڑ کر وہ وہاں سے اٹھ گئی، وقت رخصت احسان اور کلثوم اسے لینے آن پہنچے تھے، آج اس کے وداع کا دن تھا، کافی لوگ اس سے ملنے آئے تھے مگر اس وقت وہ اس قدر غائب دماغ تھی کہ ڈھنگ سے ان سے مل بھی نہ سکی، آخر میں اپنے ماں باپ بہن بھائیوں سے ملتی وہ کافی دلگیر ہو رہی تھی۔
لاکھ ضبط کے باوجود بھی اس کی آنکھوں سے چند آنسو پلکوں کا بند توڑ کر باہر نکلے تھے، جنہیں سر جھکا کر اس نے اپنے پلو میں جذب کر لیا۔
دروازے تک پہنچ کر اس نے پلٹ کر ذرا دور کھڑے اپنے پیاروں پر نظر کی تھی، سب کے چہروں پر جگمگاتی خوشی دیکھ کر وہ خود بھی مسکرا دی۔
''انہی کی خوشی میں تو میری خوشی ہے۔'' ان سب کو خدا کے حوالے کرتی وہ دروازہ پار کر گئی۔
کلثوم خالہ کی فرمائش تھی ائیرپورٹ پر زیادہ رش نہ ہو اسی وجہ سے اس کی فیملی کا کوئی فرد اسے الوداع کرنے ائیرپورٹ نہیں آیا تھا، گاڑی میں اس وقت اس کے علاوہ احسان، کلثوم خالہ اور احسان سے چھوٹا اس کا بھائی موجود تھا، باقی کا سارا وقت اس نے خاموش سامع بنے گزارا، اور جب ان کی فلائیٹ کی اناؤنسمنٹ ہونے لگی تو اس نے احسان کے ہمراہ اپنی ساس سے الوداعی دعائیں سمیٹی اور اپنی منزل کی طرف آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

جہاز جیسے جیسے بلندی کی طرف بڑھ رہا تھا اس کے خوف میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا ڈر کے مارے اس نے آنکھیں سختی سے میچ رکھی تھی، جہاز نے ایکدم جھٹکا کھایا اور انتہائی بلندی پر پہنچ کر سیدھا ہو گیا، ایکدم جھٹکا لگنے کی وجہ سے اس نے ساتھ بیٹھے احسان کا بازو زور سے پکڑ لیا۔
وہ اس کی نئی نویلی دلہن تھی اسے خود اس کا ساتھ دینا چاہیے تھا، مگر یہاں حال یہ تھا اس کا ساتھ مانگنے کو اس نے خود ہاتھ بڑھایا تھا، مگر دوسری طرف سے نہ تو کوئی میٹھا جملہ سننے کو ملا تھا نہ کوئی شوخ شرارت ہوئی تھی اور نہ ہی اپنے ساتھ کا احساس دلانے کو دلاسہ دینے کو اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا تھا، اس نے حیران ہو کر اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔
جھکی نظروں سے اس نے اپنے برابر بیٹھے احسان کو دیکھا، وہ اس کی طرف مکمل بے نیاز سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے آنکھیں بند کیے شاید سو رہا تھا، اسے تسلی ہوئی۔
''سو رہے ہیں۔'' اب کی بار اس نے ذرا سا مڑ کر نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔
سینے پر ہاتھ باندھے آنکھیں بند کیے احسان واقعی سوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، اس نے گہری نظر سے اس کا جائزہ لیا۔

بلیو جینز پر بلیک شرٹ پہنے سفید رنگت کا مالک احسان اتنا وجیہہ تو تھا کہ کوئی بھی لڑکی اس کے ساتھ کی تمنا کرے اور یہ پیارا سا شخص بن مانگے میری قسمت نے مجھے دے دیا۔

وہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہی تھی، یہ اس کی نظروں کا ارتکاز تھا یا احسان سویا ہوا نہیں تھا اس نے بند آنکھیں کھول کر بڑی خاموش نظر اس کی نذر کی تھی، وہ گڑبڑا کر قدرے کنفیوز ہوتی سیدھی ہو گئی، دل ایکدم ہی دھڑکا تھا۔

''کیا یہ جاگ رہے تھے؟''

''تو پھر مجھ سے انجان کیوں بنے ہوئے تھے؟'' وہ الجھن کا شکار ہونے لگی تھی، مگر اس سے پوچھنے کی ہمت نہ کر سکی، باقی کا سارا سفر انہوں نے اسی خاموش کیفیت میں گزارا تھا، ایک کے سامنے سوچوں کا انبار لگا ہوا تھا تو دوسرا اس سے مکمل بے نیاز دکھائی دے رہا تھا۔

سفر تمام ہوا اور جہاز لندن ایئرپورٹ پر لینڈ کر گیا۔

احسان نے ایئرپورٹ سے باہر آکر ٹیکسی ہائر کی اور ایک بار پھر سفر شروع ہو گیا اور اب بھی خاموشی تھی، سفر تمام ہوا تو ٹیکسی ایک بڑے سے گھر کے سامنے رک گئی وہ ان جگہوں سے مکمل انجان تھی اس لئے احسان کی تقلید کر رہی تھی، گھر کا بڑا سا گیٹ کھلا تھا گارڈ کی وردی پہنے کوئی شخص باہر آیا تھا، احسان نے اسے ٹیکسی سے سامان اندر لانے کو کہا اور خود اندر کی طرف قدم بڑھا دیئے، اس نے ایک بار پھر اس کی تقلید کی اور اس کے پیچھے اندر چلی آئی، صاف ستھری سنگ مرمر کی بنی روش سے گزرتے ہوئے اس نے نظر اٹھا کر اپنے اردگرد دیکھا تھا، دائیں طرف چھوٹا مگر کھلا سرسبز لان تھا اس کا دل ایکدم ہی چاہا وہ ننگے پاؤں سرسبز گھاس پر چلے۔

مگر اپنی خواہش کا گلا دباتی اس نے نظر کا زاویہ ہی بدل لیا، احسان ایک بڑے سے ہال کمرے میں داخل ہو چکا تھا، وہ بھی اس کے پیچھے اندر چلی آئی، کمرے میں ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا موجود نہیں تھا، وہ وہیں دروازے کے پاس رک گئی، جبکہ احسان آگے بڑھ کر صوفے پر بیٹھ گیا، کافی دیر وہ اسی طرح کھڑی رہی تھی تب شاید احسان کو اس کے نا ہونے کا احساس ہوا تھا، اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور پہلی بار اس سے مخاطب ہوئے۔

''آپ وہاں کیوں رک گئی ادھر آکر بیٹھیں۔'' اس کی طرح اس کی آواز بھی خوبصورت تھی وہ مرعوب ہوتی آگے بڑھی اور سامنے پڑے صوفے پر ٹک سی گئی۔

''اب رہنا تو یہی تھا پھر یہ تکلف کیسا؟'' اس نے سوچا ضرور تھا مگر اپنی نشست کا انداز تبدیل نہیں کیا تھا۔

وہ نظریں جھکائے اپنے ناخن کھرچ رہی تھی جب اس نے ایک بار پھر احسان کی آواز سنی تھی۔

''میں نہیں جانتا آپ اس شادی کے لئے کیوں تیار ہوئیں، شاید باہر کی دنیا کے چارم نے آپ کو یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کیا ہو، مگر میں نے یہ شادی صرف اور صرف اپنی ماں کی خواہش پر کی ان کو لگتا تھا میں یہاں اکیلا ہوتا ہوں کوئی میرا خیال رکھنے والا نہیں ان کی ممتا بے چین رہتی تھی اسی لئے انہوں نے کہا میں کسی سے شادی کر کے اسے اپنے ساتھ یہاں لے آؤں تاکہ وہ میری طرف سے بے فکر ہو جائیں، میری ماں کا کہا ہر لفظ میرے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے اسی لئے میں اس شادی سے انکار نہیں کر پایا، میں اپنی ماں کو دکھ دینا نہیں چاہتا تھا اسی لئے میں ان کو یہ بھی

نہیں بتا سکا کہ میں یہاں شادی کر چکا ہوں، میری بیوی ہے جو میرا بہت خیال رکھتی ہے، میرے دو بچے ہیں جو مجھے بے حد عزیز ہیں، مگر اس سب کے باوجود بھی ان کے کہنے پر میں آپ سے شادی کے لئے تیار ہو گیا۔'' یہ پہلی بار تھا کہ وہ مسلسل بول رہا تھا درمیان میں وہ ذرا دیر کو رکا تو اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، وہ ایک بار پھر بول رہا تھا اس کی نظریں اس کے ہلتے لبوں پر ٹھہر سی گئی۔

''حسین لوگ سفاک بھی ہوتے ہیں اس کو یہ اندازہ آج ہوا تھا۔''

اسے اپنوں سے اتنی دور لا کر وہ اسے حقیقت سے اب آگاہ کر رہا تھا۔

''امی نے بتایا تھا آپ مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتی ہیں اور یہاں نوکری کرنا چاہتی ہیں، جیسے بھی صحیح مگر اب آپ میری زندگی میں داخل ہو چکی ہیں میں آپ کے ساتھ مزید کوئی ظلم کرنا نہیں چاہتا، (اس سے زیادہ ظلم اور ہو بھی کیا سکتا تھا)۔'' وہ دم سادھے انکشافات کی زد میں تھی۔

وہ اپنی ایک الگ خوشحال فیملی رکھتا تھا اس کی ضرورت تو تھی ہی نہیں پھر وہ یہاں کیا کرے گی؟ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان اس کے سامنے کھڑا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

''شاید زندگی شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئی۔'' وہ مزید بھی کچھ کہہ رہا تھا اس نے ایک بار پھر اپنی توجہ اس کی جانب مبذول کی۔

''میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ بہت خوش ہوں میری بیوی مجھ سے بہت محبت کرتی ہے، میں آپ کے اور اپنے رشتے کے متعلق ہرگز اسے کچھ نہیں بتاؤں گا۔''

''آپ اپنی الگ زندگی گزار سکتی ہیں آپ چاہیں گی تو میں آپ کو طلاق دینے کو تیار ہوں، آپ بھی کسی مسلم لڑکے سے شادی کر لینا۔''

''نہیں نہیں۔'' اس کی بات کاٹتے ہوئے وہ درمیان میں تیزی سے بولی تھی۔

''مجھے طلاق مت دیں، اگر آپ کسی کو بتانا نہیں چاہتے میں آپ کی بیوی ہوں تو بے شک مت بتائیں مگر مجھے یہاں سات سمندر دور لا کر یوں اکیلا مت کریں، مجھے آپ سے اور کچھ بھی نہیں چاہیے مگر پلیز مجھے طلاق مت دیں۔'' وہ ملتجی ہوئی تھی۔

''او کے۔'' اس نے کندھے اچکا دیئے۔

''جیسے آپ کی مرضی مگر میں آپ کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا میں اپنی بیوی کو اطلاع دیئے بنا ایک دن پہلے آیا ہوں وہ اپنی مدر کی طرف گئی ہوئی ہیں میں نے جان بوجھ کر انہیں اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی وہ بھی بس اس لئے تاکہ یہاں آپ کو تمام حقیقت سے آگاہ کر سکوں اسی طرح نہ آپ کو پرابلم ہو گی نہ مجھے، میں ان کے سامنے آپ کو اپنی کزن کہہ کر متعارف کرواؤں گا جو یہاں نوکری کی غرض سے آئی ہے، آپ کی رہائش کا بندوبست میں کل تک کر دوں گا، کسی جاب کا انتظام بھی کر دیا جائے گا، بس میں آپ کی اتنی مدد کر سکتا ہوں اس سے زیادہ نہ میں کچھ کر سکتا ہوں اور نہ ہی آپ مجھ سے امید رکھیے گا، پھر اب آپ جیسا چاہے ویسے زندگی گزاریں میری طرف سے کوئی روک ٹوک نہیں ہو گی۔''

اس نے بڑی صفائی سے اسے اس کی اوقات یاد دلا دی تھی، اس وقت اسے کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا، نہ کوئی دکھ، نہ کسی زیادتی کا احساس؟ اس کے ہلتے لب بند ہو چکے تھے، اس نے نظر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

''وہ اسے پہلے سے کہیں زیادہ دور محسوس ہوا تھا۔''

"یہ میرا تھا ہی کب؟"
کچھ دیر پہلے اسے اپنی قسمت سمجھنے والی سوچ پر وہ دل ہی دل میں ہنس دی، اس کے ساتھ ظلم تو ہوا تھا مگر اس کے باوجود وہ اس کی اس قدر نوازشوں پر اس کی شکر گزار ہو رہی تھی۔
وہ اس کی رہائش کا اس کی نوکری کا بندوبست کر رہا تھا، اس کو یہی بہت کچھ محسوس ہو رہا تھا، اس نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا جس پر اس نے ہلکی سی تکلف بھری مسکراہٹ اس کی نذر کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔
"آپ آج کا دن یہاں گزار سکتی ہیں۔"
ایک اور مہربانی کرتا وہ مڑا اور باہر نکل گیا، وہ ابھی تک اسی انداز میں بیٹھی تھی۔
"اگر یہ یہاں لا کر مجھے طلاق دے کر گھر کے باہر دربدر رلنے کو چھوڑ دیتا تو میں کہاں جاتی؟" ایک خوفناک سوچ نے اس کا دل دہلایا تھا۔
ایک بار پھر اس نے ممنون نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا جہاں سے کچھ دیر پہلے احسان باہر گیا تھا۔
خود کو دھوکہ دینے والے شخص کی ممنون ہوتی وہ بھول رہی تھی ایک ذات خدا کی بھی ہے جو کبھی اپنے بندوں کو اکیلا نہیں چھوڑتا، احسان کی اس قدر نوازشوں میں نجانے خدا کی کیا مصلحت پوشیدہ تھی؟

☆☆☆

آج اسے اپنوں سے دور ہوئے تیسرا دن تھا جبکہ یہاں ان بے مہر لوگوں کے درمیان اس کی پہلی صبح تھی، رات سوچوں کے درمیان پوری رات جاگتے گزری تھی دن کی پہلی کرن پھوٹنے لگی تو نیند اس پر مہربان ہو گئی تھی یہی وجہ تھی وہ دن چڑھے تک سوتی رہی، اب جب آنکھ کھلی تو دھوپ کی تیز کرنیں ونڈو سے اندر آ کر کمرے کو مزید روشن کر رہی تھی، ایکدم آنکھ کھلنے پر پہلے تو اسے سمجھ ہی نہیں آیا وہ کہاں ہے کچھ دیر وہ اسی طرح ساکت وصامت پڑی رہی پھر جب تمام حسیں بیدار ہوئیں تو وہ ایکدم تیزی سے اٹھ بیٹھی، اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی وہ پشیمان ہوئی تھی۔
پہلے ہی دن اس قدر سوئی، مگر یہاں پروا کسے تھی، اس نے گردن موڑ کر دیکھا اس کا بیگ وہیں پڑا تھا جہاں کل اس نے رکھا تھا، وہ بیڈ سے اتر آئی۔
کل کی نسبت آج باہر سے چہل پہل کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، اس کا مطلب تھا احسان اپنے بیوی بچوں کو لے آیا ہے۔
آنے والے حالات کے لئے چند پل اس نے وہی کھڑے ہو کر کچھ سوچا پھر گہری سانس بھرتی فریش ہونے کے لئے واش روم کی طرف بڑھ گئی، چکنے فرش والا واش روم کسی کمرے کی طرح بڑا روشن اور صاف تھا، اسے اپنے گھر کا تنگ سا واش روم یاد آ گیا، ذہنی رو ایکدم ہی گھر سے گھر والوں کی طرف بہکی تھی، اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔
مگر وہ کیا کر سکتی تھی ابھی تو اس کے پاس گھر والوں سے رابطے کا کوئی بھی ذریعہ نہیں تھا، جب کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا تو پھر اس کے متعلق سوچنے سے کیا حاصل؟ دماغ میں آئی سوچوں کو جھٹکتی وہ دانت صاف کرنے لگی، فریش ہو کر جب وہ واش روم سے باہر آئی کمرہ اب بھی اسی طرح خالی تھا۔
"شاید مجھے یہاں لا کر بھول گئے ہیں۔"
کافی دیر وہ اس امید کے ساتھ وہاں ٹہلتی رہی شاید کسی کو اس کا احساس ہو جائے، مگر انتظار بے

سو در ہا، بھوک نے ستایا تو وہ بے چین ہو گئی کافی دیر خود پر ضبط کیا مگر جب بھوک سے بحال ہونے لگی تو خود دروازہ کھول کر باہر آ گئی، باہر بھی کوئی نظر نہیں آیا۔

''نجانے سب کہاں گئے؟'' وہ اندازے کے مطابق سامنے چلنے لگی۔

''کوئی تو منزل مل ہی جائے گی۔'' کبھی کبھی اندازے بھی درست ثابت ہوتے ہیں اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا، وہ ٹھیک جگہ پہنچی تھی، اندر سے آتی آوازیں کسی کی موجودگی کا احساس دلا رہی تھیں، یہ باورچی خانہ تھا وہ جھجکتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔

اندر احسان اور اس کے ساتھ شاید اس کی بیوی کھڑی تھی، دونوں اس کی طرف پیٹھ موڑے کھڑے تھے، وہ لڑکی شاید کچھ پکا رہی تھی جبکہ احسان پشت پر ہاتھ باندھے اس سے باتیں کر رہا تھا۔

وہ وہیں رک گئی، اسے فوری طور پر کچھ سمجھ نہیں آیا اس پل وہ کیا کرے واپس پلٹ جائے یا انہیں اپنی طرف متوجہ کرے، اسی شش و پنج میں کھڑی وہ انگلیاں مڑور رہی تھی جب احسان کی نظر اس پر پڑی۔

''ارے آپ جاگ گئیں؟'' اس لڑکی نے اسی پل مڑ کر احسان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تھا، احسان اگر حسین تھا تو اس کی بیوی حسین تر تھی۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ کھڑے ایک شاندار پرفیکٹ کپل محسوس ہو رہے تھے، اس کی نظریں احسان کی بیوی پر ٹکی تھی۔

جو اپنے لمبے براؤن بالوں کی چوٹی آگے ڈالے رف سے حلیے میں بھی بہت خاص دیکھائی دے رہی تھی، وہ اس قابل تھی کہ اس کی رفاقت میں کوئی بھی شخص خوشگوار زندگی گزار سکتا تھا، احسان نے جو کہا ٹھیک کہا تھا، وہ ایمان لے آئی۔

''اس قدر خوبصورت بیوی کے ہوتے بھلا میری ضرورت کیا ہو سکتی ہے؟'' اس نے ایکدم اس پر سے نظریں ہٹا لیں۔

''جی۔'' اس نے مختصر جواب دیا تھا۔

''راضیہ یہ ہے میری کزن عائزہ، جس کا میں نے تمہیں بتایا تھا؟'' وہ مسکرا دی ایک خوبصورت سی مسکراہٹ۔

''ہیلو عائزہ ہاؤ آر یو۔'' اس بار اس نے اپنے چند لفظ اس کی نذر کیے، تو وہ بھی ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے مختصراً بولی۔

''فائن۔''

''آپ کو بھوک لگی ہو گی میں نے آپ کے لئے ناشتہ تیار کیا ہوا ہے۔'' شاید احسان نے اس کے متعلق اپنے طریقے سے کافی اچھی طرح سمجھا دیا تھا جب ہی وہ اس سے اس قدر خوش اخلاقی سے پیش آ رہی تھی، اس نے اقرار میں سر ہلا دیا، اسے واقعی سخت بھوک لگ رہی تھی، تب راضیہ نے کچن ٹیبل پر ہی اس کے لئے ناشتہ سرو کر دیا، احسان انہیں اکیلا چھوڑ کر باہر چلا گیا۔

عائزہ نے تھوڑا سا سکون محسوس کیا اور خاموشی سے بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگی، راضیہ پاکستان کے لوگوں کے متعلق گفتگو کرنے کے دوران احسان کی فیملی کے متعلق اس سے سوال کرنے لگی اور ساتھ ساتھ اپنے کام بھی نمٹاتی رہی، اس نے اس کے سوالوں کے مختصر جواب دیئے جہاں احسان کی فیملی کے متعلق سوال شروع ہوئے تو اس نے گول مول جواب دے کر اسے مطمئن کر دیا۔

ناشتے سے فراغت کے بعد وہ کچن سے باہر آئی راضیہ اس کے ہمراہ تھی وہ اسے ساتھ لئے

ٹی وی لاؤنج میں چلی آئی جہاں احسان اپنے بچوں کے ساتھ ویڈیو گیم کھیل رہا تھا، انہیں اندر آتے دیکھ کر وہ سیدھا ہو بیٹھا وہ اور راضیہ ایک ہی صوفے پر بیٹھ گئیں، تب احسان اس سے مخاطب ہوا۔

''عائزہ آپ کی رہائش کا مسئلہ حل کر دیا ہے اسی ایریا میں قریب ہی ایک گھر میں آپ کو اس کی اوپری منزل رینٹ پر لے دی ہے، آپ اس میں آرام سے رہ سکتی ہیں ویسے تو میں خود بھی وہاں کا چکر لگا آیا ہوں وہاں ہر سہولت موجود ہے مگر پھر بھی آپ کو کوئی مسئلہ ہو تو آپ بلا جھجک بتا سکتی ہیں۔''

''جی۔'' وہ مسکرا کر سر جھکا گئی۔

''مسٹر احسان اس اتنے بڑے گھر میں مجھے ایک کونے میں جگہ دے دیتے تو میں وہاں بھی ایڈجسٹ کر لیتی، یہ اتنے تکلف کی کیا ضرورت تھی، مگر شاید ضرورت تھی۔'' وہ خود سے سوالاً جواباً ہوئی تھی، احسان مزید کہہ رہے تھے۔

''اور آپ کے لئے فوری طور پر ایک شاپ پر سیل گرل کی جاب مل سکی ہے آپ کچھ عرصہ وہاں تجربہ کرنا پھر جب آپ ٹھیک طرح سے ایڈجسٹ ہو جائیں گی تو کوئی اور جاب دیکھیں گے۔'' وہ اس کے لئے اتنی سٹرگل کر رہا تھا یا شاید اپنے لئے، مگر جو بھی تھا کم از کم اس کے لئے اچھا تھا، اس دیار غیر میں اس کی جاب کا بندوبست تو ہوا اور پھر اس کا مقصد بھی تو یہی تھا، اس نے احسان کا شکریہ ادا کیا تھا۔

پھر اس نے مزید چند گھنٹے وہاں گزارے تھے پھر احسان اسے اس گھر تک چھوڑنے اس کے ساتھ آیا تھا، یہ ایک چھوٹا سا کشادہ گھر تھا اس ایک کے لئے تو یہ خاصا بڑا تھا، گھر کی لوکیشن کافی اچھی تھی، اس میں دو کمرے، کچن اور واش روم تھے بائیں طرف ایک چھوٹا سا ٹیرس بھی نظر آ رہا تھا، وہ اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں ضروریات زندگی کے لئے استعمال ہونے والا کافی سامان موجود تھا۔

''ایک اور مہربانی؟'' اس نے تشکر بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا مگر وہ اس کی طرف دیکھے بنا اسے بتا رہا تھا۔

''یہ کچھ سامان ہے، اس کے علاوہ کچن کے استعمال کے لئے بھی اشیائے خورد ونوش کے ساتھ ساتھ کچن کا ضروری سامان بھی موجود ہے، جو ایک مہینہ تک آپ کے لئے کافی ہوگا، باقی بعد میں آپ خود دیکھ لیجئے گا۔''

گو کہ وہ اس کی ذمہ داری بس جب تک کہ لئے تھی جب تک وہ خود کمانے کے قابل نہیں ہو جاتی، پہلی تنخواہ ملنے تک کے دنوں کے لئے اس نے اپنی ذمہ داری کو بخوبی نبھانا چاہا تھا اور خوب نبھا بھی رہا تھا۔

وہ خاموش ہی رہی، گھر اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد وہ اسے اس شاپ کو دیکھانے کے لئے لے آیا جہاں اسے کام کرنا تھا، شاپ گھر سے زیادہ دور نہیں نہ تھی، انہوں نے یہ راستہ پیدل طے کیا تھا، عائزہ راستے کو ازبر کرنے کی کوشش میں لگی رہی۔

''آج کے بعد اسے ان راستوں پر تنہا ہی تو چلنا تھا۔''

احسان نے شاپ کے چند اور لوگوں سے اس کا تعارف کرایا تھوڑی بہت جان پہچان کے بعد وہ واپسی کے لئے پلٹ آئے۔

''خاموش راستے، خاموش ہمسفر۔''

ناک کی سیدھ میں خاموش چلنے کے بعد وہ عائزہ کے گھر کے باہر رک گئے آگے کا سفر اسے خود طے کرنا تھا، وہ آگے بڑھ جانا چاہتی تھی جب

احسان نے اسے پکارا۔
''عائزہ یہ سیل فون آپ کے لیے۔'' اس نے پلٹ کر اس کے ہاتھ میں دبے موبائل کو دیکھا پھر اس کی طرف نظر کی ایکدم ہی اس کے لبوں پہ مسکراہٹ در آئی۔
''کیا کہوں تمہیں مسٹر احسان، ظالم مہربان یا معصوم انسان۔''
''مگر جو بھی ہے تم نے اب تک کی اپنی تمام ذمہ داریاں اچھی طرح پوری کر دی۔''
سیل فون اس کی ضرورت تھی، سو اس نے خاموشی سے موبائل اس کے ہاتھ سے لے لیا۔
اب کی بار اس نے شکریہ جیسے لفظ ادا نہیں کیے تھے، آخر یہاں تک شکریہ ادا کرتی وہ اس کی مہربانیوں کے بوجھ تلے دبنے لگی تھی۔
''چلو ایک اور مہربانی سہی۔'' اس پر آخری نظر ڈال کر وہ پلٹی اور گیٹ سے اندر داخل ہو گئی، احسان بھی وہاں سے پلٹ گئے۔
''وقتی طور پر مل جانے والوں کے راستے اب سے جدا جدا تھے۔''

☆☆☆

کمرے میں پہنچ کر سب سے پہلے اس نے احسان کے دیئے موبائل سے اپنے گھر کال کی تھی۔
پہلی ہی بیل پر اس کی کال پک کر لی گئی تھی، اس نے بڑی خوش دلی سے انہیں سلام کیا تھا۔
فوزیہ اس کی آواز سن کر پہلے تو حیران ہوئی اسے یقین کرنا مشکل لگ رہا تھا، عائزہ اتنی دور ہو کر بھی ایکدم ان کے قریب محسوس ہونے لگی تھی۔
''عائزہ تم، تم ٹھیک تو ہو؟''
''وہاں خیریت سے پہنچ گئی، احسان کیسا ہے؟'' انہوں نے ایک سانس میں کئی سوال کر ڈالے تھے۔
اتنی دور پردیس میں اپنے پیاروں کی آواز کس خوشی سے دوچار کرتی ہے اس بات کا اندازہ عائزہ کو اچھی طرح ہو رہا تھا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔
''اماں میں ٹھیک ہوں، تم سب کیسے ہو؟'' اس کی آواز بھرا گئی۔
''ہم سب بھی ٹھیک ہیں، تمہارا گھر کیسا ہے؟'' تیز اونچی آواز میں اشتیاق بھرا تھا۔
''سب اچھا ہے اماں، ابا کیسے ہیں، سعید، سعدیہ، ثمن اور صدف سب کیسے ہیں ان سے میری بات کرواؤ ناں۔'' وہ ایکدم بے چین ہو گئی، اپنوں سے دوری کا احساس حد سے بڑھنے لگا تھا، آنسوؤں کی روانی میں روانی آ گئی تھی۔
''ہاں یہ سب یہاں کھڑے ہیں یہ لو پہلے اپنے ابا سے بات کرو۔'' اس نے موبائل کمال کے ہاتھ میں دیا تھا۔
''کیسی ہے میری بیٹی؟'' کتنی چاشنی بھری تھی ان کے انداز میں اس کا دل کھینچنے لگا۔
''ٹھیک ہوں ابا آپ اپنا خیال رکھتے ہیں ناں؟''
''ہاں بیٹی میں خیال رکھتا ہوں اور......''
ان کی بات درمیان میں رہ گئی ان کے ہاتھ سے موبائل معید نے اچک لیا تھا۔
''آپی آپ کو نوکری مل گئی؟''
''ہاں معید مجھے بڑی اچھی نوکری ملی ہے۔'' اس کے لبوں پہ پہلی بار ہلکی سی مسکراہٹ آ کر فوراً معدوم ہو گئی۔
''اچھا آپی یہ سعدیہ بھی بات کرنا چاہ رہی ہے۔''
''ہاں بات کرواؤ۔'' اس نے کہا۔
اس سے پہلے سعدیہ بات کرتی موبائل

سے ابھرتی ٹوں ٹوں کی آواز سے رابطہ منقطع ہونے کی نشاندہی کر دی۔

''شاید بیلنس ختم ہو گیا۔'' اس نے موبائل بیگ میں رکھا اور کمرے کے بیچ کھڑے ہو کر اردگرد بکھرا سامان دیکھا۔

یہ سب اسے سیٹ کرنا تھا، کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد دوپٹہ سائیڈ پر رکھ کر وہ کام میں جت گئی، دوڑھائی گھنٹے کی محنت کے بعد وہ تمام سامان ان کی جگہوں پر سیٹ کر چکی تھی اتنی محنت مشقت کے بعد اسے بھوک ستانے لگی تھی، سو اس نے اپنے لئے چائے بنائی فریج میں ڈبل روٹی موجود تھی اس نے اس کے چار سلائس سینک کر چائے کے ساتھ کھا کر اپنی بھوک مٹائی، پیٹ بھرا تو نیند آنکھوں میں اترنے لگی۔

ویسے بھی رات ہو رہی تھی، اس نے کھڑکیاں اور دروازے اچھی طرح بند کیے اور سونے کے لئے لیٹ گئی، دن بھر محنت کا نتیجہ تھا اسے فوراً ہی نیند آ گئی۔

مصروفیت کے بعد اب نیند اس کے لئے بہت بڑی غنیمت تھی جس نے اس کا دھیان اپنے اکیلے پن کی طرف جانے ہی نہیں دیا تھا ورنہ یہاں پردیس میں اکیلا پن اس کا سانس لینا دوبھر کر دیتا۔

آج کا دن تمام ہوا آگے کیا ہونا تھا یہ وقت گزرنے پر معلوم ہونا تھا۔

☆☆☆

رات جلد سو جانے کی وجہ سے اس کی آنکھ وقت سے پہلے کھل گئی، وہ ایکدم گہری نیند سے جاگی تھی، دن کا اجالا بند کھڑکیوں کے شیشوں سے اندر آ کر کمرہ ہلکا روشن کر رہی تھی اس نے آنکھیں کھول کر موبائل پر ٹائم دیکھا، ابھی پانچ بجے تھے۔

اسے سات بجے جاب پر جانا تھا، ابھی اس کے پاس مزید دو گھنٹے باقی تھے، موبائل رکھ کر وہ دوبارہ آنکھیں بند کیے لیٹ گئی۔

بند آنکھوں کے پیچھے گزرے وقت کی یادوں نے دستک اچانک ہی دی تھی۔

''عائزہ اٹھ جاؤ تمہیں سکول بھی جانا ہے ورنہ دیر ہو جائے گی۔''

اس کی صبح روز فوزیہ کی آواز سن کر ہوا کرتی تھی، وہ اتنی فکر سے اسے اٹھایا کرتی تھی کہ اکثر ان کا فکر مند انداز دیکھنے کے لئے وہ جان بوجھ کر سوتی بن جایا کرتی تھی اور آج وہ خود ہی بیدار ہو گئی، اماں کی آواز آس پاس ہوا میں تحلیل ہو گئی۔

''اماں!'' اس کے لبوں نے بنا آواز لرزش کی تھی۔

''کیوں خود سے اتنی دور کر دیا اماں۔''

اب لیٹا رہنا دوبھر ہونے لگا تو وہ کمبل پرے دھکیل کر بستر سے اتر آئی، گھر صاف پڑا تھا اس کے پاس کرنے کو کچھ بھی نہیں تھا، وہ بلا ارادہ ہی کھڑکی کے پاس آئی اس کی سلائیڈ ہٹا کر باہر جھانکنے لگی۔

ایک دم ٹھنڈی ہوا نے اس کا استقبال کیا، کچھ دیر آنکھیں بند کیے وہ ہوا کا لطف لیتی رہی، پھر آنکھیں کھول کر اردگرد کا جائزہ لینے لگی۔

یہ شاید گھر کا پچھلا حصہ تھا، جس کا بڑا حصہ لان پر مشتمل تھا اسے ایکدم ہی خوشگوار بہت کا احساس ہوا، پھول ہمیشہ سے اس کی کمزوری رہے تھے اور یہاں تو ہر طرح کے پھول دیکھائی دے رہے تھے، وہ اشتیاق بھری نظروں سے پھولوں کو دیکھنے لگی جب ایک کونے میں اسے ایک لڑکی دیکھائی دی جو پائپ ہاتھ میں لئے پودوں کو پانی دے رہی تھی، وہ لڑکی پورے انہماک سے اپنے کام میں مگن تھی، اس نے بے

ساختہ ہی اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے پکارا تھا۔

''ہیلو۔'' اس لڑکی نے اس کی سمت دیکھا تو اس نے ہاتھ ہلا کر اس کی توجہ حاصل کی، اس لڑکی نے اسے دیکھا تو رسمی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواباً ہاتھ ہلا کر ہیلو کیا تھا۔

''ہیلو...... ہاؤ آر یو؟''

''می فائن۔'' اس نے جواباً مسکرا کر کہا۔

''فارغ ہیں تو نیچے آ جائیں، ساتھ میں ناشتہ کریں گے۔'' اس نے خوش اخلاقی سے اسے نیچے آنے کی دعوت دی، تو اس نے کچھ سوچ کر حامی بھر لی۔

اب اس دیس میں بنا شناسائی کے گزارا کیسے ممکن تھا؟ کھڑکی بند کرتی وہ پیچھے ہٹی اور کچھ دیر بعد فریش ہو کر اس کے سامنے موجود تھی جو میز پر ناشتہ لگائے اس کی منتظر تھی۔

اس نے خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا تھا۔

''کل پورا دن آپ سے ملاقات ہی نہیں ہو سکی۔'' اس نے کہا۔

''جی کل میں بھی مصروف تھی پھر رات بھی جلدی سو گئی۔'' اس نے جواب دیا۔

''چلیں کوئی بات نہیں ابھی ناشتہ شروع کریں۔'' اس نے ناشتہ سرو کرنا شروع کر دیا۔

ایک پلیٹ میں بل والا پراٹھا تھا جس کے اوپر آملیٹ رکھا تھا ساتھ میں چائے اور اچار، خالص پاکستانی ناشتہ دیکھ کر اس نے حیرت سے اسے دیکھ کر پوچھا۔

''آپ پاکستانی ہیں؟''

''جی بالکل کوئی شک ہے کیا؟'' اس کے لبوں پہ دبی دبی مسکراہٹ تھی، پھر وہ مزید بولی تھی۔

''کیا میں پاکستانی نہیں لگتی؟''

''لگتی ہیں مگر اس قدر خالص پاکستانی نہیں۔'' اس نے انہی کے انداز میں کہتے ہوئے ناشتے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''اصل میں آپ کی طرح میں بھی پاکستان سے آئی ہوں مجھے کئی سال ہو گئے یہاں آئے ہوئے، کافی عرصہ ہوا میں نے اس طرح کا ناشتہ کرنا چھوڑ دیا ہے پھر اتنے اہتمام کی فرصت بھی نہیں ملتی یہ تو آج آپ کی وجہ سے میں نے خصوص ناشتہ بنایا ہے، مسز احسان نے بتایا تھا آپ پاکستان سے آئی ہیں۔'' اس نے کافی تفصیل سے جواب دیا تھا، اس نے قدرے تکلف سے ناشتہ شروع کر دیا جب انہوں نے کہا۔

''تکلف کیے بنا آرام سے ناشتہ کریں۔''

تو وہ ان کے بے تکلفانہ انداز دیکھ کر خود بھی ریلیکس ہو گئی۔

''میرا نام عائزہ ہے۔'' اس کو اپنا تعارف کرانا یاد آیا۔

''اوہ اتنی اہم بات تو ہم بھول ہی گئے۔'' اس نے سر پر ہاتھ مارا۔

''میرا نام عظمٰی ہے، یہاں ایک آفس میں کمپیوٹر آپریٹر کی جاب کرتی ہوں، تم کس لئے یہاں آئی ہو؟'' اس نے تکلف کی آخری دیوار بھی گرا دی۔

''میں یہاں کس لئے آئی ہوں۔'' اس نے زیر لب بڑبڑایا، پھر مسکرا کر اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

''معاش روزگار یہاں تک کھینچ لایا۔''

''مطلب پیسے کمانے آئی ہو۔'' اس نے کہا تو اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

''اچھا تو پھر یہاں کس قسم کی جاب ملی؟'' و

استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔
''میں یہاں ابھی کچھ نہیں جانتی، مگر احسان صاحب نے یہاں ایک شاپ پر سیل گرل کا کام دلوایا ہے۔'' اس نے بتایا۔
''ہنہ، تعلیم کتنی ہے تمہاری؟'' ناشتے کے ساتھ ان کی گفتگو بھی جاری تھی۔
''میں نے انگلش ایم اے کیا ہے، ساتھ میں کچھ کمپیوٹر کورسز بھی کیے ہوئے ہیں۔'' اس نے اپنی قابلیت سے آگاہی دی۔
''کمپیوٹر کورس کر رکھا ہے تو تمہیں آفس میں جاب مل سکتی ہے، سیل گرل کی تنخواہ تو اتنی زیادہ نہیں ہوگی۔''
''تو پھر اب میں کیا کروں؟'' وہ مدد طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
''اس شاپ پر جوائنگ کب سے دینی ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''آج سے۔'' اس نے بتایا۔
''تو پھر تم وہاں مت جاؤ ان لوگوں سے ایکسیوز کر لو، تم میرے ساتھ چلو، میرے آفس میں فوری ورکر کی ضرورت ہے، تمہیں وہاں جاب مل جائے گی، تنخواہ اتنی تو ہوگی کہ پاکستانی حساب سے ایک لاکھ تک بن جائے گی۔'' چائے کا سیپ لیتے ہوئے اس نے بتایا۔
''ایک لاکھ۔'' اس کے ہاتھ سے کپ پھسلنے لگا تھا جسے مضبوطی سے دونوں ہاتھوں میں تھام کر گرنے بچایا تھا۔
''ہاں کم ہے کیا؟'' اس نے پوچھا۔
''نہیں، نہیں تو، یہ تو بہت زیادہ ہے۔'' وہ سادگی سے سچ بتا گئی۔
''انوسنٹ گرل۔'' اس کی اس قدر سادگی سے اس کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔
''اب ناشتہ ختم کر کے تیار ہو جاؤ پھر ساتھ چلتے ہیں۔'' وہ ناشتہ ختم کر چکی تھی اسے جلدی کرنے کی تلقین کی۔
تو اس نے باقی بچی چائے کا لمبا سا گھونٹ بھرا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔
''میں تیار ہوں بس اپنا بیگ لے کر آتی ہوں۔'' اس نے سر ہلا کر جانے کی اجازت دی تو وہ اوپر جانے کے لئے اندرونی راستے کی طرف مڑ گئی۔
یہ ایک ہی گھر تھا مگر اوپر کا پورشن الگ کرنے کے لئے اس کا ایک راستہ الگ سے نکال رکھا تھا، جبکہ ایک راستہ نیچے کے پورشن کے ساتھ بھی جوڑا گیا تھا، اس وقت اس نے یہی اندرونی راستہ چنا تھا، چند سیکنڈ بعد وہ بیگ لئے دوبارہ نیچے آ گئی۔
عظمٰی اس کی منتظر تھی اسے دیکھ کر وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی، پھر گھر کو لاک کرتی وہ دونوں ایک ساتھ وہاں سے نکل گئی۔

☆☆☆

عظمٰی کے آفس میں اس کی جاب ہو گئی، وہ بہت زیادہ خوش اور مطمئن تھی احسان کے بعد اب عظمٰی نے اس کی بہت مدد کی تھی، عظمٰی کے ساتھ کی بدولت وہ بہت جلد اس ماحول میں سیٹ ہو گئی، اسے یہاں آئے مہینہ ہونے والا تھا، اتنے عرصے میں وہ کافی حد تک عظمٰی کے ساتھ کھل مل گئی تھی، اس کا تعلق کراچی سے تھا تو عظمٰی کا تعلق اسلام آباد سے تھا، عظمٰی اس کے ساتھ کافی مخلص ثابت ہوئی تھی، ہر قدم پر وہ اس کا ساتھ دے رہی تھی، اس کی طرح عظمٰی بھی پیسے کما کر گھر بھیجا کرتی تھی، اس نے ان دنوں بس ایک بار ہی گھر بات کی تھی، اپنے ساتھ لائے روپے وہ بہت کفایت شعاری سے خرچ کر رہی تھی، اس عرصے میں احسان سے اس کی ملاقات دوبارہ نہیں ہوئی

تھی اور نہ ہی ملاقات کے امکانات نظر آ رہے تھے، وہ خود بھی اس کی زندگی میں کوئی مشکل پیدا کرنا نہیں چاہتی تھی، جتنا وہ اس کے لئے کر چکا تھا وہ اتنے پر ہی اس کی شکر گزار تھی۔

اس وقت جاب سے واپسی کے بعد وہ اپنے لئے چائے بنا رہی تھی جب عظمیٰ اوپر چلی آئی، اسے کمرے میں موجود نہ پا کر وہ کچن میں اس کے پاس آ گئی۔

''میرے لئے بھی ایک کپ بنا لینا۔'' وہ بے تکلفی سے کہتے ہوئے کاؤنٹر پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔

''تم آج اوپر کیسے؟'' وہ بہت کم اوپر آیا کرتی تھی زیادہ تر عائزہ نیچے جاتی تھی۔

''بس آج میں نے سوچا میں خود اوپر کی ہوا کھانے آ جاؤں۔''

عظمیٰ کافی ملنسار لڑکی تھی خود بھی ہر دم ہنستی رہتی اور کوشش کرتی اس کے ساتھ موجود کسی بھی تمام فکر والم بھول کر مسکرائے۔

عائزہ نے ہنستے ہوئے کیتل میں ایک کپ چائے کا پانی اور ڈال دیا۔

ماحول پر کچھ پل کے لئے خاموشی چھا گئی، جسے محسوس کرکے عائزہ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا ہوا خاموش کیوں ہو گئی؟'' چائے کو دم لگا کر وہ اس کے قریب چلی آئی۔

''بس ویسے ہی۔'' اس نے ٹالنا چاہا مگر اسے صاف محسوس ہوا وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔

''ایسے تو تم کبھی خاموش نہیں ہوتی، ضرور کوئی بات، اتنا جھجک کیوں رہی ہو، کہو جو کہنا چاہتی ہو۔'' اس نے اس کا حوصلہ بڑھایا تھا جس کی بدولت وہ بولنے پر آمادہ نظر آنے لگی۔

''دراصل میں کافی دن سے آج بات پوچھنا چاہ رہی تھی مگر پوچھ نہیں پائی کہ کہیں تم ناراض نہ ہو جاؤ، کہیں میں تمہارے کسی پرسنل میں مداخلت نہ کر دوں۔'' اس کے انداز میں اب بھی ہچکچاہٹ نمایاں تھی۔

چائے پک چکی تھی، عائزہ نے وقتی خاموشی کے ساتھ چائے دو کپوں میں ڈالی اور کپ چائے اس کے پاس آ کر ایک کپ اس کی طرف بڑھا دیا، اس نے خاموشی سے کپ تھام لیا۔

''آؤ اندر چل کر بات کرتے ہیں۔'' اس نے باہر کی طرف قدم بڑھائے تو وہ بھی کاؤنٹر سے اتر کر اس کی معیت میں کمرے میں چلی آئی۔

دونوں ایک ہی صوفے پر بیٹھ گئیں، عائزہ نے پاؤں پر پاؤں چڑھا کر رخ اس کی طرف کیا پھر گویا ہوئی۔

''عظمیٰ تمہارے مجھ پر اتنے احسان ہیں تم جان بھی مانگو تو بھی میں منع نہ کر پاؤں گی اس انجانے ملک میں جہاں میرا کوئی اپنا نہیں تھا وہاں تم نے اپنوں سے بڑھ کر میرا ساتھ دیا، تمہارا احسان میں کبھی نہیں بھول سکتی اور اس احسان کو بھی درمیان میں نہ لاؤں تو میڈم تم میری دوست ہو اور دوست کا اتنا حق تو ہوتا ہے کہ اس سے ناراض نہ ہوا جائے اپنے پرسنل اس سے چھپائے نہ جائے، تم دوست ہو میری۔'' اس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے اس کو اس کی اہمیت کا احساس دلایا، پھر بولی۔

''میں تم سے کبھی بھی ناراض نہیں ہو سکتی، تم بلا جھجک کچھ بھی پوچھ سکتی ہو، میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے کندھے پر رکھ کر دبایا گویا اسے حوصلہ دے رہی ہو، تب اس نے کہا۔

''میں تمہارے اور احسان کے رشتے کے

متعلق جاننا چاہتی ہوں، میرا مطلب ہے وہ تمہارا کیا لگتا ہے جو پاکستان سے تمہیں یہاں لے تو آیا مگر پلٹ کر خبر نہیں لی، اگر وہ تمہیں یہاں لایا تو ضرور تمہارا رشتے دار ہوگا، مگر یہ کیسا رشتے دار ہے جس نے پہلے دن کے بعد پلٹ کر تمہاری خبر نہیں لی؟'' اس نے اپنی سوچ کی وضاحت کی تھی۔

''بس اتنی سی بات۔''

''پاگل مجھے پریشان کر دیا کہ پتا نہیں کیا بات ہے جو تمہیں اسی طرح بولنے سے روک رہی ہے۔'' سر جھٹک کر اس نے چائے کا سپ بھرا۔

''یہ اتنی سی بات ہے کیا؟ میں کتنے ہی دن سے اس بات کو لے کر پریشان ہوتی رہی۔''

''تو کس نے کہا تھا پریشان ہوتی رہو، تم پہلے دن ہی پوچھ لیتی۔''

''اچھا اب تو پوچھ لیا ناں تم اب تو بتا دو۔'' وہ جاننے کی متمنی تھی۔

''احسان سے میرا نکاح ہوا تھا۔'' کپ سائیڈ میں رکھ کر اس نے جیسے دھماکہ کیا۔

''نکاح...... مطلب وہ تمہارا شوہر ہے۔'' اس کو یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔

''ہاں۔'' اس نے مختصراً کہا۔

''تو یہاں لا کر تمہیں یوں چھوڑ کیوں دیا؟ تم بیوی ہو اس کی۔'' اس کے چہرے پر الجھن بھری کیفیت نمایاں تھی۔

''ہم...... نہیں بلکہ میں ایک ڈیل کے مطابق یہاں آئی ہوں۔''

''پلیز مجھے کھل کر بتاؤ۔'' چائے سے بھرا کپ جوں کا توں اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا، تب عائزہ نے اپنے اور احسان کے رشتے سے لے کر یہاں آنے تک کے تمام حالات اس کے گوش گزار کیے جسے سن کر اس کی آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھیل سی گئی۔

''تمہارے ساتھ تمہارے گھر والوں نے ظلم کیا اور ان سے بڑھ کر ظلم احسان نے کیا، اگر یہ وہاں نکاح سے پہلے تمہیں یہ سب بتا دیتا تو تم خود اس رشتے سے انکار کر سکتی تھی بات تب بھی اس پر نہ آتی، مگر اس نے تم سے نکاح کیا تمہیں یہاں لایا اور چھوڑ دیا۔''

''چھوڑا کہاں، میں نے طلاق لینے سے انکار کر دیا۔'' عائزہ نے فوراً اس کے جملے کی تصحیح کی تھی۔

''چھوڑنا صرف طلاق دینا ہی نہیں ہوتا یہ جیسے تمہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا، اسے اور کیا کہتے ہیں؟ تم بیوی ہو اس کی اسے تمہیں ساتھ رکھنا چاہیے۔'' اس نے فوراً تیزی سے کہا۔

''بے یار و مددگار نہیں چھوڑا، یہاں لا کر میری مدد کی یہ گھر لے کر دیا، جس کی بدولت مجھے تم جیسی پیاری دوست ملی۔'' وہ احسان کو کسی صورت قصوروار ٹھہرنے دینا نہیں چاہتی تھی۔

''تم اس کی بیوی ہو۔'' عظمیٰ نے ایک ایک لفظ پر زور دیا تھا۔

''اس کی پہلے سے ایک خوبصورت بیوی ہے دو بچے ہیں جن کے ساتھ وہ خوش ہے اس کی فیملی مکمل ہے، پھر وہاں ان کے درمیان میری کیا ضرورت؟ ہمارا ساتھ ایک سمجھوتے کے تحت ہوا، میں یہاں پیسے کمانے آئی ہوں، پیسے کماؤں گی گھر بھیج دوں گی بس بات ختم۔''

''تم اکیلی کب تک رہو گی، آج نہیں تو کل تمہیں ایک ساتھی کی ضرورت محسوس ہوگی عائزہ۔''

''تم بھی تو اکیلی رہی ہو۔'' اس نے جتاتی نظروں سے اس کو دیکھا تھا۔

''میری بات اور تھی یار، میں منگنی شدہ ہوں

میں طے شدہ وقت کے لئے یہاں آئی تھی وہ وقت مکمل ہونے کو ہے، میں واپس چلی جاؤں گی، وہاں جا کر میری شادی ہو جائے گی، مگر تمہارا کیا ہوگا؟''

''ایک عدد شوہر، وہ بھی ایسا جو تمہیں کبھی ساتھ نہیں رکھے گا، اس کی موجودگی میں تو تم کہیں کی نہیں رہو گی، نہ تم پیچھے پلٹ سکتی ہو نہ آگے بڑھ سکتی ہو۔'' وہ اس کے لئے ازحد پریشان تھی۔

''میں نہ تو پلٹنا چاہتی ہوں اور نہ ہی آگے بڑھنا چاہتی ہوں۔''

''یہاں جیسے گزر رہی ہے گزار لوں گی پھر اپنے ملک اپنوں میں لوٹ جاؤں گی۔'' اس نے عظمٰی کی پریشانی کم کرنا چاہتی تھی۔

''اچھا تو اپنوں میں لوٹ جانے کے بعد تم کیا کرو گی؟'' وہ استہزائیہ ہنسی تھی۔

''پتا نہیں۔'' اس نے ایکدم ہی اس کی باتوں سے دامن چھڑایا۔

''ہاہاہا، یہ مسئلے کا حل نہیں ہے عائزہ۔'' اس نے تیکھے چتونوں سے اسے گھورا، پھر ذہن میں کچھ خیال آنے پر وہ اس کی طرف کھسک کر تیزی سے بولی۔

''اس کے پاس پیسے کی کمی نہیں ہے، پھر تم خود بھی کمانے لگی ہو، وہ دو دو بیویاں رکھ سکتا ہے ناں تو اسے کہو تمہیں اپنے ساتھ رکھے۔''

''پاگل ہوئی ہو کیا؟'' عائزہ نے ایکدم ہی اسے ٹوک دیا۔

''کیوں؟ اس میں حرج کیا ہے؟'' اس نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

''اس نے پہلے دن پہلی ملاقات میں مجھے جتا دیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ بہت خوش ہے کسی دوسرے کی اسے قطعی ضرورت نہیں ہے اور میں نے خود اس کی بیوی کو دیکھا ہے اتنی پیاری اتنی خوبصورت کے میں تو دیکھتی رہ گئی، مجھ میں ہے ہی کیا جو مجھ پر توجہ دی جائے، نہیں بس میں ان کے درمیان گھس کر تکون بننا نہیں چاہتی، میں اکیلی ہی ٹھیک ہوں۔'' خود ترسی کا شکار ہوتی آخر میں ایکدم دوٹوک بات کہہ کر اس نے بات ختم کرنا چاہی تھی۔

''آج تو تم اکیلی ٹھیک ہو مگر دیکھوں گی کب تک اکیلی ٹھیک ہو تم، حق رکھتے ہوئے بھی استعمال کرنا نہیں چاہتی تم۔'' عظمٰی کو اس لاحاصل بحث سے مایوسی ہوئی تھی جب ہی بدمزہ ہو کر جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چائے تو پی لو۔'' عائزہ نے اخلاقاً اسے روکنا چاہا تھا۔

''تم ہی پیو چائے، وہ بھی اکیلی۔'' اس نے جلے دل کے ساتھ منہ بنا کر کہا اور وہاں سے چلی گئی۔

عائزہ مسکرا دی، اسے اس کے خلوص پر رتی برابر بھی شک نہیں تھا، مگر وہ کر بھی کیا سکتی تھی، نجانے اب اسے آدھے سر میں درد کیوں رہنے لگا تھا اس وقت بھی ایکدم درد کی ٹیس تیزی سے ابھرنے لگی تو دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گئی، اچانک ہی عظمٰی کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

''تم کب تک اس طرح اکیلی رہو گی۔'' اس نے لب بھینچ کر اپنے اردگرد دیکھا، ہر طرف خاموشی کا راج تھا، اس کا دھیان بٹنے لگا۔

''یہ عظمٰی بھی پاگل ہے، پتا نہیں خود بھی کیا کیا سوچتی رہتی ہے اور میرے ذہن میں بھی ڈال گئی۔'' گہرا سانس کھینچتی وہ صوفے سے اٹھ کر بیڈ پر آ بیٹھی، دراز سے درد کی ٹیبلٹ نکال کر کھائی اور لائٹ آف کر کے سونے کے لئے لیٹ گئی۔

وہ عظمٰی کی کہی باتوں کو ذہن سے نکالنا

چاہتی تھی مگر ذہن تھا کہ بھٹک بھٹک کر اس طرف بہک رہا تھا۔

''عظمٰی نے کچھ غلط بھی تو نہیں کہا، احسان میرا شوہر ہے۔'' اس کے دل نے تاریکی میں عظمٰی کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔

دل کی بدلتی کیفیت پر اس نے ایکدم ہی حیران ہو کر پٹ سے آنکھیں کھولی تھی، ہر طرف اندھیرا تھا گھپ اندھیرا، اسے خوف محسوس ہونے لگا۔

''اف عظمٰی۔'' بے چارگی سے کہتی اس نے اپنے گرد کمبل کو مضبوطی سے لپیٹا اور کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

آج وہ بہت خوش تھی پورا مہینہ انتظار کرنے کے بعد اس کے ہاتھوں میں وہ رقم تھی جس کی خاطر وہ یہاں موجود تھی۔

تنخواہ کے لفافے کو ہاتھ میں لئے اس کے تاثرات عجیب سے ہو رہے تھے، کبھی دل خوشی سے بھر جاتا تو کبھی یکدم افسردگی کی دھند اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتی، اس کی خوشی آنسو بن کر اس کی آنکھوں میں چمک رہی تھی، وہ جلد از جلد گھر والوں کو اطلاع دینا چاہتی تھی، انہیں پیسے بھیجنا چاہتی ہے، گھر پہنچنے پر سب سے پہلے اس نے گھر فون کیا تھا، دوسری طرف سے کال سعدیہ نے پک کی تھی۔

''آپی یہ آپ ہیں ناں؟'' اسے اس کا نمبر ازبر تھا مگر پھر بھی احتیاطاً پوچھا تھا۔

''ہاں سعدی یہ میں ہوں عائزہ، تم کیسی ہو گھر میں سب کیسے ہیں، اماں کہاں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''اماں گھر ہیں آپی میں ابھی ان کو فون دیتی ہوں۔'' اس کی پھولتی سانس سے محسوس ہو رہا تھا وہ تیزی سے چل رہی ہے۔

''تم کہاں ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''میں ساتھ والی آنٹی کے گھر آئی تھی قرآن خوانی میں، بس یہ لیں میں آ گئی گھر۔'' وہ لمبے لمبے سانس بھر رہی تھی۔

''اوہ تو تم مجھے پہلے بتا دیتی میں بعد میں فون کر لیتی۔'' وہ شرمندہ ہوئی۔

''ارے نہیں آپی ایک تو آپ اتنی دور سے بات کرتی ہیں وہ بھی اتنی مہنگی۔''

''ہائے آپی ہمیں کتنے بھیج رہی ہیں۔'' اس نے اشتیاق سے بھرے انداز میں پوچھا۔

''بس یہ تو سرپرائز ہے۔'' اس کا تنگ کرنے کا مکمل ارادہ تھا، جب موبائل اس کے ہاتھ سے فوزیہ نے لے لیا۔

''کب سے خود ہی باتیں کیے جا رہی ہے، مجھے بھی بات کرنے دے۔'' سعدیہ منہ بناتی ان کے پاس ہی بیٹھ گئی جبکہ فوزیہ عائزہ سے بات کرنے لگی، عائزہ نے ان کو بھی پیسے ملنے کی خوش خبری سنائی جسے سن کر وہ بہت زیادہ خوش ہوئی تھی اور اسے جلد پیسے بھیجنے کی تلقین کی۔

''عائزہ یہاں پیسے ختم ہو گئے ہیں، تیرے ابا کی بیماری بھی بڑھنے لگی ہے دوائیاں بھی ختم ہو گئی ہیں تو اس لئے ان کی طبیعت بگڑنے لگی ہے اور معید، سعدیہ، ثمن، صدف کی فیسیں بھی جمع نہیں کروائی۔'' اس سے اس کے حالات کا سرسری سا جان کر انہوں نے اسے ایک نئی پریشانی سے دوچار کیا تھا۔

انہیں لگتا تھا احسان کی صورت وہاں سب ٹھیک ہے، اب انہیں کیا معلوم وہاں کیا ہوا؟ اور نہ ہی کبھی انہوں نے اتنا کرید کے جاننا چاہا عائزہ خود بھی انہیں بتانا نہیں چاہتی تھی، اس لئے اس بات کو پوشیدہ ہی رہنے دیا۔

''اماں، بس آج کا دن اور انتظار کر لیں میں کل ہی پیسے بھجواتی ہوں، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس نے اپنے ساتھ ساتھ ان کو بھی تسلی سے نوازا تھا۔

کمال سو رہے تھے، باقی سب بچے پڑھنے گئے ہوئے تھے چاہنے کے باوجود بھی وہ ان سے بات نہیں کر پائی، پھر تھوڑی دیر اور بات کرنے کے بعد اس نے ان سے اجازت چاہی۔

ان سے بات کر کے اگر وہ خوش ہوئی تھی تو کمال کی بیماری کا سن کر پریشان بھی ہو گئی تھی، اس نے کل ہر حالت میں پیسے بھیجنے کا پختہ عزم کیا تھا۔

رات سونے سے پہلے اس نے آسیہ کو فون کیا تھا، وقت کے درمیانی فرق کی بدولت پاکستان میں صبح کا وقت تھا، وہ نیند سے جاگی تھی، تبھی اس کی آواز خمار آلودہ تھی۔

''کیسی ہو عاصی۔'' آج کتنے عرصے بعد وہ اس سے مخاطب تھی اس کے انداز میں ایکدم ہی اپنی واحد دوست کے لئے پیار امڈ آیا تھا۔

''عائزہ...... تم ...... یہ تم ہو ناں؟'' اس کی آنکھیں پوری کی پوری کھلی تھی اور آواز میں تیزی آئی تھی، عائزہ مسکرا دی۔

''ہاں میں ہی ہوں۔''

''پتا بھی ہے میں نے تمہیں کتنا یاد کیا اور انتظار بھی۔''

''انتظار وہ کیوں؟''

''میں نے واپس آنے کا کب کہا تھا؟'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''آتے سے تو روکا نہیں اور اب ایسے انتظار؟''

''تمہارا نہیں، وہ تم نے کہاں تھا مجھے بھی کچھ بھیجو گی؟'' اس نے دھڑلے سے بنا جھجکتے بول دیا۔

''اوا چھا۔'' وہ ڈھیلی پڑ گئی۔

اس نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

''رقم تو کوئی بھی معمولی نہیں ہوتی عاصی، پاکستان میں ایک ایک روپے کے لئے محنت کی جاتی ہے تو یہاں ایک ایک ڈالر کے لئے۔'' اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

''چل اب ایسے بھی نہ کہہ، لاکھوں کما رہی ہو تم۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر جیسے مکھی اڑائی تھی۔

''ہاں آج پہلی تنخواہ ملی ہے مجھے۔'' اس نے اسے بھی اطلاع دی۔

''واہ بھئی موج ہو گئی پھر تو آج تمہاری۔''

اس کا انداز عجیب ندیدہ پن لئے ہوئے تھا۔

''نہیں تو بس، میں نے کیا موج کرنی، کل اماں لوگوں کو پیسے بھیجوں گی، ان کا پورا مہینہ مشکل میں گزار ہوگا۔'' اسے ایک بار پھر فکر ستانے لگی۔

''ہاں میں گئی تھی وہاں، کمال انکل کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔'' اس کے منہ سے ایک بار پھر ان کی طبیعت کا سن کر وہ کافی بے چین ہو گئی، ایکدم ہی اس کا دل اچاٹ ہو گیا، جبھی نیند کا بہانہ کر کے اس نے کال منقطع کر دی۔

''لگتا ہے ابا کی طبیعت کچھ زیادہ خراب ہے۔'' بیڈ پر دو زانو بیٹھے اس نے اپنے بازو زانو کے گرد لپیٹ رکھے تھے۔

نظریں سامنے دیوار پر لگی تصویر پر جمی تھی اور دھیان کا پنچھی وہاں دور کہیں اپنوں کے گرد پرواز کر رہا تھا، کافی دیر اسی طرح گم سم کیفیت میں بیٹھی سوچتی رہی، جب نیند سے آنکھیں جلنے لگی تو انہی سوچوں کو ذہن میں لئے آنکھیں بند کیے لیٹ گئی۔

(باقی اگلے ماہ)

نایاب جیلانی

دسویں قسط کا خلاصہ

منگورہ میں ہیام عشیہ کو کسی اجنبی کے ساتھ بے تکلفانہ انداز میں گفتگو کرتے دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہے، عشیہ کو کسی اجنبی کے ہمراہ دیکھنا، ہیام کے لئے کسی دھچکے سے کم نہیں۔

امام ایک روزہ چھٹی پہ اچانک گھر واپس آجاتا ہے تو پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے لیکن ایک چھوٹی سی بات پر شانزے امام سے بدگمان ہو جاتی ہے۔

جہاندار کا نیل بر کے لئے کانشس ہونا اور پری گل کی ہمدردی کرنا سباخانہ کے مزاج پہ گراں گزرتا ہے، اس بات پہ سباخانہ اور جہاندار کی تکرار ہو جاتی ہے۔

بٹو خاندان کے قبرستان میں کھدائی کے دوران اسامہ کو ایک کتبہ ملتا ہے، جس پہ لکھے انتہائی اجنبی نام دیکھ کر رحمت دم بخود رہ جاتی ہے۔

نیل بر اپنے دل کی بدلتی کیفیت پہ حیران اور متعجب ہے، اندرونی تبدیلی سے گھبرا کر وہ غیر ارادتا سرکاری بنگلے میں امام فریدے شاہ کی تلاش میں جاتی ہے تو پری گل کا باپ خان نبل بر کو بنگلے پہ دیکھ کر دھنگ رہ جاتا ہے۔

شاہوار عشیہ کے گمان میں عروفہ سے اتفاقاً ٹکرا جاتا ہے، عروفہ اپنا تعارف جب عشیہ کی بہن کہہ کر کرواتی ہے تو شاہوار انتہائی شاکڈ رہ جاتا ہے۔

اب آپ آگے پڑھیئے

گیارہویں قسط

اس نے گہرا سانس لیا اور بلاٹل جانے پر خدا کا شکر ادا کرتی کچن کی طرف مڑ گئی، کچھ چور نگاہوں سے کچن کی طرف دیکھا تو کچن میں حمت نظر نہیں آئی تھی، نیل بر کچھ مطمئن سی دبے قدموں اندر آ گئی۔

پری جو اپنی ہی دھن میں پالک اور ساگ کے کترے کو پتیلے میں ڈال کر چولہے پہ چڑھا رہی تھی، نیل بر کو دیکھ کر ایک دم چونک گئی، پھر جلدی سے اپنے میٹھے لہجے میں پوچھا۔

''کچھ چاہیے تھا بی بی!''

''ہاں......نہیں۔'' نیل بر نے گڑبڑا کر جواب دیا تھا، پری اس ہاں اور نہیں میں ہونق بن گئی تھی، اس کی سوالیہ نظروں کو محسوس کر کے نیل بر نے جلدی سے بات بنا کر کہا۔

''تم نے آج اپنے بابا سے ملنے جانا نہیں تھا؟'' اس کا لہجہ حتی المقدور سرسری تھا۔

''جانا تھا بی بی! پر مارا غریب کی کون سنتا ہے؟ صندیر خان بولتا اکیلے مت جانا اور جہاندار لالا کا کام ختم نہیں ہوتا، ام اپنے بابا سے ملنے جائے تو کیسے جائے۔'' پری کی افسردگی کو محسوس کرتے ہوئے نیل بر نے جھٹ اپنی خدمات پیش کر دی تھیں۔

''میں تم کو لے جاؤں؟ اپنی جیپ پہ؟'' نیل بر کی آفر پہ پری ہکا بکا رہ گئی تھی۔

''تم لے کر جائے گا؟ پر کیسے؟'' اس نے ہونق پن سے کہا تھا۔

''گدھی، جیپ پہ، میں خود ڈرائیو کر لوں گی، تم جہاندار کو چھوڑو، ایک کام کر لے تو ہزار دفعہ احسان جتاتا ہے۔'' نیل بر کا انداز نخوت سے بھرپور تھا، پری نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

''اوم......نہیں بی بی، ایسا تو نہیں لالا۔'' جہاندار کی برائی اسے اچھی تو نہیں لگتی تھی، نیل بر کے ماتھے پہ بل آئے۔

''لالا کیسا ہے؟ یہ تم نہیں جانتی، میں جانتی ہوں۔'' نیل بر نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا۔

''یہ بہروپیا ہے، تم دیکھ لینا۔''

''بہروپیا کیا ہوتا ہے بی بی؟'' پری کی آنکھیں کھل گئیں، گو کہ بہروپیا کے معنی اس کی سمجھ سے بالاتر تھے، تاہم اسے اتنی سوجھ بوجھ ضرور تھی کہ سمجھ جاتی، بی بی، لالہ کے لئے اچھے خیالات نہیں رکھتی تھی۔

''جو بھی ہوتا ہے، چھوڑو تم، آؤ میرے ساتھ۔'' اس نے قدرے ناگواری سے بات ختم کی تھی، اسے جلد از جلد یہاں سے نکلنے کی بے چینی تھی، کیونکہ جہاندار کسی بھی وقت ان کے پروگرام پہ لات مارنے سر پہ سوار ہو جاتا۔

''اور یہ امارا اتنا کام؟'' پری بوکھلا گئی۔

''بھاڑ میں جائے کام، تمہارا بابا انتظار کر رہا ہوگا، چلو تم۔'' نیل بر نے آگے بڑھ کر برنر بند کیا، اس کے ہاتھ سے چاقو کھینچ کر سلیب پہ پھینکا اور اسے بازو سے پکڑ کر باہر لے گئی۔

☆☆☆

آج مطلع بہت شفاف تھا، نیلگوں آسمان کی نیلاہٹیں اپنا عکس چھوڑ رہی تھیں، سورج کی آب و تاب بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، لیکن چمک دمک محض چند گھنٹوں پہ محیط تھی، اچانک ہیال کی

طرف سے سیاہ بادلوں کی نوج اُمڈ آئی تھی پھر دیکھتے ہی دیکھتے تیز بارش کا سلسلہ شروع ہوگیا، کوہساروں کی قبا بھیگتی رہی اور پھولوں پہ شبنم کا چھڑکاؤ ہوگیا، مغرب سے کچھ پہلے سورج کی پھر سے رونمائی ہوئی تھی، جس کا مطلب یہ سمجھا جاتا تھا کہ کل بھی موسم کے تیور اچھے نہیں ہوں گے۔

بارش نے مناظرِ فطرت کی دلکشی میں اضافہ کر دیا تھا، دور کہیں بہت دور چونگرہ کی پہاڑی چوٹی پورے استور پہ سایہ فگن تھی۔

وہ اپنے گھر کی بالکونی میں کھڑی آس پاس کے ماحول میں گم نہیں تھی، اس کے خیالات کا پنچھی اڑ اڑ کر اسامہ کی طرف لپکتا تھا، وہ کہاں چلا گیا تھا؟ بالکل اچانک، بغیر بتائے۔

پھر وہ سوچتی، وہ کسے بتا کر جاتا؟ عشیہ نے اپنا کوئی رابطہ نمبر اسے نہیں دیا تھا، وہ کس پہ کانٹیکٹ کرتا؟ پھر عشیہ کو مزید گھبراہٹ ہونے لگتی، وہ کم از کم روز گل کو تو بتا کر جاتا، لیکن وہ روز گل کو کیوں بتاتا؟ یہ کوئی بتانے والی بات تھی، کبھی عشیہ کا دل چاہتا تھا وہ ہوٹل روز گل میں جا کر روز گل سے اسامہ کے بارے میں پوچھ لے۔

اس کے گھر خیریت تو تھی؟ جو وہ اچانک چلا گیا، کیا خبر کوئی بیمار ہو، یا پھر؟ کچھ بھی تو ہوسکتا ہے؟ عشیہ کے دل کو پتنگے لگے تھے، اندر گھبراہٹ نے کنڈلی مار رکھی تھی، کسی بھی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔

وہ اندر ہی اندر اسامہ سے ناراض تھی، وہ اسے اطلاع کیے بغیر چلا کیوں گیا تھا؟ اسے بتا کر جاتا، کم از کم کوئی پیغام تو چھوڑتا۔

پھر وہ اسامہ کو خود ہی بے قصور مان جاتی، لیکن دل کو کسی پل قرار نہیں تھا، وہ انہی سوچوں میں گم تھی جب آہٹ پا کر کچھ چوکنا ہوگئی، اس کے پیچھے عروفہ کھڑی تھی، عشیہ نے گہرا سانس خارج کیا، عروفہ کا عشیہ کے پاس آنا کوئی نیک شگون نہیں تھا، جب بھی بات چیت ہوا کرتی تھی عموماً طنزیہ ہی ہوتی، عروفہ اسے جلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی، ابھی بھی عشیہ کو خاموش دیکھ کر بظاہر بڑے سرسری انداز میں بولی۔

''آج تم گھر میں نظر آ رہی ہو؟ بڑی حیرت کا مقام ہے۔'' عشیہ نے گردن موڑ کر نہیں دیکھا تھا، وہ عروفہ کا طنز محسوس کر سکتی تھی۔

''یہ دن تو تاریخ میں لکھنے والا ہے۔'' اسے خاموش پا کر عروفہ نے پھر سے طنز کا تیر اچھالا تھا، اب کہ عشیہ چاہ کر بھی خاموش نہیں رہ سکی تھی۔

''جب کام ہو تب ہی گھر سے باہر نکلتی ہوں۔''

''کچھ کام ہمارے لئے بھی رکھ دیا کرو، اسی بہانے ہماری بھی کچھ تفریح ہو جائے گی۔'' عروفہ نے مسکرا مسکرا کر جیسے اندر کی کھولن باہر نکالی تھی، در پردہ وہ اسے جتا رہی تھی، کہ عشیہ کام کے بہانے باہر تفریح کرتی تھی، عشیہ کے لئے عروفہ کی بکواس جلتی پہ تیل ڈالنے کے مترادف تھی۔

''کسی ایک دن میرے جیسی تفریح کر کے دیکھنا، مزہ آ جائے گا۔'' عشیہ نے بمشکل غصہ دبا کر کہا تھا۔

''تم کبھی موقع تو دو۔'' عروفہ نے مسکرا کر ٹکڑا لگایا۔

''آج ہی موقع لے لو، لکڑی کے آرے سے لکڑیاں کٹوا کر لے آنا، آٹا بھی چکی سے پسوانا ہے اور لحافوں کی دھنائی بھی کروانی ہے، ڈروے تو عمکیہ ڈال لے گی، باقی کا کام تم کر آنا۔'' عشیہ نے بھی بڑے سکون کے ساتھ اس کا جواب لوٹا دیا تھا۔

''اس کے علاوہ کوئی اور کام نہیں؟'' عروفہ نے دانت پیس لئے تھے۔

''مثلاً؟'' عشیہ کا سکون قابل دید تھا۔

''ہوٹل روز گل کے پھیرے لگانا۔'' عروفہ کا جواب عشیہ کو بھک سے اڑا گیا تھا، اس کا سکون اندر ہی اندر درہم برہم ہو گیا۔

''میں بلا ضرورت کبھی روز گل کے ہوٹل نہیں گئی۔'' وہ اسے وضاحت دینا نہیں چاہتی تھی مگر پھر بھی۔

''چلو ضرورتاً تو جاتی ہو نا۔'' عروفہ کی آنکھوں میں تیز لپک بھر گئی تھی۔

''پھر وہاں اس آرکیالوجسٹ سے ملاقات بھی ہوتی ہو گی؟'' اس کے لہجے میں واضح طنز کی کاٹ تھی، عشیہ جیسے سرتاپا سلگ گئی۔

''اپنی بکواس بند کرو، تمہیں بولتے ہوئے ذرا شرم نہیں آتی۔'' عشیہ نے تلخی سے کہا تھا، عروفہ کی بکواس اس کا فشار خون بڑھا گئی تھی، تو کیا عروفہ بھی جان گئی تھی؟

''تمہیں غصہ کس بات پہ آرہا ہے؟ میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا۔'' وہ معصوم بن کر بولی تھی۔

''مجھے کیوں غصہ آئے گا، بس تمہاری ذہنیت پہ افسوس ہوتا ہے۔'' عشیہ کا لہجہ تاسف سے بھر گیا۔

''اور مجھے تمہاری حرکتوں پہ افسوس ہوتا ہے۔'' عروفہ نے نہایت آرام سے عشیہ کو بے آرام کر دیا تھا، وہ سرتاپا غصے سے کپکپا گئی تھی۔

''کون سی حرکتیں؟'' عشیہ کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے، عروفہ اس کی خاموشی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی تھی، اس کا منہ بند کرنا ناگزیر تھا۔

''اب کیا ایک ایک کھول کر بتاؤں۔'' عروفہ نے سابقہ مکاری بھری معصومیت سے کہا تو عشیہ کا دماغ تپ اٹھا۔

''تو بتا دو، جو تمہارے سطحی دماغ کی ایجاد ہے۔'' وہ زہر خند تھی۔

''تمہیں غصہ کس بات پہ آرہا ہے، ابھی تک میں نے کوئی غصہ دلانے والی بات تو نہیں کی۔'' عروفہ اس کے پیچ و تاب کھانے سے لطف اندوز ہو رہی تھی، عشیہ نے خون کے گھونٹ اندر اتارے تھے، ورنہ دل تو چاہ رہا تھا، رکھ کے عروفہ کے منہ پہ طمانچہ دے مارے۔

''ابھی تک کوئی بات نہیں کی؟'' وہ اندر ہی اندر بل کھا رہی تھی، پھر پلٹنے لگی تو عروفہ نے جلدی سے اسے روکا۔

''میری بات تو سن کر جاؤ۔'' اس کے پکارنے پہ عشیہ کو لامحالہ رکنا پڑا تھا۔

''ابھی کچھ سنانے کو رہتا ہے؟'' عشیہ کا لہجہ کسیلا تھا، عروفہ کو بڑا ہی مزہ آیا۔

''بہت کچھ۔'' وہ چٹخارہ لے کر بولی تھی، اس نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا، جیسے

کہہ رہی تھی کہ جو بکنا ہے بکو۔
عروفہ اس کے تپنے اور تلملانے کو صاف محسوس کر رہی تھی، لیکن وہ عادتاً مجبور تھی، کچھ عشیہ کے ساتھ اس کا رقابت اور اندرونی دشمنی کا رشتہ تھا، بہنوں والی فطری محبت اور دوستی کی تو بات ہی نہیں تھی۔
''وہ ہے نا، شاہوار بٹو، تمہارا پوچھ رہا تھا۔'' عروفہ نے بالآخر اگل ہی دیا، عشیہ جو بے نیازسی کھڑی تھی، لمحہ بھر کے لئے اپنی جگہ پہ اچھل گئی، اسے اپنی سماعتوں پہ جیسے یقین نہیں آیا تھا۔
''کون شاہوار بٹو؟'' بہت دیر بعد عشیہ نے سنبھل کر اپنی حیرت اور بے یقینی پہ قابو پایا تھا، اس کے حیران ہونے پہ عروفہ کو طنز کرنے کے بہت سے موقع فراہم ہو گئے تھے۔
''ارے...... تم بھول بھی گئی؟'' وہ کمال چالاکی سے حیران ہونے کی اداکاری کر رہی تھی، عشیہ کا دل چاہا، اس کی ساری اداکاری کو ہوا کر دے، مگر عروفہ کو کچھ کہنے کا مطلب تھا، بھڑوں کے چھتوں میں ہاتھ ڈالنا، کیونکہ وہ مورے کی بہت لاڈلی تھی، جھوٹ سچ کچھ بھی ملا کر انہیں بتاتی، وہ یقین کر لیتی تھیں۔
''مجھے تو کچھ یاد نہیں۔'' عشیہ نے لب بھینچ لئے تھے۔
''میں یاد دلا دیتی ہوں۔'' وہ برجستہ جملہ اچک کر بولی تھی۔
''وہی نا، جو تمہیں اپنی عالیشان جیپ میں گھر تک چھوڑ گیا تھا۔'' عروفہ کے بتانے پہ عشیہ کی بھنویں تن گئی تھیں۔
''اچھا...... تو وہ تم ہی تھی، جس نے مجھے جیپ سے اترتے دیکھا تھا، پھر مورے کو شکایت لگا دی تھی، تمہیں شرم تو نہیں آتی، بہت کمینی ہو تم۔'' عشیہ کا دل چاہا اس کٹنی کی گردن ہی مروڑ ڈالے۔
''میں نے تو اسامہ کو گھر تک دوائیوں کا شاپر اٹھا کے لاتے ہوئے بھی دیکھا تھا، ویسے عشیہ تم کمال کے گٹس رکھتی ہو، باتوں میں ورغلا کر اچھے بھلے بندوں سے کام کروا لیتی ہو۔'' عروفہ کا تعریفی انداز بھی آگ لگا دینے والا تھا، عشیہ تو سرتاپا سلگ اٹھی تھی، اس کی برداشت اپنے اختتام تک پہنچ گئی تھی، وہ غصے میں جیسے پھنکار اٹھی تھی۔
''جس طرح کی تمہاری گھٹیا سوچ ہے نا، ویسی ہی تمہاری گھٹیا باتیں ہیں، میں تمہارے منہ ہی نہیں لگنا چاہتی، تم اس قابل ہی نہیں۔'' عشیہ کا رواں رواں سلگ رہا تھا، عروفہ پہ اس کی سلگن کا الٹا اثر ہوا، وہ خوب لطف اندوز ہو رہی تھی۔
''منہ لگنے کے قابل تم ہو بھی نہیں۔'' عروفہ نے مزہ لیتے ہوئے کہا تھا۔
''بائی داوے، یہ تو بتاتی جاؤ، تم سیریس کس کے ساتھ ہو، اسامہ یا شاہوار؟'' اس کے اگلے الفاظ عشیہ کو ہاتھ اٹھانے پر مجبور کر چکے تھے، اس کا ہاتھ کیا اٹھا، عروفہ کا دایاں گال سلگتا رہ گیا تھا، وہ جیسے شاکڈ رہ گئی تھی، اسے عشیہ سے یہ امید ہی نہیں تھی، عروفہ پہلے تو بے یقین اور ہکا بکا رہ گئی تھی پھر اس کا مارے غصے اور اشتعال کے برا حال ہو گیا تھا، وہ جیسے عشیہ پہ پل پڑی تھی۔
''تمہاری جرأت کیسے ہوئی مجھ پہ ہاتھ اٹھانے کی؟'' عروفہ کسی بپھری شیرنی کی طرح عشیہ کو گھور رہی تھی، مارے غصے کے کبھی مٹھیاں کھولتی تھی کبھی بند کرتی تھی، اس کا انگ انگ شرارے چھوڑ

رہا تھا۔

''اور تمہاری جرأت کیسے ہوئی میرے بارے میں بکواس کرنے کی۔'' عشیہ اب پرسکون تھی اور بڑے آرام سے بازو لپیٹے بات کر رہی تھی، جبکہ عروفہ کو خود پہ کنٹرول کرنا محال ہو رہا تھا۔

''میں نے جو کہا، سچ کہا، تم بالکل ایسی ہو، مورے ٹھیک کہتی ہیں، کام کے بہانے باہر نکلتی ہو اور غیر مردوں سے مراسم رکھتی ہو، پہلے شاہوار اور پھر اسامہ تمہارا پوچھتا پھر رہا تھا، تمہیں شرم نہیں آتی۔'' عروفہ نے جب زہر اگلنا شروع کیا تو پھر رکی نہیں تھی، اگلی پچھلی کسریں نکالنے لگی تھی۔

''جو بکتی ہو، بکتی رہو، میری جوتی کو بھی پرواہ نہیں۔'' عشیہ نے سر جھٹک دیا اور پلٹ کر بالکونی سے اتر آئی تھی، معاً اوپر آتی عمکیہ اس سے ٹکرا گئی، وہ شاید ان کی اونچی آوازوں کو سن کر بوکھلاتی ہوئی اوپر آ رہی تھی، عشیہ کو لال بھبھوکا دیکھ کر سہم گئی، اسے پتا لگ چکا تھا، عروفہ اور اس کی تکرار ہوئی ہے، عشیہ کا موڈ خراب تھا اور عروفہ کا اس سے بھی زیادہ خراب تھا۔

وہ جس انداز میں دھڑ دھڑ کرتی نیچے آئی تھی، پھر اسی تنفر کے ساتھ مورے کے کمرے میں گھس گئی تھی، عمکیہ کو پورا یقین ہو چلا تھا کہ یہ ضرور مورے کو عشیہ کے خلاف بھڑکا دے گی اور مورے بس عروفہ کی بات پہ یقین کرتی تھیں، عشیہ کو پوچھنا یا وضاحت لینا بہت دور کی بات تھی، یہ مورے کی سب سے بڑی کمزوری تھی، جس کا فائدہ سب سے زیادہ عروفہ اٹھاتی تھی، اب مورے کے کان بھرنے کے نتیجے میں جو گھمسان کا رن پڑنے والا تھا، عمکیہ ابھی سے ہی آنے والے حالات پہ شدید بے چین اور بیزار تھی۔

☆☆☆

نیل بر سر دار بنوا اپنی ہٹ اور ضد کی پکی تھی۔

جو کہہ دیا سو کہہ دیا، جو کر دیا سو کر دیا، پری کو نیل بر کی ضد پہ حامی بھرنی پڑی تھی، وہ سارے پھیلاوے کو ویسے ہی چھوڑ کر اپنے بابا سے ملنے کے لئے تیار ہو گئی۔

جب وہ دونوں جیپ پہ سوار ہو رہی تھی تبھی سبا خانہ بھی بالکونی میں لٹک کر ان دونوں کو جیپ میں بیٹھتا دیکھ رہی تھی جیسے ہی نیل بر نے جیپ کو اسٹارٹ کیا اسی پل سبا خانہ بھی چیل کی سی تیزی کے ساتھ بالکونی سے اتر کر ڈرائیو ے پہ بھاگتی ہوئی ان تک پہنچ گئی۔

نیل بر نے اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر گہرا سانس کھینچ لیا، پری بھی بیزار ہو چلی تھی اور نیل بر کی طرح ہی بے نیاز ہو گئی۔

''بھوری بلی نے رستہ کاٹ لیا ہے۔'' پری بھی دل ہی دل میں تلملائی تھی، جیسے نیل بر تلملا رہی تھی، کیونکہ سبا خانہ کی تفتیش کا آغاز ہو گیا تھا، وہ انہیں باہر نکلتا دیکھ کر رہ نہیں پائی تھی۔

''مجھے بھی صدر بازار تک لے جاؤ، کچھ نئے پرنٹ دیکھنے ہیں۔'' وہ یہی اندازہ لگا سکی تھی کہ نیل بر صدر تک جا رہی ہے، نیل بر نے اس کے غلط اندازے پہ دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔

''جانا تو صدر تک ہے، لیکن میں کپڑے کی دوکانوں پہ نہیں جا رہی۔'' نیل بر نے بڑی شائستگی کا مظاہرہ کیا تھا، سبا خانہ سے ٹکر لینا آسان تو نہیں تھا، اسے اچھے انداز میں ہی جواب دینا پڑتا تھا۔

''اچھا......'' سبا خانہ کا منہ اتر گیا۔
''ٹھیک ہے جاؤ تم۔''
''میں تمہیں کل لے جاؤں گی۔'' نیل بر نے اس کا اترا منہ دیکھ کر آفر کی تو سبا خانہ بے ساختہ خوش ہوگئی تھی، نیل بر نے گہرا سانس کھینچ کر جان جلدی چھوٹ جانے پہ خدا کا شکر ادا کیا تھا اور جیپ اسٹارٹ کر کے زن سے نکل گئی، جبکہ ڈرائیو بے پر کھڑی سبا خانہ کی مسکراہٹ اچانک سمٹ گئی تھی، اس کی آنکھوں میں ایک تیز کوندلیک آئی اور ہونٹ سیٹی کے انداز میں سکڑ گئے تھے۔
''ہوں......تو تم کہاں جارہی ہو نیل بر؟'' اپنی کنپٹی کو ٹھکورتی سبا خانہ بہت پرسوچ انداز میں زیرلب بڑبڑا رہی تھی۔
''آخر کہاں؟'' اس کا انداز ہنوز وہی تھا، پرسوچ اور سنجیدہ، چہرے پہ شدید تجسس کی پرچھائیاں تھیں۔
''پری کے ساتھ تم آخر کہاں جاسکتی ہو؟'' وہ اپنی سوچ کے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑا رہی تھی، بالآخر ایک واضح اور ٹھوس نکتے پر سبا خانہ کی سوچ ایک دم فریز ہوگئی تھی۔
''یعنی سرکاری بنگلے پہ؟ پری کو اس کے باپ سے ملوانے؟ جبکہ صندیر خان نے منع بھی کیا تھا پری سرکاری بنگلے پہ نہیں جائے گی، کیونکہ وہاں سرکار کا کوئی اکھڑ آفیسران دنوں تعینات تھا، تو یوں ہوا کہ آج نیل بر، پری کو وہاں لے گئی، صندیر خان کے منع کرنے کے باوجود، یعنی اس کے حکم کو کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے، ہوں تو نیل بر اب صندیر خان سے بھی ٹکر لے گی؟ تو بات یہاں تک آ پہنچی، لیکن سوچنے کا معاملہ تو یہ ہے، نیل بر اتنی خدا ترس کہاں سے ہوگئی؟ آج سے پہلے تو پری پہ ایسا رحم کبھی نہیں آیا؟ تو آج کچھ نئی بات تھی کیا؟'' وہ سوچتی رہی الجھتی رہی اور پھر ایک ٹھوس نکتے پہ منجمند ہوگئی۔
''ارے...... یہ تو سوچا ہی نہیں، سرکار کے بنگلے پہ ایک آفسر بھی تو موجود ہے؟ اور کہیں پری کے بہانے یہ نیل بر اس آفسر سے تو نہیں ملنے گئی؟ او مارا، میں نے یہ پہلے کیوں نہیں سوچا، سو فیصد یہی معاملہ ہوگا، یہی بات ہوگی، ایسا ہی ہوگا، ہر صورت ایسا ہی ہوگا، ورنہ نیل بر اور ایسی مہربانیاں کرے؟ قطعاً نہیں، ہرگز نہیں، کسی صورت نہیں۔'' سبا خانہ کا شاطر دماغ بہت دور کی کوڑی اٹھا لایا تھا، وہ اپنی سوچ کے ٹھیک طور پر سچ ہونے پہ پہلے سے ہی پر یقین تھا اور اب اسے کیا کرنا چاہیے تھا؟ بی جاناں کو بتانا چاہیے تھا؟ ان کی لاڈلی پوتی کے کرتوت؟ یا اپنے ماموں کو؟ یا پھر صندیر خان کو؟ وہ ہر بندے کو سوچ کے دائرے میں لاتے ہوئے خود بخود ریجیکٹ کرتی گئی تھی۔
اسے جہاندار کو بتانا تھا، بالکل جہاندار کو، اس سوچ کے آتے ہی سبا خانہ کے وجود میں پھریری اتر گئی تھی، اس نے لمحے کے ہزارویں حصے میں اپنی سوچ پہ عمل کرنے کی ٹھان لی تھی، دوسرے ہی پل وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس حصے کی طرف بڑھنے لگی جہاں پہ جہاندار کی پرنقشیں رہائش گاہ تھی، بنومحل سے کچھ الگ تھلگ، بارہ دری کے اس پار، پھولوں کی دیوار سے کچھ آگے۔
سبا خانہ کے وجود میں سنسنی خیز لہریں اتر رہی تھیں، وہ قریب قریب بھاگتی ہوئی جہاندار کے رہائشی حصے تک پہنچ گئی، سوئے اتفاق جہاندار برآمدے میں اپنی اسٹین گن کو صاف کرتا نظر آگیا تھا،

جیسے ہی اس کی سباخانہ پہ نظر پڑی، وہ اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔
''تم...... یہاں؟'' مارے حیرت اور بے یقینی کے جہاندار غصہ کرنا بھی بھول گیا تھا اور سباخانہ جیسے اس کے غصہ نہ کرنے پہ نہال ہو گئی تھی۔
''کیوں میں یہاں نہیں آ سکتی؟'' سباخانہ نے اترا کر پوچھا تھا، جہاندار نے نفی میں سر ہلایا اور اپنی بے یقینی پر قابو پاتے ہوئے لب بھینچ کر بولا۔
''ہرگز نہیں۔''
''کیوں؟'' سباخانہ کی اتراہٹ کچھ کم ہوئی تھی، اس کا منہ بھی اتر گیا، ایک تو جہاندار کو مروتاً بھی دل رکھنا نہیں آتا تھا، ایسے منہ پھاڑ کر جواب دے دیتا تھا، چاہے کسی کا دل ٹوٹ کر چکنا چور ہی کیوں نہ ہو جاتا۔
''کبھی تو دل رکھ لیا کرو۔'' سباخانہ نے شکوہ کیا، لہجے میں آزردگی بھر گئی تھی، جہاندار کے ماتھے پہ بل آئے۔
''میں نے دل رکھنے کے لئے کرائے پہ مکان نہیں لے رکھا، اپنے دل کو پاس ہی رکھو اور جلدی سے یہاں، اس جگہ اور اس احاطے سے دور نظر آؤ۔'' اس کا لہجہ دوٹوک قسم کا تھا، سخت اور انتہائی کھردرا، سباخانہ کا دل بھر آیا، مجال تھی جو کبھی نرمی سے بات کر لیتا، ہر وقت سات پتھر اٹھائے رکھتا تھا۔
''جاتی ہوں، میری بات تو سن لو۔'' سباخانہ بھی مزید بے عزتی کروانے سے باز آتی جلدی جلدی مطلب کی بات پہ آ گئی تھی، جہاندار نے کوئی دلچسپی نہ لیتے ہوئے کہا۔
''وہاں آتا ہوں تو سن لوں گا تمہاری بات۔'' وہ شدید بیزار تھا، سباخانہ کے دل کو دھکا سا لگا، دو منٹ بھی اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔
''ابھی سن لو، تمہارے مطلب کی بات ہے۔'' سباخانہ پہ بھی ضد آ گئی تھی، ایسے تو ایسے ہی سہی، وہ بات سنا کر ہی جائے گی، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔
جہاندار صاف صاف انداز میں سخت زچ ہوا تھا، اس کے چہرے پہ بیزاری بھی پھیلی تھی، موڈ بھی آف ہوا، پھر کچھ سوچ کر اس نے سباخانہ سے کہا۔
''ایک منٹ ہے تمہارے پاس، جلدی بولو۔'' وہ گھڑی پہ نگاہ جما کر کھڑا تھا، سباخانہ کو اس کی عجلت پہ غصہ تو بڑا آیا تھا مگر پی گئی تھی۔
''کچھ نیل بر کا پتہ ہے، اس کے باڈی گارڈ تو بنے پھرتے ہو۔'' سباخانہ کو اپنے ہی انداز میں چرکے لگانے کی عادت تھی، اس کی توقع کے عین مطابق وہ چونک گیا تھا۔
''ابھی تو گھر میں موجود تھی۔'' جہاندار کا انداز پرسوچ ہو گیا، اس کے چہرے پہ اضطراب بھی لہرایا تھا۔
''کچھ دیر پہلے نا، اب تو وہ چلی گئی۔'' سباخانہ کو اسے مضطرب دیکھ کر بڑا مزہ آیا تھا۔
''کہاں گئی؟'' اس نے لمحوں میں اسٹین گن سنبھالی، چابیاں اٹھائیں اور عجلت میں بولا۔
''یہ تو تمہیں پتا ہونا چاہیے۔'' سباخانہ اور بھی زیادہ لطف اندوز ہو رہی تھی، اس کی فطرت تھی

دوسروں کی پریشانی سے لطف اٹھانا۔

''تو میں پتا لگا لوں گا۔'' وہ آگے بڑھ رہا تھا، سباخانہ اسے جاتا دیکھ کر لپکتی ہوئی پیچھے آ گئی۔

''اور اگر میں بتا دوں تو؟'' اچانک سباخانہ کا اس کے سامنے آ جانا جہاندار کو رکنے پہ مجبور کر گیا تھا، وہ بادل نخواستہ رک گیا تھا، لیکن اس کے چہرے پہ شدید جھنجھلاہٹ اور غصہ تھا، نیل بر کے بغیر بتائے جانے کا غصہ تھا یا سباخانہ کے زچ کرنے پہ؟ وہ سمجھ نہیں پا سکی تھی، تاہم جہاندار کے رکنے پہ خوش ضرور ہوئی تھی۔

''بولو۔'' وہ زبان سے نہیں آنکھوں سے استفسار کر رہا تھا، سباخانہ کچھ دیر تک چپ کھڑی رہی، پھر بڑے دلکش انداز میں بتانے لگی۔

''وہ پری کو لے کر گئی ہے۔'' اسے قسطوں میں بتا کر وہ اور بھی لطف اندوز ہو رہی تھی، جہاندار کو تپانے کا بھی اپنا ہی مزہ تھا۔

''کہاں؟'' جہاندار نے تلملا کر پوچھا، وہ جانتا تھا، سباخانہ کو پتا ہے اور جان بوجھ کر اسے زچ کر رہی ہے۔

''دم تو لو بتاتی ہوں۔'' سباخانہ نے مسکرا کر کہا تھا، جہاندار کے ضبط کی انتہا ہو گئی تھی۔

''بولتی ہو یا میں چلا جاؤں؟'' جہاندار کی دھمکی بڑی کارگر تھی، سباخانہ فوراً پٹری پہ آ گئی۔

''وہ پری کو لے کر اس کے بابا خان سے ملوانے گئی ہے۔'' سباخانہ نے بالآخر راز اگل دیا تھا، جہاندار کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

''لیکن خان تو نہیں ہے، وہ تو اپنے سسر کی عیادت کے لئے گیا ہے۔'' جہاندار کے بتانے پر سباخانہ کے یقین پہ اور ہی مہر لگ گئی تھی۔

''ہوں تو گویا میرا اندازہ ٹھیک تھا۔'' سباخانہ اپنے اندازے کی سچائی پہ کھل اٹھی تھی، اس کا چہرہ بھی روشن ہو گیا تھا، جہاندار اسے الجھی نظروں سے دیکھتا رہا۔

''کون سا انداز؟'' جہاندار کے پوچھنے پر وہ بے ساختہ چونک گئی تھی۔

''یہی کہ پری کو لے کر وہ کسی اور کام کا ارادہ کر کے گئی ہے۔'' اس کی الجھی بات نے جہاندار کو بھی الجھا دیا تھا، لیکن وہ بلا کا زیرک تھا، اس کی ہر بات کو سمجھ رہا تھا، پھر بھی تصدیق کے لئے پوچھنا ضروری تھا۔

''کون سا کام؟''

''کیا تم یقین کرو گے؟'' سباخانہ کے پوچھنے پر وہ زچ ہوا تھا۔

''ہاں۔'' وہ جان چھڑوانے والے انداز میں بولا۔

''کیا واقعی؟'' سباخانہ ایک مرتبہ پھر کھل اٹھی تھی۔

''میں جاؤں کیا؟'' جہاندار نے صرف دھمکی نہیں دی تھی، وہ تیز قدموں سے چل بھی پڑا تھا، سباخانہ اسے جاتا دیکھتی رہی تھی، اس دفعہ وہ سامنے بھاگ کر نہیں آئی تھی، بلکہ اونچی آواز میں اسے رکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''وہ بنگلے کے آفسر سے ملنے گئی ہے، مجھ سے لکھوا لو۔'' سباخانہ کے الفاظ جہاندار کا دماغ

بھک سے اڑا گئے تھے، وہ نہ صرف رکا تھا بلکہ ایک جھٹکے کے ساتھ پلٹ بھی آیا۔

☆☆☆

جیپ پتھریلے رستوں پہ دوڑ رہی تھی۔

اور ایک طرف شفاف پانی کی ندی بہہ رہی تھی، یہ ندی عام دیسی مچھلی کی بہتات سے دور دور تک مشہور تھی، اپنے ذوق کی تشفی کے لئے آنے والوں کا ایک ہجوم ندی کے کنارے دکھائی دیتا تھا، دیگر ندیوں کے برعکس اس کے قرب و جوار میں آبادی خال خال ہی نظر آتی تھی، اس کے باوجود دور دراز سے آئے لوگوں کا ایک ہجوم بیکراں دکھائی دیتا تھا۔

وہ بڑی مشتاقی سے ڈرائیونگ کر رہی تھی اور پری اس کے پیچھے بیٹھی آنکھیں میچے بلند آواز میں کلمہ طیبہ کا ورد کر رہی تھی، ہر چھوٹی کھائی اور گڑھے میں گھس کر جیپ کا ہچکولے کھانا پری کو مسلسل خوفزدہ کر رہا تھا، لیکن وہ نیل بر پہ اپنا خوف ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی، نیل بر گاہے بگاہے بیک مرر میں اس پہ نظر ڈالتی اور مسکرا کر پوچھتی۔

''تمہیں تو ڈر نہیں لگ رہا؟''

''نئیں بی بی! ام کو ڈر نہیں لگ رہا۔'' پری نے تیسری مرتبہ کپکپاتی آواز پہ قابو پا کر بتایا تھا، اپنے الفاظ کے برعکس وہ شکل سے بہت گھبرائی لگ رہی تھی۔

''لگنا بھی نہیں چاہیے، تم ام کے ساتھ ہے۔'' نیل بر نے اس کے لہجے کی نقل اتاری تھی، پری نے اپنا ورد روکنے کی کوشش نہیں کی تھی، وہ مسلسل بے آواز ورد کرتی رہی۔

''اللہ جی! ام کو ابھی جینا ہے، ام کو مرنا نہیں۔'' وہ زیر لب بڑبڑا رہی تھی جب نیل بر نے ذرا گردن گھما کر اسے دیکھا۔

''تم کیا بولتا ہے پری گل۔'' اس کے لبوں پہ شرارتی مسکراہٹ تھی، پری گل ذرا گھبرا گئی، فوراً نفی میں سر ہلایا تھا۔

''کچھ نہیں، ام کیا بولے گا؟ بس یہی سوچتا ہے کہ تم گاڑی بہت اچھا چلاتا ہے۔'' اس نے بمشکل ہی اڑاتا ہے کہنے سے خود کو روکا تھا۔

''اچھا۔'' نیل بر بے ساختہ خوش ہو گئی تھی، پھر اس نے ایکسلیٹر پہ پاؤں رکھا اور اسپیڈ کچھ اور بڑھا دی تھی، یوں کہ پری گل کی رنگت ہلدی کی مانند زرد ہو گئی، اس کے حواس جاتے رہے تھے۔

''تم کو پتا نہیں پری گل، میں وہاں یورپ میں کیسے گاڑی اڑاتی تھی، میرے جیسی ڈرائیونگ تو کوئی بھی کر نہیں سکتا۔'' نیل بر نے مصنوعی کالر اکڑائے تو پری گل نے گھگیائی آواز میں کہا۔

''بی بی! تم اب بھی کم گاڑی نہیں اڑا رہا، ام کو اپنی جان کے لالے پڑ رہے ہیں۔''

''کون سے لالے؟ صندیر خاناں اور شاہوار؟'' نیل بر کو ٹھیک سے سمجھ نہیں آئی تھی۔

''کچھ نہیں جی، تم سامنے دیکھو، گنہ گار پہاڑی کا پل آ رہا ہے۔'' پری نے اس کی توجہ سامنے مبذول کروائی تو نیل بر بھی چونک گئی تھی۔

''اس گنہ گار پہاڑی کے پیچھے قبرستان ہے نا؟'' نیل بر کا انداز سوچتا ہوا تھا، پری نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

''ہاں جی، حمت بی بی کے اجداد کا۔'' پری کے پاس اس حوالے سے کافی معلومات تھیں، نیل بر سمجھ کر ہنکارا ابھرا تھا اور اچانک اسے خیال آیا۔

''ویسے ایک بات کی سمجھ نہیں آتی۔'' نیل بر نے ایک مشکل موڑ کاٹ کر پری کی طرف دیکھا تو وہ دہلتے ہوئے بمشکل بول پائی تھی۔

''کس بات کی؟'' اس دفعہ پری نے محض سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''یہی کہ حمت کی ماں کو بابا نے اپنے قبرستان میں دفن کیوں نہیں ہونے دیا؟ وہ اس کے ننھیالی قبرستان میں کیوں دفن ہیں؟'' نیل بر کے اتنے گہرے سوال پر کچھ پل کے لئے پری اپنا سارا خوف بھول بھال گئی تھی۔

یہ سوال حمت نے بھی کتنی مرتبہ کیا تھا، تب بھی پری پہلے حیران ہوتی تھی پھر چونک جاتی، پھر ایک دن پری نے اپنے نانا سے پوچھ ہی لیا تھا تب نانا نے اسے جو بات بتائی تھی وہ آج تک پری کے دل میں دفن تھی، نانا نے اسے سختی کے ساتھ منع کیا تھا کہ اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کرنا اور پری اتنی ناسمجھ نہیں تھی جو اس بات کو سمجھتی ہی نا۔

''پری گل! تم بتا سکتی ہو کیا؟'' نیل بر نے اچانک اسے مخاطب کیا تو وہ بے ساختہ چونک کر گھبرا گئی تھی۔

''ام کو کیا پتا بی بی! ام تو تب پالنے میں بھی نہیں ہوگا۔'' پری نے اپنے کپکپاتے لہجے پہ بمشکل قابو پالیا۔

''میں حمت سے پوچھوں گی۔'' پری کا جواب سن کر نیل بر نے اپنا ارادہ ظاہر کیا تھا، پری برجستہ ہی بول پڑی تھی۔

''حمت بی بی کو تو خود بھی نہیں پتا۔''

''تو پھر کس کو پتا ہے؟'' نیل بر نے اسے گھور کر پوچھا تھا، پری فوراً ہکلائی تھی۔

''ام کو کیا پتا۔'' وہ صاف انجان بن گئی تھی۔

''کیا بی جاناں کو خبر ہوگی؟ یا بابا کو۔'' نیل بر کا انداز خود کلامی سا تھا۔

''میں ان سے پوچھوں گی۔'' اس نے جیسے ارادہ باندھ لیا تھا، پری کھڑکی سے باہر ایسے جھانکنے لگی تھی جیسے اس کام سے بہتر کوئی اور کام نہ ہو، پھر اس نے اچانک نیل بر کو احساس دلایا۔

''وہ سامنے سرکار کا بنگلہ۔'' پری کے چیخ کر بتانے پہ نیل بر بھی سوچوں کے اژدہام سے باہر نکل آئی تھی۔

پھر جیپ ایک ہی جھٹکے کے ساتھ بنگلے کی حدود میں داخل ہو کر رک گئی تھی، خان اپنے کیبن سے آواز سن کر افتاں خیزاں باہر نکل آیا تھا، سامنے خانزادوں کی جیپ دیکھ کر اس کی جان نکل گئی تھی، خانزادوں کی جیپ کا سرکاری بنگلے میں کیا کام تھا؟

وہ گھبراتا ہوا قریب آیا تو جیپ کے دروازے کھول کر نیل بر اور پری باہر نکلتی دکھائی دی تھیں، خان پری کو دیکھ کر اتنا خوش نہیں ہوا تھا جس قدر نیل بر کو دیکھ کر متحیر رہ گیا۔

''ایک مرتبہ پھر؟'' اس کا ذہن پیچھے کی طرف پھیرا لگا بمشکل حال میں پلٹا تھا، نیل بر کیوں

بار بار یہاں آرہی تھی؟ خیریت تو تھی نا؟

خان گھبراتا، گھبراتا ان کے قریب پہنچا تو پری بے ساختہ اپنے باپ سے لپٹ گئی تھی، خان بیٹی سے مل کر خانزادی کی طرف متوجہ ہوا۔

''بی بی!......تم یہاں؟'' خان خاصا بوکھلایا ہوا نظر آرہا تھا، نیل بر اردگرد کے ماحول پہ بے نیازی کے ساتھ نگاہ ڈالتی خان کی طرف متوجہ ہوئی، پھر اس نے پری کی طرف اشارہ کیا۔

''اس کو ملوانے لائی ہوں، بہت اداس ہو رہی تھی۔'' اس کا انداز لاپرواہ سا تھا، وہ مسلسل اردگرد کے ماحول کو جانچ رہی تھی، اس کی نظروں کا فوکس بنگلے کا رہائشی حصہ تھا، اس کی آنکھوں میں کسی کی تلاش صاف نظر آرہی تھی، اس کے چہرے پہ ہلکا ہلکا نا معلوم اضطراب بھی نظر آتا تھا، پری بھی بار بار نیل بر کی بے قراری کو ملاحظہ کر رہی تھی، کچھ دیر تک تینوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی، جسے خان کی آواز نے توڑا تھا۔

''بی بی! ام تمہاری کیا خدمت کرے؟ آپ اندر بیٹھک میں چلو۔'' خان بوکھلاہٹ میں بمشکل بول سکا تھا، نیل بر کچھ دیر تک سوچتی رہی، پھر اس نے کندھے اچکا دیئے تھے، یعنی اس نے بیٹھنے کا ارادہ ظاہر کر دیا تھا۔

''امارا صاحب تو ابھی نہیں آیا۔'' خان نے ایسے ہی برائے بات کہی تھی، نیل بر ایک پوری جان سے چونک گئی تھی، اس کے خان کی تقلید میں بڑھتے قدم ایک دم رک گئے تھے، اسے لمحہ بھر کے لئے یہ لگا تھا جیسے ساری تپسیا بیکار چلی گئی ہے، اس کی امیدوں پہ اوس گر گئی تھی، دل کی کلیاں یکے بعد دیگرے مرجھاتی چلی گئی تھیں۔

''کیوں؟'' نیل بر کہتے کہتے رک گئی تھی، اس کا چہرہ ایک دم بجھ گیا، پری نے بہت چونک کر نیل بر کے تاثرات دیکھے تھے، اس کا جوش وخروش ماند پڑتا نظر آرہا تھا، پھر وہ لمحہ بھر بھی رکے بغیر بمشکل خود پہ بشاشت طاری کرتے ہوئے بولی۔

''پری گل! تمہیں شام کو ڈرائیور لے آئے گا، میں اب چلتی ہوں۔'' اس نے دو لفظوں میں بات مکمل کی اور بے مرادسی تیز تیز قدموں کے ساتھ اپنی جیپ کی طرف چلتی چلی گئی تھی جبکہ پری ہکا بکا سی اسے دیکھ رہی تھی، نیل بر کا رویہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

☆☆☆

پھر پھپھو فرح کے جانے کا دن بھی قریب آ گیا اور فرح پھپھو اکیلی نہیں جا رہی تھیں بلکہ اس دفعہ ولید بھی ان کے ساتھ جا رہا تھا اور نشرہ کا دل تب سے ہی ایک دبیز اداسی کی لپیٹ میں تھا، جی چاہتا تھا منہ سر لپیٹ کر کسی تنہا گوشے میں پڑ کر لمبی تان کے سو جائے، کبھی نہ اٹھنے کے لئے۔

اسے خبر تھی، فرح پھپھو اور ولید کے جاتے ہی اس کا کیا حشر ہونے والا تھا، وہ جو ایک نامعلوم ڈھال تھی یوں لگتا تھا ٹوٹنے کے قریب تھی، ولید کے جاتے ہی بے سروسامانی کا احساس ہو جاتا، یوں لگتا، وہ اتنے اجنبیوں کے ہجوم میں بالکل اکیلی رہ گئی ہے۔

اس وقت بھی وہ طوطوں کو باجرہ ڈالتی گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر افسردہ سی بیٹھی سوچ رہی تھی جب اچانک کوئی دبے قدموں سے چلتا ہوا اس کے قریب آ گیا تھا، نشرہ اپنی سوچوں میں اس قدر

گم تھی کہ چونک بھی نہیں سکی، آنے والے کو خود ہی گلا کھنکھار کر احساس دلانا پڑا۔

''سوچوں کے کس جزیرے میں ڈبکیاں لگا رہی ہو؟ ارد گرد کا کچھ ہوش نہیں۔'' وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے نرمی سے بولا تو نشرہ ایک دم چونک کر اچھل پڑی تھی، پھر اس پہ نظر پڑی تو جیسے جان میں جان آئی۔

''اسامہ بھائی! آپ نے ڈرا دیا مجھے۔'' اس نے بمشکل اپنے ہکلائے لہجے پہ قابو پا کر کہا تھا۔

''اب تو ڈرنا چھوڑ دو نشرہ! یہاں ڈرنے والوں کا گزارہ نہیں۔'' اسامہ نے گہرا سانس کھینچ کر جتلایا تو نشرہ کا چہرہ اتر گیا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں، مگر ہر کوئی آپ کی طرح بہادر تو نہیں ہے۔''

''بہادر بننا پڑتا ہے نشرہ ڈیئر! ورنہ تو لوگ ہمیں ڈرا ڈرا کر مار دیں۔'' اسامہ کا انداز ناصحانہ تھا، وہ باجرے کی کٹوری سے مٹھی بھر باجرہ ہتھیلی میں لے کر پھونک سے اڑانے کا شغل کر رہا تھا۔

''تو ایسے کوئی اسم مجھے بھی سکھا دیں۔'' نشرہ یاسیت سے بولی۔

''خود کو اسٹرونگ کرو نشرہ! اب تو تمہارے ساتھ ایک مضبوط حوالہ بھی ہے۔'' اسامہ اسے نئے رشتے کا احساس دلا رہا تھا، ولید اور نشرہ کا تعلق، ایک نیا اور مضبوط رشتہ۔

''پتا نہیں کیوں؟ میرا دل بہت ڈرتا ہے اسامہ بھائی، جیسے کوئی خوشی مجھے راس نہیں آئے گی۔'' وہ اپنے اندر پنپتے خدشات اور وہموں کو اسامہ سے چھپا نہیں پائی تھی، ایک اسامہ ہی تو تھا جس سے نشرہ اپنے دل کا حال کہہ کر بوجھ سے خود کو آزاد کر لیتی تھی، یہ اور بات تھی کہ اسامہ مہینوں بعد اس عقوبت خانے میں آتا تھا اور یہ بہت ہی اچھا تھا، یہاں پہ کون سا اس کے بہت منتظر محبت کرنے والے لوگ آنکھیں بچھا کر بیٹھے تھے۔

پھر وہ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے، اسامہ اسے چھوٹی چھوٹی باتیں سمجھا رہا تھا، زندگی کے اتار چڑھاؤ نشیب و فراز، وہ پہلے بھی اسے سمجھایا کرتا تھا، امید دلاتا تھا، دلاسہ دیتا تھا، اسامہ جب بھی اس گھر میں لوٹ کر آتا تم از کم نشرہ کو امید کا کوئی نہ کوئی سرا تھما جاتا تھا، اس کی باتوں میں زندگی دھڑکتی تھی اس کی باتوں سے زندگی پگھلتی تھی۔

☆☆☆

گاڑی ڈسٹرکٹ دیامر کی حدود میں داخل ہو گئی تھی۔

اور راستہ انتہائی پر پیچ تھا، جس کے دونوں جانب پتھروں سے تین تین فٹ اونچی دیوار چنی گئی تھی، گاڑی کے برابر ایک ٹھنڈے پانی کی ندی رواں تھی، بلکہ یوں کہنا مناسب تھا، پتھروں کے بیچ میں پانی رواں دواں تھا، پتا نہیں آب رواں نے از خود یہاں گزر گاہ بنالی تھی یا لوگوں نے گزر گاہ آب کو اپنا رستہ بنا لیا تھا، دو کلو میٹر رستہ انتہائی صبر آزما تھا، پانی میں پڑے بے ترتیب پتھروں پہ ہچکولے کھاتی گاڑی رینگ رینگ کر آگے بڑھ رہی تھی۔

اس سے آگے بھی رستہ ہموار نہیں تھا، تاہم ڈرائیور خاصی مہارت سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا، انام پر پیچ رستے کی تمام تر ہولناکی سے بے نیاز عجیب و غریب سوچوں میں الجھ رہا تھا، آج جب

سے سفر کے دوران وہ گھر سے نکلا تھا، مسلسل اپنے گھر والوں کو یاد کر رہا تھا، خاص طور پر شانزے کو، اس کے رویے کو، اس کی اکھڑی ہوئی باتوں کو۔

اسے شانزے کے بدلتے رویے کا محرک سمجھ نہیں آ رہا تھا، وہ اس سے اتنی بددل کیوں تھی، بیزار کیوں تھی، گو کہ شانزے کے بدلتے رویے نے اسے کوئی خاص دکھ نہیں دیا تھا تاہم پھر بھی وہ اپنی سوچوں کو روک نہیں پا رہا تھا۔

پھر یہاں آنے کے بعد امام خود بھی یا تو ان برفیلے پہاڑوں کی طرح ہر احساس سے بے نیاز ہو کر سرد ہو گیا تھا یا پھر کام کے لوڈ نے اسے ہر ایک چیز سے بے نیاز کر دیا تھا، یوں کہ شانزے کی بے نیازی بھی اسے تکلیف نہیں دے رہی تھی، یا پھر ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی ان دونوں کے درمیان موجود بچپن کا وہ تعلق جو ایک بے نام خیال کی طرح تھا، آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا تھا، اپنی حیثیت کھوتا جا رہا تھا۔

رات کو امام شانزے سے کھانے پہ نہ آنے کی معذرت کرنے گیا تھا، لیکن اسے وہاں جا کر خاصا دھچکا لگا، مامی نے اسے بتایا شانزے خاصی مصروف ہے، کالج کی کچھ فائلوں پہ کام کر رہی ہے، پھر اسے لیکچر تیار کرنا ہے، وہ یہاں نہیں آ سکتی، مطلب نیچے آ کر امام کی بات نہیں سن سکتی، امام کے لئے یہ بات انتہائی شاکڈ کر دینے والی تھی، یعنی شانزے ایک لمحے کے لئے بھی نیچے آنے کا وقت نہیں نکال سکتی تھی، وہ جتنا حیران ہوتا کم تھا۔

لیکن اب یہاں آنے کے بعد یہ حیرانگی بھی آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی اور کچھ ہی دیر بعد وہ اسلام آباد کی ہر چیز کو بھول کر موجودہ ماحول میں رچ بس گیا تھا، ارد گرد خطرناک مناظر کو دیکھتا وہ اچانک سردار بٹو کی فیملی کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

اسے اندازہ تھا جو تحریری منظور شدہ اجازت نامہ وہ ہیڈ آفس سے لے کر آیا تھا، اس کے بعد جیسے ہی اس نے سرویئر والے علاقے یہ تعمیراتی کام کا شیڈول پاس کروانا تھا، سردار بٹو کی طرف سے شدید ردعمل کی اسے ابھی سے ہی توقع تھی۔

وہ اسے کسی بھی حد تک جا کر ٹارچر کر سکتے تھے، امام ہر قسم کی توقع رکھتا تھا اور خود کو ہر طرح کے حالات سے نمٹنے کے لئے تیار کر چکا تھا، اسے بے خوف و خطر اپنا کام شروع کروانا تھا اور اس کے ارادے بہت مضبوط اور پختہ تھے۔

ابھی وہ موجودہ آفیسر کو فون کال کے ذریعے اپنے آنے کی اطلاع دینا ہی چاہتا تھا جب اچانک گاڑی کا ایک ٹائر کسی گڑھے میں پھنس گیا، گاڑی کو زوردار جھٹکا لگا تھا اور امام کی سوچوں کو بھی بریک لگ گئے تھے، ویسے تو اب تک کا سفر بغیر کسی دشواری کے طے پا رہا تھا، لیکن اس گڑھے سے نکلنے کے بعد اچانک دور سے خوشنما نظر آنے والے گلیشیر نے بڑی مصیبت کھڑی کر دی تھی، گو کہ گلیشیر کو کاٹ کر گاڑیوں کے گزرنے کا رستہ بنا دیا گیا تھا مگر برف پگھلنے سے اس قدر پھسلن ہو چکی تھی کہ بظاہر وہاں سے گزرنا انتہائی مشکل نظر آتا تھا، اگر اس تنگ رستے پر جیپ کاریں ٹرک ذرا سا بھی ڈھلوان کی طرف پھسل جاتے تو کسی کے بچ نکلنے کی امید نہیں تھی۔

گو کہ ڈرائیور بہت مشاقی سے ڈرائیو کر رہا تھا، لیکن قدرت کی طرف سے ہونی کو کون ٹال

سکتا تھا، اچانک گاڑی کے پہیے برف پر اس انداز میں پھسلے کہ محض لمحہ ہی لگا تھا اور گاڑی ڈھلوان کی طرف کسی گولی کی مانند تیزی کے ساتھ گرنے لگی، یوں کہ امام نے آنکھیں میچ کر کلمہ طیبہ کا ورد کرنا شروع کر دیا۔

''تو کیا وقت آخر آ گیا تھا؟'' اس کی آخری سوچ نے بس یہیں تک پرواز کی تھی۔

☆☆☆

وادی میں مینہ برس رہا تھا اور وہ اس بورڈ کے سامنے کھڑی تھی جس کے اوپر مٹے مٹے لفظوں میں ''مقامی صحت و مرکز'' لکھا تھا، اس کے سر پہ پاپلر اور منگورہ کے پہاڑ جھکے ہوئے تھے اور ان میں دور کہیں بیال ہوگا، جو بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

سامنے منگورہ کا صدر مقام تھا اور وہ گردن زرافے کی طرح اٹھا کے سامنے موجود عمارت کو دیکھ رہی تھی، اسی عمارت کے اندر پری گل کے نانا پچھلے ایک ہفتے سے ایڈمٹ تھے۔

بخار بگڑ کر خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا، یوں پری گل کے نانا کو ہسپتال داخل ہونا پڑا، پری گل نانا کے پاس جانا چاہتی تھی، جب اس نے حمت سے روتے ہوئے درخواست کی تو حمت سے رہا نہیں گیا تھا۔

جہاندار کسی کام کے سلسلے میں علاقے سے دور تھا، شاہوار بہت کم یہاں آتا تھا، زیادہ تر اپنے ہٹ میں قیام کرتا تھا، یا پھر اسلام آباد چلا جاتا تھا

جہاندار نہ ہوتا تو یوں لگتا تھا جیسے سارے کام رک گئے ہیں، سردار بنو کے محل کا سارا انتظام جہاندار کے دم سے چلتا تھا، وہ نہ ہوتا تو جیسے کچھ نظر ہی نہ آتا۔

اب یہ بھی نہیں تھا کہ جہاندار صدیوں سے بنو محل میں رہتا آ رہا تھا، پچھلے صرف چند سال میں اس نے پورے بنو محل کو اپنے کنٹرول میں لے لیا تھا، وہ کہاں سے آیا تھا؟ کیوں آیا تھا؟ کسی مجبوری کے تحت آیا تھا؟ کوئی نہیں جانتا تھا، اپنی وضع قطع، شخصیت اور بول چال سے وہ اس علاقے کا نہیں لگتا تھا۔

وہ تعلیم یافتہ تھا، خوش لباس، خوش گفتار، وہ کسی بھی بڑے شہر میں اچھی نوکری کر سکتا تھا، پھر اسے بنو محل میں آنے کی کیا ضرورت تھی؟

کوئی اور سوچتا یا نہ سوچتا، حمت ضرور سوچتی تھی، کیونکہ وہی اس گھر میں سب سے زیادہ فارغ رہنے والی ہستی تھی جس کے پاس کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا، پھر وہ سوچتی کیوں نا اور سوچوں پہ تو کوئی پہرے بیٹھا نہیں سکتا نا، سوچیں تو لپک لپک کر اس آر کیالوجسٹ تک بھی جاتی تھیں، جو جانے کہاں چلا گیا تھا؟ شاید ہمیشہ کے لئے؟ اپنا کام ادھورا چھوڑ کر، دل اتنا بے چین ہوتا کہ وہ محل کی راہداری میں چل چل کے تھکنے لگتی تھی۔

کیا اس کا دل اس اسامہ جہانگیر نامی اجنبی کا ''اسیر'' ہو رہا تھا؟ کیا یہ سچ تھا؟ کیا ایسا ٹھیک تھا؟ ہر سوالیہ نشان کے سامنے ایک خاموشی کا سائن بورڈ چمک رہا تھا، نہ ہاں میں جواب آتا، نہ ہی ناں میں، کیا اسے اپنے دل کو اس اجنبی کے لئے بے قابو کرنا تھا؟ نہیں، ہرگز نہیں۔

اسے پنپتی ہوئی خواہشوں، منہ زور تمناؤں کو روکنا تھا، اسی مقام پہ، اسی موڑ پہ، وہ خود کو روگ کیوں لگا لیتی؟ خود کو آزمائشوں اور امتحان میں کیوں ڈالتی۔

حمت کی ذرا سی بیوقوفی کسی کی جان نکال سکتی تھی، ہمیشہ کی نیند سلا سکتی تھی۔
جیسے جیسے وہ سردار بٹو کے بارے میں سوچ رہی تھی، اس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا، دل میں پھوٹتی نئی نئی تمناؤں کی کونپلیں خود بخود سوکھتی جا رہی تھیں، یہاں تک کہ حمت کا دل پہلے کی طرح ہی سپاٹ بے رنگ اور اجاڑ رستہ بن گیا تھا، جس پر سے کسی اجنبی کا گزر ہی نہ ہوا ہو۔
آخر وہ کیوں بھول گئی تھی، وہ پربت کی ایک قیدی شہزادی تھی، اس قید سے نکلنے کا تصور کرنا بھی گناہ تھا، پھر وہ گنہ گار کیوں ہوئی؟ اس نے لمحاتی طور پر ہی سہی، کیوں اس قید سے نکلنے کے بارے میں سوچا تھا؟ وہ بھی اسامہ جہانگیر کو پل بنا کر، کیا وہ خود غرض تھی؟
نہیں، ایسا ہرگز نہیں تھا۔
وہ اپنی نوکیلی سوچوں سے تنگ آ چکی تھی، دل گھٹن سے بھرا تھا، حبس ہی حبس، دھول ہی دھول تھی، شاید وہ اونچی آواز میں رونا شروع کر دیتی، اپنی بھڑاس آنسوؤں کے ذریعے نکال لیتی، لیکن تب ہی پری گل روتی دھوتی پہنچ گئی تھی۔
''ام کو نانا سے ملنے جانا ہے، ابھی کے ابھی۔'' پری گل کا مدعا جان کر حمت ساری سوچوں کو جھٹک کے جہاندار کو ڈھونڈتی ہوئی باہر آئی تو پتا چلا کہ جہاندار تو ہے نہیں، وہ کچھ پریشان ہو گئی تھی، اب کیا کرے؟ پھر اسے صندیر خان آتا دکھائی دیا تھا، کیا اسے صندیر خان سے کہنا چاہیے تھا؟
ابھی وہ اسی تانے بانے میں الجھی تھی جب صندیر خان اس کے قریب سے گزرتا ہوا رک گیا تھا، آج تو بڑا ہی مبارک دن تھا، صندیر خان حمت کے قریب سے گزرا اور رک گیا، بڑی حیرت کا مقام تھا۔
''کوئی مسئلہ ہے؟'' صندیر خان گو کہ زبان سے نہیں بولا تھا تاہم اس کی آنکھوں میں یہی سوال لکھا نظر آ رہا تھا، حمت کو غش آتے آتے رہ گیا۔
''ہاں...... نہیں۔'' وہ ذرا گھبرا گئی تھی۔
''ہاں یا نہیں؟'' صندیر خان نے ایک بھوں اچکا کر پوچھا۔
''ہاں۔'' وہ گہرا سانس کھینچ کر غیر ارادتا بولی، صندیر خان چونک گیا۔
''کیا؟''
''پری گل کے نانا بیمار ہیں، ہسپتال تک جانا ہے۔'' بالآخر حمت نے کہہ ہی دیا، کیونکہ صندیر خان خاصی فرصت میں کھڑا پوچھ رہا تھا، اتنا تو وہ کبھی بھی مہربان نہیں رہا تھا، پھر نجانے کیا بات تھی، ایسی مہربانی کی توقع کم از کم صندیر خان سے کرنا عبث ہی تھا۔
''تو پھر؟'' وہ جیسے وجہ جاننا چاہتا تھا، آیا حمت کیا چاہتی ہے۔
''جہاندار نہیں ہے تو۔'' حمت کچھ بولتے بولتے رک سی گئی تھی، صندیر خان گہرا سانس کھینچتا جیسے سمجھ گیا۔
''پری گل کو لے آؤ، میں تم لوگوں کو ہسپتال لے جاتا ہوں۔'' وہ اپنے صاف دوٹوک اور ٹھہرے لہجے میں جواب دیتا بارہ دری کی طرف بڑھ گیا تھا، حمت پہ جیسے شادی مرگ کی کیفیت

طاری تھی، وہ تیزی سے اندر کی طرف آئی، پری گل کو ساتھ لیا اور پھر صندیر خان کے ہمراہ مقامی ہسپتال آ گئی۔

پری گل کے نانا کی صحت انتہائی خراب تھی، حمت کافی دیر روتی ہوئی پری گل کو دلاسہ دیتی رہی، جب وہ کچھ سنبھل کر نارمل ہوئی تو حمت ہوا خوری کے لیے باہر آ گئی۔

صندیر خان کچھ دیر کے لئے انہیں ہسپتال چھوڑ گیا تھا، حمت ٹہلتے ٹہلتے کوریڈور کی طرف آئی تو ایک کھلے کمرے میں بینڈیج کرواتے نوجوان کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

گو کہ نوجوان کو معمولی چوٹیں لگی تھیں لیکن دو تین میڈیکل اسٹاف کے لوگ اور ایک ڈاکٹر بڑے محتاط انداز میں اس کا معائنہ کر رہے تھے جبکہ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں، مجھے کچھ نہیں ہوا، اب مجھے جانے دیں۔''

''آپ کو خاموشی سے بیٹھنا ہوگا امام فریدے صاحب، ورنہ آپ کی شکایت اوپر لگا دی جائے گی۔'' ڈاکٹر نے خاصی شائستگی کے ساتھ اسے ڈانٹا تھا، امام فریدے کی طرح حمت بھی اوپر شکایت لگانے والی بات پہ چونک گئی تھی، ایسے ہی غیر ارادتاً وہ ان کی باتیں سننے کے لئے رک گئی۔

''اوپر یعنی؟'' امام نے بہت سنجیدگی سے الجھے الجھے لہجے میں دریافت کیا تھا، ڈاکٹر اپنے مصروف انداز میں کچھ بلند آواز میں بولا۔

''شاہوار بٹو کو۔'' جہاں امام شاہوار بٹو کے نام پہ ٹھٹک گیا تھا وہیں حمت بھی پوری جان سے زخمی اجنبی کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

''میں سمجھا نہیں۔'' امام نے چونک کر پوچھا، حمت بھی بے چینی سے کھڑی تھی کہ ڈاکٹر جانے اب کیا جواب دے؟

''ارے کمال ہے، آپ کو وہی تو لائے ہیں یہاں، زخمی حالت میں، گو کہ آپ کو اتنی چوٹیں نہیں لگی تھیں، لیکن سر پہ کوئی کنکر یا نوکیلی چیز کے لگنے سے بے ہوش ہو گئے تھے، آپ کو شاہوار بٹو یہاں ایڈمٹ کروا کے گئے ہیں اور انہوں نے کہا ہے جب تک آپ صحت یاب نہیں ہو جاتے، ہمارے تسلط میں رہیں گے۔'' ڈاکٹر کا انداز آخر میں کچھ مزاحیہ سا ہو گیا تھا، امام جیسے سمجھ گیا اور اجنبی مسیحا کے لئے اس کے جذبات نرم ہو گئے تھے۔

''اچھا..... تو شاہوار بٹو صاحب مجھے یہاں پھینک کر دوبارہ نہیں آئے۔'' امام نے مسکرا کر پوچھا تھا اور اس کی مسکراہٹ اتنی معصومانہ شفاف اور دل کھینچ لینے والی تھی کہ حمت لمحہ بھر کے لئے سراہے بغیر نہیں رہ سکی تھی، وہ اسے دیکھنے میں اتنی محو تھی کہ امام نے بے اختیار گردن موڑ کر کھلے دروازے سے باہر دیکھا تھا، شاید کسی کی نگاہوں کے ارتکاز نے امام کو چونکایا تھا، حمت نے جیسے ہی امام کو خود کی طرف متوجہ دیکھا تو گڑبڑا کر آگے بڑھ گئی تھی، لیکن اب کہ چونکنے کی باری امام کی تھی، وہ نہ صرف چونکا تھا بلکہ ٹھٹک بھی گیا تھا، اس کے تاثرات چونکنے اور ٹھٹکنے سے بھی کچھ آگے کے تھے، وہ حیران نہیں تھا، وہ تو اچھا خاصا شاکڈ لگ رہا تھا اور یہ کیفیت اس قدر حاوی تھی کہ وہ ڈاکٹر کی چیخ و پکار کو نظر انداز کرتے ہوئے کرسی گھسیٹتا اٹھا اور تیزی سے کوریڈور کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

حمت نے جیسے ہی کرسی سے اٹھتے زخمی اجنبی کو دیکھا وہ پہلے تو حیران ہوئی تھی پھر اسے اپنے

پیچھے آتا دیکھ کر بری طرح خوفزدہ ہوئی اور اندھا دھند بھاگتی ہوئی کوریڈور کا موڑ مڑ کر ایک کمرے میں گھس گئی، وہ اجنبی اسے کیوں ڈھونڈ رہا تھا؟ وہ اجنبی اس کا پیچھا کیوں کر رہا تھا؟
کمرے کا دروازہ بند کرتی حمت خوف سے نیلی پڑتی تیز تنفس کے ساتھ مسلسل سوچ رہی تھی اور اسے یوں لگ رہا تھا دروازے کے پار اس اجنبی کو متجسس حیران اور عجیب سے تاثرات میں ڈھلی آنکھیں اسے دیکھ رہی ہیں، ان آنکھوں میں کیا تھا آخر؟ ان آنکھوں میں کیا بجلی کی طرح لپک رہا تھا؟ حمت آنکھیں بند کرتی خوف سے کپکپاتی تھر تھر کانپتی مسلسل سوچ رہی تھی اور اس کا تنفس جیسے بگڑتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

گھر ڈھونڈنے میں ہیام کو قطعاً دشواری کا سامنا کرنا نہیں پڑا تھا۔
اسی گلی کی آخری نکر میں تھا گھر، جس کا گیسٹ روم ڈاکٹر ہیام کا منتظر تھا، اسے امید تھی، گھر کی طرح اس کے لئے مخصوص کیا گیا کمرہ بھی اچھا ہی ہوگا۔
صبح اٹھتے ہی بیا کی کال سن کر ہیام نے بغیر ناشتہ کیے اپنی تیاری کر لی تھی، بیگ میں ٹھونس ٹھونس کر کپڑے گھسائے تھے اور دھونے والے کپڑوں کی الگ پیک کیے تھے، سوچا تھا وہیں جا کر دھوئے گا، صاف گھر اور صاف ماحول میں، یہاں تو سرکاری پانی نہانے کے لئے بھی نہیں ملتا تھا کپڑے دھونا تو دور کی بات تھی، اپنے سڑے ہوئے مالک مکان کے منہ پر چابی مار کر بڑے کروفر سے احسان منزل کے گیٹ پہ کھڑا تھا اور گھنٹی پہ ہاتھ رکھ کے ہٹانا بھول گیا تھا۔
لیکن اس گھر کے مکین جیسے کانوں سے بہرے تھے یا اتنے بے حس کے سن کر بھی باہر آنے کے روادار نہیں تھے، ہیام کو گھنٹی پہ ہاتھ رکھنے کے باوجود ہول اٹھنے لگے، نہ تو گھنٹی خراب تھی نہ لائٹ ندارد تھی پھر یہ لوگ دروازے تک آنے کی زحمت گوارا کیوں نہیں کر رہے تھے؟
ہیام تو کھڑے کھڑے ناک تک عاجز آ گیا اور یہاں تک کہ وہ اس گھر کے مکینوں پہ لعنت ڈالتا واپسی کے رستوں کا شمار کرنے لگا کہ اچانک قسمت مہربان ہوگئی اور دروازہ کھٹاک کی آواز کے ساتھ کھل گیا تھا۔
اور آنے والی ہستی دنیا سے بیزار، خونخوار، انتہائی بدمزاج، ہیام گہرا سانس کھینچتا جیسے صبر کے گھونٹ بھر کے رہ گیا تھا۔
''کیا ہے؟ صبح سویرے مانگنے کے لئے آ جاتے ہو، منہ اٹھا کر۔'' آنکھیں مسلتا، جمائیاں لیتا وہ جوان ہیام کو سرتاپا جلا کر راکھ کر گیا تھا، اس کی آنکھیں کھل گئیں، تیور بگڑ گئے، ایک تو انتظار کی کوفت اوپر سے آنے والے جوان کی بکواس، اس کے تو سر پہ لگی تھی۔
''میں تمہیں فقیر دکھائی دیتا ہوں؟'' ہیام کا دل چاہا تھا آگے بڑھ کے اس کے سارے حواس ایک ہی پنچ کے ساتھ جگا ڈالے، جوان نے لمبی سی جمائی لے کر اسے سرتاپا دیکھا اور پھر تھوڑا سنبھل کر بولا۔
''اچھا...... اچھا تو دھوبی ہو، یار کیا صبح سویرے متھے آ لگے، ویسے اس گھر میں کوئی رواج نہیں کپڑے دھلوانے کا باہر سے، تم چلتے پھرتے نظر آؤ، کسی اور کا دروازہ بجاؤ، کہیں سے کام مل جائے

گا۔'' وہ میلے کپڑوں کی ابل ابل کر باہر نکلتی گٹھری کو دیکھ کر کہہ رہا تھا، ہیام کو ایک مرتبہ پھر خون کے گھونٹ بھرنا پڑے تھے، تحمل کا دامن کھینچنا پڑا تھا، صبر کا جام پینا پڑا تھا، ورنہ دل تو چاہ رہا تھا، اس سوئی صورت کے سارے حواس ایک ہی جھانپڑ میں جگا ڈالے۔

''میں تمہیں دھوبی دکھائی دیتا ہوں؟'' وہ زہر خند سا بمشکل بھینچی آواز میں چیخا، وہ اس کے چیخنے پہ اب کہ تھوڑا آنکھیں کھول کر باریک بینی سے جائزہ لیتا ٹھٹک گیا۔

گورا چٹا، خوبصورت انگریزوں سا جوان، نہ تو فقیر لگ رہا تھا، نہ دھوبی نہ کوئی چور اچکا، تو پھر یہ کون تھا؟ کپڑوں سے لدا پھندا؟ اس کی الجھن بڑھ سی گئی تھی۔

''تو پھر کون ہو تم؟'' اب کہ خاصا انسانوں والا سوال کیا گیا تھا، ہیام نے گہرا سانس کھینچ کر بولا۔

''کرائے دار۔''

''او...... ہوا اچھا اچھا، تو تم پہنچ گئے، جس کا شدت سے انتظار تھا، ہماری والدہ ماجدہ کو، ظاہر ہے، کمرہ کرائے پہ چڑھا کر تین ہزار ماہوار کمیٹی بھی تو ڈالنی تھی، ہماری والدہ بہت آگے کا سوچتی ہیں، تو تم ہو ڈاکٹر ہیام، مجھ سے ملو، میں اس گھر کا اکلوتا لائق فائق چشم و چراغ، نامی گرامی آرکیالوجسٹ، تاریخ کا دل دادہ، نگر نگر کا باسی، گھر میں میری اوقات چوکیدار جتنی بھی نہیں، مجھے اسامہ جہانگیر کہتے ہیں، والدہ حضور کی سب سے ناپسندیدہ ترین ہستی، مجھ سے مل کر یقیناً تمہیں خوشی محسوس ہوئی ہوگی، اپنا تعارف میں نے اس لئے کرا دیا کیونکہ میری والدہ نے اگلے دو دن تک تمہیں میری ساری ہسٹری بمعہ مثالوں کے ساتھ سنا دینی تھی، اس لئے بہتر جانا کہ تمہیں خود سے بتا دوں، اندر آؤ۔'' وہ انتہا کا باتونی آرکیالوجسٹ ہیام سے بھی باتوں میں چار ہاتھ آگے لگتا تھا، اس کے آگے آگے لپک جھپک بیرونی سیڑھیاں چڑھتا اوپر والے حصے کی طرف آ گیا تھا۔

یہ ایک بڑا سا فرنشڈ روم تھا، گداز کارپٹ، خوبصورت فرنیچر، اٹیچ باتھ روم، ایک دروازہ اندر کی طرف کھلتا تھا، جس کی سیڑھیاں نیچے لاؤنج میں تائی کے حصے میں اترتی تھیں۔

اسی کمرے کی ایک کھڑکی اس حصے میں کھلتی تھی جو چاچی کا اوپر لاؤنج کہلاتا تھا، یعنی اس کمرے کا مکین دونوں گھروں کا سانجھا ہمسایہ کہلا سکتا تھا۔

کمرہ دیکھ کر ہیام کی ساری کوفت جھنجلاہٹ اور غصہ جاتا رہا تھا، اتنے مہینوں کی تپسیا جیسے کام آ گئی تھی، وہ اندر تک پرسکون اور سرشار سا ہو گیا، یوں لگ رہا تھا جیسے ساری تھکاوٹ اتر گئی ہے۔

''شکر کرو، ولید کی منگنی ہوئی اور وہ یہاں سے گیا، ورنہ تمہارے نصیب میں یہ ٹھاٹ باٹ کہاں آنے تھے؟ یہ کمرہ ولید کے تسلط میں تھا، آہ تم ولید کو کہاں جانتے ہو گے، اپنی فرح پھپھو کا بیٹا ہے، نشرہ کا منگیتر، بنتا تو اس نے عینی کا تھا، کیونکہ کوششیں ادھر سے جاری تھیں، قسمت نشرہ کی کھل گئی، ایسے کیا دیکھ رہے ہو، نشرہ بہن ہے میری، چچا کی بیٹی، یتیم، مظلوم اور بس کیا بتاؤں، رہو گے تو پتا چل جائے گا، نہ بھی چلا تو ہماری والدہ خود سارے سچے جھوٹے کھول کھول کر بتائیں گی، انہیں کرائے داروں کے سامنے مظلوم بننے کا ازل سے جنون ہے، آؤ یہاں بیٹھو، آج تو مہمان ہو، اوپر سے فاقہ زدگان بھی لگتے ہو، میں تمہارے لئے نشرہ سے کہہ کر ناشتہ بنوا لاتا ہوں، پھر اپنا انتظام کر

لینا، ہماری والدہ سے توقع مت رکھنا، وہ ایک دن کے مہمان کو برداشت کرتی ہیں، یا اس مہمان کو جھیل سکتی ہیں جس سے انہیں فائدہ ملنے والا ہو، اینی وے تم ذرا فریش ہو لو، میں نیچے سے ہو کر ابھی آیا۔'' مسکراتا ہوا اسامہ اس کا بیگ ٹھکانے لگا کر نیچے کیا گیا ہیام نے کھل کر سانس لی اور بے ساختہ کمرے کے خوشگوار ماحول کو دیکھ کر ہرا کا نعرہ لگایا، طبیعت اتنی سرشار تھی کہ فریش ہونے کی ضرورت ہی نہیں تھی، پھر بھی اس نے اسامہ کی بات مان کر باتھ روم کا رخ کر لیا تھا، اتنے صاف ستھرے باتھ روم میں نہانے کا مزہ بھی الگ تھا، جب وہ اسامہ کی باتوں پہ غور و غوض کرتا باہر نکلا تو اسامہ کو ایک مرتبہ پھر کمرے میں موجود پایا، اب کی دفعہ وہ خاصا مسکراتا ہوا اسامہ کے قریب آیا۔

''مجھے ایسے ہی رہائشی کمرے کی تلاش تھی، میں اب بہت پرسکون فیل کر رہا ہوں، تھینک یو سو مچ۔'' ہیام کے مارے جذبات کے الفاظ ہی ختم ہو چکے تھے، اسامہ بے ساختہ معنی خیزی سے ہنستا رہا۔

''آں، ہاں مکان تو پسند آ گیا، دعا کرو مکین بھی پسند آ جائیں۔'' اس کی معنی خیزی کو ہیام سمجھ گیا، آخر پورا استاد تھا، اسامہ کا ہم پلہ۔

''میری زندگی کے دو ہی اصول ہیں، یا کسی کے بن جاؤ، یا کسی کو اپنا بنا لو۔'' اس نے اسامہ کی بات کا جواب اسی کے انداز میں دیا تھا، اسامہ معنی خیزی سے مسکراتا ہوا بے ساختہ ہنس پڑا۔

''واہ، تم نے تو مجھے متاثر کر لیا۔''

''ذرہ نوازی ہے جناب کی۔'' ہیام نے عاجزی کا مظاہرہ کیا، کچھ ہی دیر میں وہ دونوں ایسے گفتگو کر رہے تھے جیسے ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں، صدیوں سے ایک دوسرے کے شناسا ہوں اور ہمیشہ سے لمبی لمبی ہانکتے اور چھوڑتے آ رہے ہوں۔

جیسے اس وقت اسامہ انگریز کے وقتوں میں اپنے نادیدہ مربعوں کے قصے سنا کر ہیام کو مرعوب کرنا چاہ رہا تھا۔

''میرے ابا کے ابا انگریز کے ٹاؤٹ تھے، پورے چغل خور، لگائی بجھائی میں ماہر، بس ان کی اسی خوبی کی بنا پر انگریز میرے ابا کے ابا کو کئی مربع ایکٹرز مین دے گیا، لیکن ہوا کچھ یوں کہ ابا کے ابا کو زمینداری سے کوئی شغف نہیں تھا، انہوں نے کئی مربع ایکٹرز مین اونے پونے بیچ باچ کر اپنی پرانی سیٹ سنبھال لی، چغل خوری کی۔'' اسامہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے اب وہ چھوڑ رہا تھا، کہ اگر ابا سن لیتے تو جوتا اٹھا کر اس کی دھلائی کر دیتے۔

''اور میرے ابا کے ابا؟ کچھ نہ پوچھو، ہندوستان کے مہاراجہ تھے، بڑے بڑے اصطبل، سینکڑوں گھوڑے اور بگھیاں، کنیزیں آگے پیچھے، لونڈیاں ہاتھ باندھے، دولت ایسی کہ سمیٹی ہی نہ جاتی تھی۔'' ہیام نے بھی اسامہ کے اسٹائل میں اپنی کہانی بنی کہ اسامہ اس سے اچھا بھلا متاثر ہوتا دکھائی دیا تھا۔

''اتنے گھوڑے اور کنیزیں؟'' اسامہ کے منہ میں پانی بھر آیا۔

''ایک آدھ کنیز میرے لئے بھی لے آتے۔''

''ابا کے ابا کی تھیں، میری نہیں، میرے پاس تو کنیز کی روح بھی نہیں، جس کے سامنے ہاتھ

جوڑ کر کپڑے ہی دھلوا لینا۔'' ہیام نے چڑ کر بتایا۔
''اور میرا خیال ہے ہمیں اب حقیقت کی دنیا میں آ جانا چاہیے، کیونکہ دروازہ بج رہا ہے۔'' ہیام کے اشارہ کرنے پہ اسامہ تیزی سے اٹھا تھا پھر لپک کر دروازہ کھولا تو ایک ہاتھ اندر کی طرف آیا، ہاتھ میں ٹرے تھی اور ساتھ ہلکی سی نم نم آواز بھی۔
''انڈے ختم تھے، آملیٹ نہیں بنا، سالن اور کباب ہیں، ساتھ دہی اور اچار، چائے کچھ دیر تک لاتی ہوں۔'' آواز میں بلا کا بوجھل پن تھا، اسامہ ٹرے پکڑ کر عادتاً وہیں کھڑے کھڑے تقریر کرنے لگا تھا۔
''ابھی تک غم زدہ ہو، حد ہے نشو، ولید کوئی ہمیشہ کے لئے تھوڑی گیا ہے آتا جاتا رہے گا، اب میں تمہیں غمگین نہ دیکھوں۔'' اسامہ کی محبت بھری جھاڑ پہ نشو نامی لڑکی کی آواز تھوڑی اونچی ہوئی تھی۔
''ولید کے جانے کا دکھ اپنی جگہ اسامہ بھائی، میں تو پیاز کاٹتے ہوئے رو رہی تھی، آملیٹ بنانا تھا نا۔'' نشرہ نے وضاحت کی تو اسامہ فوراً چونک اٹھا۔
''مگر انڈے تو نہیں ہیں۔'' وہ بھی تو اسامہ تھا، کیسے چوک جاتا۔
''آپ کے اور اس مہمان کے لئے نہیں ہیں، باقیوں کے لئے تو ہیں نا۔'' نشرہ کی معصومیت کا کوئی انت نہیں تھا اور اسامہ جیسے کھڑے کھڑے کباب ہو گیا تھا، جلتا کسلتا ٹرے سمیت مڑا، ٹانگ سے دروازہ بند کیا اور غصے میں بھناتا ہیام تک آیا۔
''دیکھ لی تم نے ان سب کی کمینگی، یہ مجھ پردیسی کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں، ایک انڈہ تک نہیں دیتے اور میں بھی نجانے کیوں ہر آٹھ مہینے بعد اس گھر پہ تھوکنے کے لئے آ جاتا ہوں۔'' اب وہ مارے غصے کے ہیام کو پوری ہسٹری سنا رہا تھا، وہ نہ بھی سناتا تو یہ کام نیچے والوں نے کر دینا تھا، خود کو مظلوم بنا بنا کر، ہیام بمشکل ہنسی چھپاتا اس کی داستان امیر حمزہ سن رہا تھا۔
''میں تو انڈہ نہیں کھاتا، تم بھی صبر کرو یہ اتنا کچھ تو ہے نا۔'' ہیام نے جیسے اسے تسلی دی تھی، ویسے بھی صبح سوکھے توس کھانے والے ہیام کے لئے یہ ٹرے من و سلویٰ سے کم نہیں تھی۔
''چلو یہی غنیمت سہی، ویسے بھی صابر شاکر ہوں، میں تو تمہارے لئے کہہ رہا تھا۔'' اسامہ نے اور برائیوں کا سلسلہ ختم کر کے ناشتے کی طرف توجہ کی تو اسے اچانک یاد آ گیا۔
''اب میں تو چلا جاؤں گا، جانے نشرہ کا یہاں کیا حال ہو، ولید بھی نہیں۔'' اس کی سرگوشی کو کہ ہیام نے سن لی تھی، پھر بھی کوئی تبصرہ نہیں کیا۔
''کمینی کچھ کہے نہ کہے، میری والدہ ماجدہ سے کچھ امید نہیں، پھپھو کے قیام تک صبر سے بیٹھی تھیں اس خاموشی کے پیچھے ایک طوفان چھپا ہے۔'' اسامہ کے تبصرے مسلسل جاری تھے۔
''طوفان؟'' ہیام ناشتہ کرتے کرتے اچانک چونکا، اوف طوفانوں سے اسے بڑا خوف آتا تھا۔

(جاری ہے)

سباس گل

''مما! میں آج اسکول نہیں جاؤں گا۔''
سات سالہ حمزہ نے ناشتے کی میز پر منہ بنا کر کہا۔
''کیوں نہیں جاؤ گے؟'' نمرہ نے اس کو پیار سے دیکھا۔
''میرے پیٹ میں درد ہے مما؟'' حمزہ نے مسکین سی صورت بناتے ہوئے جواب دیا۔
''کوئی درد نہیں، آپ اپنا ناشتہ فنش کریں اسکول سے دیر ہو جائے گی۔''
''رہنے دو نا، بچے کے پیٹ میں درد ہے چھٹی کر لینے دو آج۔'' سرمد نے بیٹے کی حمایت کی۔
''یہ پیٹ کا درد ہمیشہ ہمارے بیٹے کو صبح اسکول جاتے وقت ہی کیوں ہوتا ہے؟'' نمرہ نے مسکراتے ہوئے شوہر کی آنکھوں میں دیکھ کر سوال کیا۔
''بھئی وہ تو ہمیں بھی اس عمر میں ہوا کرتا تھا تمہارے پیٹ میں بھی درد ہوتا ہوگا عین اسکول جانے کے وقت۔'' سرمد نے مسکراتے ہوئے پراٹھا ختم کیا۔
''اب ایسا بھی نہیں تھا ہمارے امی ابو ہمیں چھٹی نہیں کرنے دیتے تھے اسکول سے چاہے ہم کتنے ہی درد کا شور مچاتے، منہ بناتے حتیٰ کہ آنسو بھی نکال کر دکھا دیتے تھے تب بھی اسکول سے غیر حاضری نہیں ہونے دیتے تھے ہماری، چھٹی تو بس کلینڈر کے حساب سے یا وہی سردی گرمی کی مخصوص چھٹیاں ہوتی تھیں تو ہی اسکول سے جان چھٹتی تھی ہماری۔''
''اچھا تو تم اپنے ساتھ ہونے والی اس زبردستی کا بدلہ اپنے معصوم بیٹے سے لے رہی ہو اسے ہر حال میں اسکول بھیج کر۔'' سرمد نے نمرہ کی بات سن کر ہنس کر کہا۔
''جی نہیں، میں تو بچوں کی نفسیات کی بات کر رہی ہوں کہ اسکول نہ جانے کے بہانے ہوتے ہیں بچوں کے پیٹ میں درد، سر میں درد، ٹانگوں میں درد وغیرہ وغیرہ، جانتے ہیں نہ کہ اور کون سا نظر آتا ہے جو والدین دیکھ کر فیصلہ کریں گے کہ ہے یا نہیں ہے۔''
''یعنی مجھے آج بھی اسکول جانا پڑے گا؟'' حمزہ نے ماں باپ کی باتیں سن کر نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہا۔
''جی میری جان! آپ کو آج بھی اسکول جانا ہوگا اور چند روز میں آپ کے اسکول میں دسمبر کی چھٹیاں ہو جائیں گی نا پھر آپ مزے سے گھر پہ رہنا۔'' نمرہ نے بہت پیار سے حمزہ کو فرائی انڈہ کھلاتے ہوئے کہا۔
''میں چھٹیوں میں بھی گھر پہ رہوں گا؟''
''تو اور کہاں؟'' سرمد نے پوچھا۔
''چھٹیوں میں تو میں کہیں دور سیر کے لئے جاؤں گا پاپا! میرے سب فرینڈز اپنے کزنز کے گھر جاتے ہیں۔'' حمزہ نے سرمد کو دیکھتے ہوئے بتایا تو وہ دونوں ہنس پڑے۔
''تو بیٹا جانی! ہم بھی اس بار سردیوں کی چھٹیاں گزارنے کراچی جائیں گے، آپ کے نانا ماموں اور کزنز کے گھر ٹھیک ہے؟'' نمرہ نے حمزہ

کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو وہ خوش ہو کر بولا۔

''سچی۔''

''سچی مچی، ماما کی جان، چلیں اب آپ جلدی سے ناشتہ فنش کریں ورنہ اسکول سے دیر ہو جائے گی۔''

''اوکے ماما۔'' وہ دودھ کا گلاس اٹھا کر دودھ پینے لگا۔

''تم بھی نا ڈکٹیٹر بن جاتی ہو۔'' سرمد نے مسکراتے ہوئے محبت سے اپنی بیوی کو دیکھتے

ہوئے کہا تو وہ ہنس کر بولی۔

''اور آپ جمہوریت کے علمبردار بن جاتے ہیں جناب! چند روز بعد دسمبر کی تعطیلات شروع ہونے والی ہیں اس لئے میں چھٹی نہیں کرنے دے رہی حمزہ کو۔'' نمرہ نے وضاحت کی۔

''کہہ تو تم بھی ٹھیک رہی ہو۔''

''ناشتہ ہو گیا بیٹا! اسکول چھوڑ آؤں؟'' سرمد اپنا ناشتہ ختم کر کے اٹھتے ہوئے بولا آج اس کا دیر سے آفس جانے کا موڈ تھا۔

''جی پاپا!'' حمزہ بھی کرسی چھوڑتے ہوئے بولا، نمرہ نے ٹشو سے حمزہ کا منہ صاف کیا اس کا ماتھا چوم کر اس کے ہاتھ چومے، سرمد ہر صبح یہ منظر دیکھتا تھا اور مسکرائے جاتا تھا۔

''اللہ حافظ ماما!'' حمزہ نے مسکراتے ہوئے سرمد کی انگلی پکڑی اور باہر گاڑی کی طرف جاتے ہوئے اسے الوداع کہا۔

''اللہ حافظ ماما کی جان!'' نمرہ نے اسے ممتا بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بہت محبت سے جواب دیا اور تب تک باہر کھڑی رہی جب تک سرمد گاڑی پورچ سے نکال کر باہر نہیں لے گیا تھا، ان کے جاتے ہی اس نے اندر آ کر ضروری چیزیں سمیٹیں اپنی چائے ختم کی اور ناشتے کے برتن کچن میں بنے سینک میں رکھ کر دھونے لگی، سردی اور دھند کافی تھی، اس نے سرمد کے پہننے کے لئے گرم سوٹ نکالا تھا، اسی دوران سرمد، حمزہ کو اسکول چھوڑ آیا تھا اور آتے ہی شاور لینے چلا گیا پھر نہا کر تیار ہو کر ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی آن کر کے بیٹھ گیا اور ساتھ ساتھ اخبار پر بھی نظریں دوڑانے لگا۔

''آج کی تازہ خبر سب سے پہلے سب سے آگے دیکھئے ''الرٹ'' نیوز پر ایکسکلیو مناظر کے آپ کا اپنا چینل۔'' ٹی وی کی آواز نمرہ کے کانوں میں پڑ رہی تھی وہ ڈائننگ ٹیبل صاف کرتے ہوئے وہیں سے بولی تھی۔

''سرمد! کتنی بار کہا ہے آپ سے صبح صبح یہ نیوز چینلز مت لگایا کریں ہر وقت تو ان پر بریکنگ نیوز چلتی رہتی ہیں کچھ بریک ہو نہ ہو نیوز کاسٹرز کے انداز لب و لہجے ایسے ہوتے ہیں جیسے کچھ بریک کرا کے ہی دم لیں گے صبح صبح بریکنگ نیوز ہارٹ اٹیک کرانے کے لئے کافی ہوتی ہیں۔''

''ہاں تمہاری بات صحیح ہے مگر کبھی کبھی واقعی کوئی بڑی بری اور بریکنگ نیوز بھی ہوتی ہے۔'' سرمد نے جواباً کہا۔

''ہاں وہ تو اب ہر روز ہی ہوتی ہیں اللہ ہمارے ملک پر عوام پر رحم فرمائے آمین۔''

''آمین۔'' سرمد بولا۔

اچانک نیوز چینلز پر ایک یہ خبر گردش کرنے لگی تھی ''آرمی اسکول پشاور'' پر دہشت گردوں کے حملے کی خبر جسے سنتے ہی سرمد کے اوسان خطا ہو گئے اخبار ہاتھوں سے گر گیا، اس کے حمزہ کا اسکول تھا یہ تو۔

''او مائی گاڈ!'' سرمد کے منہ سے نکلا۔

''کیا ہوا؟ پھر کوئی بریکنگ نیوز آئی ہے؟'' نمرہ نے کچن میں جا کر سینک پر ہاتھ دھوتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بہت بڑی بری اور بریکنگ نیوز ہے نمرہ۔''

''تو آپ ٹی وی بند کر دیں ناں، دل ہولائے دیتی ہیں یہ بریکنگ نیوز۔''

''نمرہ! جلدی سے یہاں آؤ دیکھو کیسی المناک خبر چل رہی ہے۔'' سرمد چلایا۔

''کیا ہوا سرمد؟'' نمرہ دوڑتی چلی آئی۔

''یہ دیکھو ہمارے حمزہ کے اسکول پر دہشت گردوں نے حملہ کیا ہے اب تک بیس بچوں کی

شہادت کی خبر آ چکی ہے اور دہشت گرد ابھی تک اسکول کے اندر موجود ہیں۔'' سرمد نے بے چینی، بے قراری اور اضطراری کی سی کیفیت میں نمرہ کو بریکنگ نیوز سنائی تو جیسے نمرہ کی ریڑھ کی ہڈی میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔

''حمزہ! میرا حمزہ!'' نمرہ کی ٹانگوں میں تو جیسے جان ہی نہیں رہی تھی وہ ایکدم سے صوفے پر ڈھے گئی، سرمد نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے نظریں ٹی وی پر مرکوز تھیں۔

''یا اللہ رحم، یا اللہ رحم، یا اللہ رحم۔'' نمرہ زاروقطار روتے ہوئے دعا مانگ رہی تھی، آنکھوں کے سامنے حمزہ کا خوبصورت معصوم چہرہ گھوم رہا تھا۔

''یا اللہ! ہمارے بچوں کی حفاظت فرمانا، یا اللہ میرے حمزہ کی حفاظت کرنا، یا اللہ خیر کرنا ہمارے سارے بچوں پر رحم کرنا سب ماؤں کی گودیں بھری رکھنا، ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک سلامت رکھنا۔'' سرمد بھی پرنم لہجے میں دعا کر رہا تھا، یکایک نمرہ نے سرمد کا بازو پکڑ کر اسے جھنجھوڑا۔

''سرمد! میرا بیٹا ہے وہاں مجھے...... میرا بیٹا لا کر دیں...... حمزہ کو واپس لے کر آئیں...... وہ ڈر رہا ہوگا، رو رہا ہوگا...... میرا بیٹا...... میرا حمزہ ...... مجھے لا کر دیں سرمد۔''

''چلو ہم حمزہ کے اسکول جاتے ہیں اپنے بیٹے کو گھر لے کر آتے ہیں بس تم خود کو سنبھالو، حوصلہ رکھو، دعا مانگو انشاء اللہ ہمارے بچوں کو کچھ نہیں ہوگا، پولیس اور آرمی ہے نا وہاں وہ سب سنبھال لے گی۔'' سرمد نے ٹی وی آف کر دیا، گاڑی کی چابی اٹھائی اور نمرہ کو سمجھاتا، تسلی دیتا، سنبھالتا ہوا باہر لے آیا، گاڑی میں بیٹھتے وہ حمزہ کے اسکول کی جانب روانہ ہو گئے۔

جوں جوں ''آرمی پبلک اسکول پشاور'' میں حملے کی خبر پھیل رہی تھی ملک بھر بھی بے چینی اور دکھ کی فضا بنتی جا رہی تھی، اسکول میں اس وقت دو ہزار افراد موجود تھے، خبروں میں بتایا جا رہا تھا کہ دہشت گرد ایف سی کے کپڑوں میں ملبوس ہیں، ہر گزرتے لمحے کے ساتھ معصوم بچوں کی شہادتوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، آرمی پولیس اور دیگر سیکورٹی فورسز اہم سرکاری عمارتوں چوراہوں اور ہسپتالوں کے باہر تعینات کر دی گئیں تھیں، آرمی پبلک اسکول کے باہر لوگوں کی بہت بڑی تعداد جمع ہو چکی تھی، وہ والدین جن کے بچے اسکول میں پڑھنے گئے وہ باہر کھڑے تھے بے بسی اور خوف سے رو رہے تھے اپنے بچوں کی سلامتی سے واپسی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

نمرہ اور سرمد بھی پاگلوں کی طرح اپنے حمزہ کی آمد کے منتظر تھے، جس قیامت کا ذکر سنتے پڑھتے آئے تھے یوں لگ رہا تھا آج وہ قیامت آ گئی ہے، ماں باپ اپنے جگر گوشوں کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے بے یار و مددگار، بے بس، روتے تڑپتے ایک کرب، اذیت اور عذاب سے گزر رہے تھے وہ، بے بسی سی بے بسی تھی۔

ہنستے مسکراتے بچے جو صبح گھر سے پڑھنے کے لئے اسکول گئے تھے اب ان کے معصوم چہروں پر موت کی سفا کی ڈیرا ڈالے بیٹھی تھی، سینکڑوں ماؤں کی گودیں آن کی آن میں اجڑ گئیں تھیں، والدین کے لئے اپنے بچوں کو شناخت کرنا مشکل ہو رہا تھا، خون میں لت پت ان معصوموں کے یونیفارم تھے، کتنوں کے چہرے مسخ تھے، ایک ایک بچے کو کئی کئی گولیاں ماری گئیں تھیں، مائیں صدمے سے غش کھا رہی تھیں، باپ دکھ سے سینہ کوبی کرتے نظر آ رہے تھے، ایسے میں نمرہ اور سرمد کو اپنے سات سالہ

بیٹے حمزہ کا لہو میں بھیگا وجود اسٹریچر پر دکھائی دیا حمزہ کے معصوم چہرے پر لہو کے چھینٹے تھے، سیاہ چمکدار آنکھیں حیرت سے کھلی تھیں، جیسے اپنے ساتھ ہونے والی اس ظلم کا سبب پوچھ رہی ہوں، ہر طرف چیخ و پکار آہ و بکا یا ہاہکار مچی تھی، قیامت کے اس دردناک شور میں نمرہ کی دل روز چیخ بھی شامل ہوگئی۔

''حمزہ...... حمزہ میرا بچہ...... مار دیا ظالموں نے میرے معصوم بچے کو مار دیا...... حمزہ اٹھو بیٹا! آؤ گھر چلیں...... مم...... میں تمہیں کبھی اسکول نہیں بھیجوں گی...... بس...... ایک بار...... ایک بار...... مجھے ماما بولو...... آؤ میرے ساتھ اپنے...... گھر چلو...... اٹھونا بیٹا۔'' نمرہ دیوانہ وار بولتی حمزہ کے ساکت چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لئے سننے والوں کا دل چیر رہی تھی، سرمد تو خود اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پایا تھا ہر طرف لہو میں لتھڑے معصوم بچوں کے جسد خاکی دیکھ دیکھ وہ دھیرے دھیرے ٹوٹ رہا تھا مگر جونہی اس کی نظر اپنے بیٹے کے لہولہان بے جان جسم پر پڑی وہ چٹاخ سے ٹوٹ کر بکھرا تھا، ڈاکٹر بتا رہا تھا اس ننھے وجود میں اٹھارہ گولیاں ماری گئیں تھیں، یہ سن کر تو سرمد اور نمرہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

جو بچے زندہ بچ کر اسکول سے باہر آئے تھے ان کی مائیں ان کے باپ انہیں اپنے سے لپٹائے چومے جا رہے تھے، اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے کہ ان کے بچے زندہ سلامت واپس آ گئے۔

''میرے خدایا! میری زمیں پر یہ قہر سا کیوں بپا ہوا ہے؟ ہر آنکھ نم ہے، ہر دل دریدہ، ہر گھر میں ماتم کا سماں ہے۔''

ایک سو بیالیس بچوں کی شہادت ہو چکی تھی زخمی بھی کم نہ تھے، یہ ایسا کاری وار کیا تھا دشمن نے پورے وطن کا دل چیر کے رکھ دیا تھا، سفاک سے سفاک انسان بھی بچوں کے ساتھ ہونے والے اس ظلم پر دکھی اور اشکبار تھا۔

وہ معصوم بچے نویں اور دسویں جماعت کے ذہین اور پرعزم بچے اپنی الوداعی تقریب میں شریک تھے کہ ان دہشت گردوں نے خوشی کی تقریب کو موت کی داستان بنا دیا، خودکش جیکٹ پہنے ایک حملہ آور نے اچانک خود کو دھماکے سے اڑا دیا، جس کی وجہ سے بچوں کی کثیر تعداد نے جام شہادت نوش کیا، بچوں کے کلاس روم ان کے وجود کے ٹکڑوں اور خون سے رنگین ہو گئے تھے، ان کی ٹیچر کو پیٹرول چھڑک کر ان کے سامنے آگ لگا دی گئی، معصوموں کے چہرے گولیوں سے ختم کر دیئے گئے، پہچان کو چہرے نہ رہے، زندگی کو سانسیں نہ رہیں کتنے ہی معصوم تھے کہ جن کے گلوں پر چھریاں چلا کر انہیں ذبح کر دیا گیا، عربی بولنے والے لمبی لمبی داڑھیاں رکھ کر، اللہ کا نعرہ لگا کر خود کو مسلمان ظاہر کرنے والے نہ تو مسلمان تھے نہ ہی انسان تھے، جو وہ کر گئے وہ تو درندے بھی نہ کریں یہ سوچ کر دیکھ کر دکھ اور شرم سے منہ چھپائے پھرتے ہیں درندے بھی، بچوں کے سروں اور چہروں میں گولیاں ماری گئیں، جس بچے کے زندہ ہونے کا شک گزرتا اس کے قریب جا کر اس کے سروں اور سینوں میں درجنوں گولیاں اتار دی گئیں، ظلم کا ہر حربہ عمل میں لایا گیا، اسکول کے معصوم بچوں کو ختم کرنے کے لئے پرنسپل اور ٹیچرز کو بھی سفاکی سے مار دیا گیا، تقریباً ساڑھے چھ گھنٹے تک سیکورٹی فورسز اور دہشت گردوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہا، زخمیوں کو، شہید ہونے والوں کو اور زندہ بچ جانے والوں کو اسکول سے باہر نکال لیا گیا تھا، اسکول میں ہر طرف خون بکھرا تھا، بچوں کے اسکول کے بستے، کاپیاں، پنسلیں، ڈرائنگ بک زمین پر لہو

میں رنگی پڑی تھیں، پھولوں کا شہر پھولوں کے جنازے اٹھانے کی تیاری کر رہا تھا، پتھر کا سینہ بھی پھٹ پڑا تھا اس قیامت صغراں کا منظر دیکھ کر، کیا قیامت کی گھڑی رہی ہوگی، جب ایک نوخیز اپنے لہو کا کفن اوڑھے تڑپتا ہوگا اور سفاک جلاد قہقہے لگاتا ہوگا؟

حمزہ نے تو چھٹیوں میں اپنے نانا ماموں کے گھر جانا تھا مگر وہ تو مکمل اور پکی چھٹی پہ چلا گیا تھا اور اس کے نانا ماموں اس کے گھر آئے تھے اسے آخری بار دیکھنے، الوداع کہنے، سپرد خاک کرنے کے لئے، وہ اب کبھی نانا، ماموں کے گھر نہیں جا سکتا تھا، وہ تو اپنے اللہ کے گھر چلا گیا تھا۔

''سرمد! میں نے...... حمزہ کو زبردستی...... اسکول بھیجا تھا نا؟ جبھی وہ مجھ سے روٹھ کر دور چلا گیا ہے...... کاش...... میں اسے اسکول نہ بھیجتی تو آج...... آج وہ اس طرح اتنی کم سنی میں...... اتنی بے بسی اور بے چارگی میں مارا نہیں جاتا...... ساری...... میری غلطی ہے...... میں نے...... اپنے بچے کی...... بات...... نہیں مانی اور...... اپنے بچے کو ہمیشہ کے لئے کھو دیا۔'' نمرہ تڑپ تڑپ کر روتے ہوئے بول رہی تھی، سرمد کے لئے خود کو سنبھالنے سے زیادہ نمرہ کو سنبھالنا بہت مشکل اور تکلیف دہ تھا۔

''نمرہ! پلیز تم خود کو الزام مت دو، بہت سی ماؤں نے اپنے لخت جگر کھوئے ہیں اس سانحے میں، ہمارا اور ان سب کا دکھ ایک ہے ہمیں ایک دوسرے کا حوصلہ بننا ہے، ایک دوجے کی ہمت بندھانی ہے، تسلی، دلاسہ دینا ہے سب کو، دہشت گردوں نے سینکڑوں نہیں، ہزاروں گھروں میں صف ماتم بچھائی ہے، اللہ ہم سب کو صبر دے۔'' سرمد نے بھیگتے لہجے میں اسے سمجھانا چاہا۔

''صبر۔'' نمرہ نے سرمد کو یوں دیکھا جیسے اس نے کوئی انہونی یا انوکھی بات کہہ دی۔

''ہاں صبر بلکہ صبر جمیل۔'' سرمد نے اسی بھیگتے درد بھرے لہجے میں کہا۔

''اسے تو میرے بغیر نیند بھی نہیں آتی تھی سرمد! پھر...... پھر وہ میرے بغیر کیسے سو گیا آج؟'' نمرہ نے درد سے دل چیرتے لہجے میں کہا تو سرمد بھی اسے اپنے ساتھ لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

☆☆☆

یہ ایک دل تھا جسے اب تک سنبھال رکھا تھا اسے بھی توڑ گیا یہ سانحہ پشاور کا

''جی ہاں، آرمی پبلک اسکول پشاور ہماری ملکی تاریخ کا تاریک، سنگین اور بدترین باب آج رقم کر دیا گیا، سینکڑوں معصوم بچے حصول علم کے دوران شہید کر دیئے گئے، صبح سے رات ہونے والی ہے مگر آج سولہ دسمبر سقوط ڈھاکہ کی تاریک، تاریخ کے دن ہمارے دشمن نے ہمارے دامن پر ایک اور داغ ایک اور زخم لگایا ہے جو شاید کبھی نہیں بھر پائے گا 16 دسمبر 1971ء میں ہمارا ملک دولخت ہوا تھا اور آج سولہ دسمبر 2014ء کو ہماری ماؤں کے لخت جگر، لخت لخت ہوئے ہیں اور ہماری ماؤں کے کلیجے پھٹ گئے ہیں ان کے دل نوچ لئے گئے ہیں۔

یا خدا! رحم میری دھرتی پہ
دہشت گردی ہے پھر بپا ہوئی
سقوط ڈھاکہ کا ہی زخم تازہ تھا
اک قیامت کی اور انتہا ہوئی

نیوز رپورٹر اور اینکر پرسن علینا عباسی مائیک ہاتھ میں لئے پشاور کے لیڈی ریڈنگ اسپتال کے باہر کھڑی اپنے کیمرہ مین ادریس کے ساتھ براہ راست ٹی وی پر رپورٹ کر رہی تھی اس کے

چہرے پر پھیلا کرب، آنکھوں سے بہتے آنسو، لہجے میں تڑپ اور آنسوؤں کی جھنکار واضح دیکھی اور محسوس کی جا سکتی تھی، اسپتال کے اندر اور باہر لوگوں کا اک ہجوم تھا زخمی اور شہید ہونے والے والدین کی آہ و بکا جاری تھی، کہیں درد سے کراہتے بچوں کی دل شکن آلود آوازیں ہر ایک کو رلا رہی تھیں، نرسیں جو بچوں کی مرہم پٹی میں لگی تھیں وہ بھی رو رہی تھیں اور بچوں کی زندگی کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔

''ناظرین! آج کے دن شاید ہی کوئی آنکھ ہو جو اس سانحے پہ نم نہ ہو وہ ننھے معصوم بچے جنہیں مرتے وقت نہ اپنی ماؤں کی گود میسر آئی نہ باپ کا دست شفقت و تسلی ہی مل سکا، خود کو انسان اور مسلمان کہلانے والے وہ سفاک دہشت گرد تو درندوں کو بھی مات دے گئے، درندے بھی ان دہشت گردوں سے لاکھ درجے بہتر ہیں، جنہوں نے ہماری سینکڑوں ماؤں کی زندگی میں سیاہ رات ثبت کر دی ہے، آج سولہ دسمبر کی سرد خنک صبح جتنی غمناک، درد ناک اور سفاک رہی، رات اس سے کہیں زیادہ بے رحم اور سراپا غم گزرے گی، وہ مائیں بستروں میں، گودوں میں اپنے ان بچوں کو ڈھونڈیں گی، جنہیں لوری سنا کر، سینے سے لگا کر تو کبھی کہانی سنا کر سلایا کرتی تھیں، آج نہ وہ مائیں سو سکیں گی نہ اس دیس کا کوئی بھی حساس دل انسان آج سو پائے گا، آج دکھ بھی اس دکھ پہ دل کھول کر روئے گا جو ہماری دھرتی کی ماؤں کو ملا ہے۔''

دکھ بھی گریہ کناں ہے آج کی رات
ایسا ماتم بپا ہے آج کی رات
ننھے بچوں کی جان ہوئی قرباں
حشر کا اک سماں ہے آج کی رات
کتنی ماؤں کی گودیں ہیں خالی ہوئیں
آرش بھی رو رہا ہے آج کی رات
ہم بے چارے غم کے وہ مارے ہیں گل
جن کا رونا لکھا ہے آج کی رات

علینا چلتے چلتے آنسوؤں کی زبان بولنے لگی تھی، نیوز روم میں ٹی وی چینل کے اونر، نیوز پروڈیوسر اور نیوز کاسٹر سمیع الدین بھی موجود تھے اور علینا کا پروگرام بہت توجہ سے دیکھ رہے تھے، یکا یک نیوز کاسٹر سمیع الدین کہنے لگا۔

''سر! آپ نے اتنے اہم پروگرام کے لئے علینا کو بھیج دیا وہاں اب دیکھیں کیسے روئے جا رہی ہے رپورٹنگ کیا کرے گی علینا، وہ تو رو رو کر وقت ضائع کر رہی ہے، ایسے حادثات کی رپورٹنگ کے لئے کسی میل اینکر کو بھیجنا چاہیے، خاتون کو بھیجنا سراسر نادانی ہے۔''

''آئی تھنک علینا بہت عمدہ پروگرام کر رہی ہے اس کا انداز بیان، اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو، لہجے کا دکھ اور کرب ہر ناظر کی نگاہ سے دل میں منتقل ہو گا اور اس حادثے پر بھلا کون ہے جو غمگین نہیں ہے ٹی وی اینکر پرسن، نیوز رپورٹرز بھی تو انسان ہیں جائے حادثہ پر پہنچ کر تو اپنے آپ آنسو نکل آتے ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے سر لیکن؟''

سمیع الدین خود وہاں جانا چاہتا تھا اس لئے علینا پر اعتراض کر رہا تھا، پروڈیوسر ضیغم عباس کو اس نے مزید کچھ کہنا چاہا تو چینل کے اونر شبیر ہمدانی بول پڑے۔

''لیکن تم یہ دیکھو کہ علینا کی اس طرح کی رپورٹنگ سے بے شک وہ دل سے، دکھ سے کر رہی ہے لیکن اس سے ہمارے چینل کی ریٹنگ میں کتنا اضافہ ہو گا، علینا کا یہ آنسو بہانا، دکھ بھرا انداز ہمارے ناظرین کو ٹی وی کے سامنے سے اٹھنے نہیں دے گا۔''

''اتنا بڑا سانحہ رونما ہو گیا ہے سر! اور آپ کو اپنے چینل کی ریٹنگ کی پڑی ہے بڑے افسوس کی بات ہے سر!''

''مسٹر نیوز کاسٹر، آج کے دور میں ہر انسان اپنا بزنس چمکانا اور آگے بڑھانا چاہتا ہے اور اب تو ہر چیز بکتی ہے، دکھ ہو، آنسو ہوں، درد ہو موت ہو مجبوری ہو یا بے بسی ہو آج کے دور میں سب بکتا ہے، ہنسی اتنا دیر پا تاثر نہیں چھوڑتی نہ ہی توجہ اپنی جانب مبذول کرواتی ہے جتنی جلدی اور جتنی شدت سے آنسو اپنی طرف کھینچتے ہیں، متوجہ کرتے ہیں اور آنسو اگر عورت کے ہوں تو اثر اور بھی تیزی سے کرتے ہیں، کیا سمجھے؟'' شبیر ہمدانی نے بے حسی سے مسکراتے ہوئے کہا تو سمیع الدین کو اس سے نفرت محسوس ہونے لگی جو اپنے فائدے کی سوچ رہا تھا، جسے ان والدین کا احساس تک نہیں تھا جو آج اپنی اولاد کھو بیٹھے تھے وہ بھی ایک ظالمانہ اور المناک حادثے کے سبب۔

''میں جا رہا ہوں سر!'' سمیع الدین اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور شبیر ہمدانی کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''آپ یہاں بیٹھ کر اپنے ہم وطنوں کے دکھ اور آنسو کیش کرائیں، ان کی بے بسی اور غم بیچیں اور اپنے چینل کی ریٹنگ بڑھائیں، میں مزید یہاں کام نہیں کر سکتا، میرا استعفیٰ آپ کو آج ہی مل جائے گا، خدا حافظ۔'' سمیع چلا گیا، ضیغم عباس نے شبیر ہمدانی کی طرف فکر مندی سے دیکھا۔

''سر! روکیے اسے، سمیع بہت ذہین اور قابل نیوز کاسٹر اور رپورٹر ہے۔''

''انہیں کیا ہوا؟'' نیوز ایڈیٹر نے سمیع کی جانب اشارہ کیا تھا جو گلاس ڈور سے باہر اپنے کیبن سے اپنی چیزیں سمیٹ رہا تھا۔

''کچھ نہیں، بس ان کا وقت پورا ہو گیا ہے یہاں۔'' شبیر ہمدانی لاپرواہی سے بولے۔

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اب یہ موصوف کسی اور چینل پر اپنے لفظوں کی پٹاری کھولیں گے اور خوب پیسہ کمائیں گے۔'' شبیر ہمدانی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''وہ تو ہے سر! سمیع کو تو آل ریڈی بہت سی آفرز تھیں بڑے نیوز چینلز سے جہاں بھی جائیں گے ہاتھوں ہاتھ لئے جائیں گے۔'' نیوز ایڈیٹر نے کہا تو نیوز پروڈیوسر نے اسے گھورا۔

''آہم۔'' نیوز پروڈیوسر نے گلا کھنکارا۔

''بڑے نیوز چینلز سے، تمہارے خیال میں میرا نیوز چینل چھوٹا ہے۔'' شبیر ہمدانی غصے میں آتے ہوئے بولے، تو نیوز ایڈیٹر نے اپنی زبان دانتوں تلے دابی تھی اب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا کہ سچ کے چکر میں کیا بول گئے، وہ تو بھلا ہوا کہ شبیر ہمدانی کے موبائل کی بیپ بجنے لگی اور نیوز ایڈیٹر صاحب کی نوکری جاتے جاتے رہ گئی۔

''ہیلو عباد کیسے ہو؟'' شبیر ہمدانی نے موبائل آن کرتے ہوئے کہا۔

''کیا؟ کیا کہہ رہے ہو؟ او مائی گاڈ!'' جانے دوسری جانب انہیں ایسا کیا کہا گیا تھا کہ شبیر ہمدانی کا لہجہ، انداز اور چہرے کا تاثر تک یکسر تبدیل ہو گیا تھا، نیوز ایڈیٹر اور پروڈیوسر حیرانگی سے انہیں دیکھ رہے تھے، وہ اتنے شاکڈ کیوں تھے؟ دونوں کے ذہنوں میں یہ سوال تھا۔

''حرام زادے، درندے، شیطان کے چیلے، میرے ملک کے بچوں کو مار رہے ہیں، میرے حماد کو بھی مار ڈالا ان ظالموں نے۔'' شبیر

ہمدانی موبائل میز پر پٹختے ہوئے غصے سے بولے۔

''آپ کا حماد...... سر؟'' وہ دونوں یک زبان ہوکر بولے تو صدمے اور غصے سے شبیر ہمدانی نے کہا۔

''ہاں حماد میرا بھانجا حماد میرا لاڈلا اور ذہین بچہ مار دیا ظالموں نے، آٹھ گولیاں لگی ہیں اسے اس کے سر اور سینے میں، آٹھ گولیاں ماری ہیں ان شیطانوں نے۔''

''اوہ...... اللہ...... اللہ صبر دے سر آپ کو، سارے والدین کو اللہ صبر جمیل عطا کرے جن کے پھول مسل دیئے گئے۔'' ضیغم عباس نے دکھ بھری آہ کے ساتھ کہا۔

''انا للہ وانا الیہ راجعون۔'' نیوز ایڈیٹر نے دکھ اور تاسف سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''یہ عمر ان بچوں کی اس دنیا سے جانے کی نہیں تھی یہ ظلم ان شیطانوں کو بہت مہنگا پڑے گا، جہنم میں جلیں گے وہ دہشت گرد، میرے بچوں کے ساتھ یہ ظلم کرانے والے میرے ہاتھ آجائیں تو اس طرح تل تل کے ماروں گا کمینوں کو، یہ کیا اگر پکڑ گئے تو پھانسی پہ لٹکا دیا اور کھیل ختم، بم سے اڑا دیا تو چند لمحوں میں سب کچرا، ان شیطانوں کو تو چوراہے پہ لٹکا دینا چاہیے اور عوام انہیں سزا دیں، پتھر ماریں، یا زندہ جلا دیں، تاکہ یہ لوگ بھی اس تکلیف سے تڑپیں جو یہ ہمارے ہم وطنوں کو ہمارے بچوں کو دیتے آرہے ہیں، ہم نے اگر ایسا نہ کیا تو یہ اسی طرح ہم پہ حاوی ہوتے رہیں گے ہمیں ختم کرتے رہیں گے۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہیں سر آپ۔'' وہ دونوں ایک ساتھ بولے۔

''سمیع کو بلاؤ اس سے کہو پشاور پہنچے فوراً اس واقعے کی پوری طرح کور کرے، جب تک اسکول دوبارہ نہیں کھل جاتا اسے وہاں کی پل پل کی رپورٹنگ کرنی ہے۔'' شبیر ہمدانی غصے، صدمے اور جوش سے بھرپور لہجے میں بول رہے تھے۔

''جس تن لاگے وہ تن جانے۔''

''جب انسان کے اپنے دل پر چوٹ پڑتی ہے تب ہی اسے دوسرے کے درد اور تکلیف کا احساس ہوتا ہے، شبیر صاحب کو بھی اپنی لاڈلی بہن کے دکھ نے احساس دلایا ہے کہ دوسرے والدین کی دکھ بھری قیامت سے گزر رہے ہیں۔'' نیوز ایڈیٹر نے مدھم آواز میں کہا تو ضیغم عباس ان کے ساتھ چلتے ہوئے نیوز روم کی طرف جاتے ہوئے بولے۔

''صحیح کہا آپ نے اور یہ دکھ تو پوری قوم کا دکھ ہے، بچے تو سب کے سانجھے ہوتے ہیں، شہید ہونے والے بچے ہم سب کے بچے تھے، پوری قوم کے بچے تھے۔''

''ہوں چلیں سمیع بھی آرہا ہے ایس ایم ایس کر دیا ہے میں نے اسے کہ بگ باس کے دل میں درد کا احساس جاگ گیا ہے اور وہ اسے بلا رہے ہیں لوٹ آئے اور اپنی ڈیوٹی سنبھالے۔''

''بالکل یہ وقت ویسے اختلافات میں پڑنے کا نہیں ہے بلکہ ایک ہو اس سانحے پر متحد ہونے اور دشمن کو بتانے کا وقت ہے کہ ہم ایک ہیں اور ہمیں کسی دشمن کی گھناؤنی چال بھی ٹوٹنے بکھرنے نہیں دے گی۔''

''انشاء اللہ۔'' نیوز ایڈیٹر نے دل سے کہا اور دونوں اپنی اپنی سیٹ پر چلے گئے۔

☆☆☆

سترہ دسمبر سانحے کا دوسرا دن تھا اور ایک سو بیالیس پھولوں کو زمین کے سپرد کر دیا گیا تھا، جن پھولوں کے ہونے سے ان کے والدین کے

آنگن مہکتے رہتے تھے، جہاں ان کی ہنسی، شرارتیں اور معصوم آوازیں گونجا کرتی تھیں، آج ان گھروں، آنگنوں میں صرف روتے بلکتے ماں باپ اور دیگر عزیز و اقارب تڑپتے بلکتے دکھائی دے رہے تھے کسی میں تاب نہ تھی اس سانحے کو بیان کرنے کی ماؤں کے بین دیکھے جاتے تھے، نہ ان کی آہیں اور سسکیاں سنی جا سکتی تھیں، پتھر بھی یہ مناظر دیکھنے سے قاصر تھے۔

کسی نے کہا وہ بدلہ لینے آئے تھے، کیسا بدلہ؟ اور معصوم بچوں اور عورتوں سے بھلا کون بدلہ لیا کرتا ہے یہ تو پختون روایات کے بھی خلاف ہے اور انسانیت کے بھی منافی ہے، وہ خود کو مسلمان بھی کہلاتے تھے اور نعرہ تکبیر لگا کر بچوں کو مارتے جاتے تھے، کوئی ذی ہوش ایسے شیطانوں کو انسان اور مسلمان کہہ سکتا ہے، بدلہ اور انتقام ایک مسلمان کی خو نہیں ہے، بچوں کی جانیں لے کر وہ اپنے کون سے جذبے کی تسکین کرتے رہے؟ سکون کا ایسا کون سا مرحلہ تھا جو انہوں نے یہ ستم ڈھا کے طے کیا ہے؟ وہ یہ سمجھتے تھے کہ صرف وہ مسلمان ہیں، زمین پہ ان کا ماتھا ٹیکنا ان کے مسلمان ہونے کی دلیل ہے ان کا سجدہ سجدہ کہلایا باقی سب مار دیئے جانے کے لائق ہیں، وہ صرف انسان اور اسلام دشمن تھے، پاکستان کے دشمن تھے، جو اس پاک سرزمین پر امن و آشتی کی فضا دیکھنا نہیں چاہتے اور ہمارے آپس کے جھگڑوں، اختلافات اور سیاسی چپقلش کا فائدہ ہمارے دشمن اٹھا رہے ہیں، ہم اندر سے کمزور ہوتے جا رہے ہیں اسی لئے ہمارا دشمن طاقتور اور مزید شاطر اور گھناؤنا ہوتا جا رہا ہے، یاد رکھیں قومی حادثے، سانحے بھلا دینے کے لئے نہیں ہوتے سبق سیکھنے اور بہتر حکمت عملی اپنانے کے لئے ہوتے ہیں، صوبائی، گروہی لسانی تعصبات فرقہ واریت نے ہمارے ملک کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے، ہماری برداشت ختم ہو گئی ہے ہمارا ظرف اتنا چھوٹا ہو گیا ہے کہ ہم اپنے سوا ہر کسی کو چھوٹا کھوٹا برا اور جھوٹا سمجھنے لگے ہیں، ہماری نظر میں صرف ہم اچھے اور سچے مسلمان ہیں باقی سب کافر ہیں، کتنے افسوس اور شرم کی بات ہے نا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو کافر سمجھتا اور کہتا ہے جبکہ یہ کافر اور غیر مسلم ہی ہیں جو ہمیں مسلمان کہتے ہیں۔

ذرا سوچیئے کہیں ہم ایک دوسرے کو اپنے ایمان کا امتحان دیتے دیتے اس ملک کو اس کے بچوں کو مزید کسی سولہ دسمبر کی طرف تو نہیں دھکیل رہے؟ قائداعظم کے فرمائے ہوئے بہترین اصول۔

تنظیم، اتحاد، ایمان، ہم نے کب کہاں کس راستے پر چلتے ہوئے کھو دیئے، پتا لگایئے اس سے پہلے کہ ہم راستہ ہی بھول جائیں، منزل سے بھٹک جائیں، اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے اس سے پہلے کہ ہمارا دشمن ایک اور گھناؤنی سازش تیار کرے، دشمن کو منہ توڑ جواب دینے کے لئے ہمیں اپنے ہاتھ مضبوط کرنا ہو گا، خدارا خود کو پہچانیئے، اپنے دشمن کو پہچانیئے جو ہمارے بیچ فرقہ پرستی، ملک، زبان، مذہب و صوبے کی بنیاد پر نفاق پیدا کر رہا ہے، ہماری جڑوں میں نفرت کے بیج بو رہا ہے، نفرت کے یہ بیج اپنی جڑوں سے نکال پھینکیں اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے اور یہ بیج تناور درخت بن کر ہمیں ہماری آنے والی نسلوں کو نفرت کی آگ میں جھلسا کر رکھ دیں۔

کیمرہ مین اسد بخاری کے ساتھ نیوز اینکر سمیع الدین بیچ ٹی وی کراچی۔

کیمرہ کلوز ہو گیا اور سمیع نے آرمی پبلک اسکول کی جانب گہری اور دکھ بھری نظروں سے

دیکھا اور طویل سانس لبوں سے خارج کیا۔

☆☆☆

سرمد نے یونہی بے خیالی میں ٹی وی کا ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی آن کر دیا۔

ٹی وی پر مخصوص نیوز ٹیون بجنے لگی، بڑی سی فلیش کے ساتھ اسکرین پر لکھا ہوا آیا۔

''بریکنگ نیوز۔''

''نمرہ! بریکنگ نیوز آرہی ہے۔'' سرمد نے تڑپتے دل کے ساتھ نمرہ کو آواز دے کر کہا۔

''کتنی بار منع کیا ہے آپ کو کہ صبح صبح نیوز مت لگایا کریں یہ لوگ بریکنگ نیوز سنا سنا کر ہمارا ہارٹ فیل کرا دیں گے، ان کے پاس صرف ہارٹ بریکنگ نیوز ہی ہوتی ہیں۔'' نمرہ اجاڑ صورت، میلے، شکن آلود کپڑوں اور الجھے بالوں میں بیٹے کی جدائی میں نڈھال بے حال اور کمزور دکھائی دے رہی تھی، سرمد کے اس آکر کہنے لگی تو وہ لب بھینچے اپنے آنسو ضبط کرتا ٹی وی پر آنے والی اس بریکنگ نیوز کی جانب متوجہ ہوا۔

''آرمی پبلک اسکول پشاور'' سولہ دسمبر کے المناک اور دل شکن سانحے کے صرف چھ روز بعد پھر سے کھول دیا گیا ہے اسکول کی اسمبلی میں چیف آف آرمی اسٹاف نے بھی شرکت کی اور اسکول کے طلباء بڑی تعداد میں حصول علم کے لئے حاضر ہوئے، معصوم بچوں کے چہرے اس سانحے میں اپنے ساتھیوں کی شہادت اور انہیں ہمیشہ کے لئے کھو دینے کے باوجود پرعزم اور ان کے حوصلے جوان تھے، شہید ہونے والے بچوں کے والدین نے بھی بڑی تعداد میں اسمبلی میں شرکت، دکھ، درد، آنسوؤں اور عزم کے ساتھ اسکول میں تعلیم کا دوبارہ آغاز کیا گیا۔

نیوز کاسٹر بہت جوشیلے انداز میں خبر پڑھ رہی تھی، نمرہ حواس باختہ سی ٹی وی کے بالکل سامنے آ کھڑی ہوئی اور اسکرین پر نظر آنے والے بچوں پر ہاتھ پھیرنے لگی، آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

''نمرہ!'' سرمد اٹھ کر اس کے پاس آیا۔

''حمزہ!...... ہم حمزہ کا اسکول کھل گیا ہے سرمد، حمزہ بھی اسکول گیا ہے نا، وہ چھٹی ہونے پر گھر آئے گا نا، میرا بیٹا اسکول گیا ہے نا، وہ یہاں کھڑا ہے، دیکھو یہ حمزہ، یہ بھی حمزہ ہے، یہ سب بچے حمزہ ہیں، چھٹی ہونے پر سب بچے اپنے گھروں کو جائیں گے، ہمارا بیٹا ہمارا انتظار کر رہا ہوگا نا، چلیں ہم حمزہ کو اسکول سے لے کر آتے ہیں۔'' نمرہ دیوانوں کی طرح روتے ہوئے ٹی وی اسکرین پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی، سرمد کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا اس نے نمرہ کو سنبھالتے ہوئے اپنے سینے سے لگا لیا اور خود بھی رونے لگا۔

''ہمارا بیٹا تو جنت میں ہے نمرہ، وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔''

''خدا کا قہر نازل ہو ان بدبختوں پر جنہوں نے ہمارے معصوم بچوں کو بے دردی سے مار ڈالا ہے۔'' حمزہ کے نانا نے بیٹی اور داماد کی ابتر حالت دیکھ کر روتے ہوئے دعا کی۔

یہ تو وہ دکھ تھا جو آخری سانس تک ساتھ رہنا تھا، دسمبر کا سرد مہینہ اپنے نام کی طرح سرد مہر ثابت ہوا تھا، زندگی معمول پر آ رہی تھی مگر ان کی نہیں جن کے بچے چھن گئے تھے، ان والدین کے لئے تو زندگی وہیں رک گئی تھی جہاں ان کے بچے ان سے جدا ہو گئے، وہ سب بظاہر سانس لے رہے تو تھے مگر جی نہیں پا رہے تھے، ان کی آنکھوں میں اپنے بچوں کی صورت آنسو بن بن کر مگر ان کے دل باقی سب بچوں کی سلامتی کی دعائیں بھی مانگتے تھے، ماؤں کے دل ٹوٹے تھے، حوصلے نہیں، انہیں ہر بچے میں اپنا ہی بچہ نظر آتا

تھا۔

مجھے یقین ہے
میرے وطن کی
تمام ماؤں کے دل دکھی ہیں
مگر وہ پھر بھی
یہ چاہتی ہیں کہ
ان کی ملت کے سارے بچے اسکول جائیں
پڑھیں، لکھیں اور
وطن میں اونچا مقام پائیں
میرے وطن کی تمام مائیں
بہت محبت سے سوچتی ہیں
کہ سب ہی بچے
ہیں ان کے بچے
وہ بھی
جو ملک عدم سدھارے
وہ بھی
جو ہیں زندہ اور ماؤں کے پیارے
وہ سارے بچے انہیں کے ہیں اور
وہ ان کے دم سے رہیں گی زندہ
حوصلے سے یہ دکھ سہیں گی
وہ دعائیں کرتی ہی رہیں گی
سدا سلامت رہیں وہ بچے
جو اپنے ماں باپ کی خوشی ہیں
جو اپنے ماں باپ کی
زندگی ہیں

کیمرہ مین ظفر محمود کے ساتھ علینا بخاری سچ نیوز، ٹی وی کیمرہ بند ہو گیا تھا مگر علینا کی آنکھوں سے آنسو پھر بھی بہنا شروع ہو گئے تھے، اس سانحے کا دکھ درد سانجھا تھا اور دشمن کے لئے سب سے بڑی بریکنگ نیوز یہ تھی کہ اس سانحے نے پوری قوم کو ایک بار پھر متحد کر دیا تھا یہی دشمن کی سب سے بڑی تباہی تھی۔

☆☆☆

زندگی خوبصورت ہے

مبشرہ ناز

ناولٹ

قائداعظم ایئر پورٹ کے لاؤنج میں اس نے متلاشی نگاہوں سے پارکنگ میں کھڑی سیاہ لینڈ کروزر کو دیکھا اور اس کی طرف بڑھ گئی، سیاہ جارجٹ کی ساڑھی جس کے بلاؤز کی آستین تک فل تھیں، آنکھوں پہ لگے سن گلاسز، سر پہ سیاہ عربی اسٹائل میں اسکارف پہنے بیچرل میک اپ کے ساتھ ڈائمنڈ رنگ اور گلے میں جھولتا ڈائمنڈ کا لاکٹ اسے دور سے ہی ویل اسٹیبلش بزنس وومن ظاہر کر رہے تھے، شوفر ربیع نے اسے گاڑی کی طرف بڑھتا دیکھ کر تیزی سے پچھلا دروازہ وا کیا اور اس کے بیٹھنے کے بعد دروازہ بند کر کے وہ تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آیا تھا، قائداعظم ایئر پورٹ کا پارکنگ لاٹ دور کہیں پیچھے رہ گیا تھا، گاڑی اب ایئر پورٹ کے راستوں پہ دوڑ رہی تھی، شوفر ربیع نے حیرت سے بیک ویو مرر سے پچھلی سٹ کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے بیٹھی مالکن کو دیکھا اس نے بہت کم اس کو فارغ دیکھا تھا، اسے کبھی کبھی حیرت ہوتی تھی، وہ اتنی خاموش اور اپنے کام میں مگن رہتی تھی ربیع کو اسے مخاطب کرنے سے پہلے دس بار سوچنا پڑتا تھا مگر آج نہ اس نے اپنا لیپ ٹاپ کھولا تھا اور نہ اپنے بڑے سے ہینڈ بیگ میں سے کوئی فائل نکالی تھی، ایئر پورٹ روڈ ختم ہوتے ہی اس نے اسے مخاطب کیا۔

''میم کہاں چلنا ہے؟''

''جسٹ لانگ ڈرائیو۔'' اس نے آنکھیں کھول کے پہلے حیرت سے اسے دیکھا اور یک لفظ ہی جواب دے کر دوبارہ آنکھیں موند لیں کیونکہ۔

یادیں وہ نہیں جو تنہائی میں
آتی ہیں
یادیں وہ نہیں جو جدائی میں

آتی ہیں
یادیں تو وہ ہیں جو
بھیڑ میں بھی
تنہا کر جاتی ہیں

اور اس وقت شہر کی مصروف سڑک اور اس پر ہوتے بے ہنگم شور میں بھی سامعہ حیدر کو اپنا آپ تنہا لگ رہا تھا کیونکہ۔
گاڑی جانے انجانے راستوں پہ دوڑ رہی تھی جبھی اس نے سیٹ کی پشت سے سر اٹھایا اور کلائی پہ بندھی نازک سی ڈائمنڈ کے ڈائل والی رسٹ واچ میں ٹائم دیکھا پھر ربیع کی طرف دیکھ کر ''بولی آفس چلو'' اور دوبارہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں، ربیع نے گاڑی تیزی سے آفس جانے والے راستے پہ گاڑی ڈال دی تھی۔
وہ جس وقت آفس میں داخل ہوئی تو سامنے ہی رابیل احسن سے نہ جانے کس بات پر بحث کر رہی تھی وہ ان دونوں کی نظر انداز کرتی سیدھی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی ان دونوں نے اپنی بحث روک کر بغور اس کو دیکھا تھا وہ آج ان سے سلام دعا کرنا تو درکنار ان کی طرف نگاہ اٹھائے بغیر ہی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی حالانکہ یہ سامعہ حیدر کی سرشت میں شامل نہ تھا وہ جتنی بھی تھکی ہوئی ہوتی کسی بھی فارن ڈیلیگیشن سے ملاقات کے بعد یا شہر سے واپس آنے کے بعد نہ صرف خوشدلی سے سلام کرتی بلکہ سب کا احوال بھی دریافت کرتی تھی لیکن آج یا تو اسے اپنے ڈیلیگیشن میں ناکامی ہوئی تھی یا پھر وہ کسی اور بات پر شدید ٹینشن کا شکار تھی، وہ دونوں اپنی بحث کو بھول کر حیرت زدہ انداز میں ایک ہی بات سوچ رہے تھے، سامعہ نے بھی اپنی پشت پر ان کی گہری نظروں کو بہت دیر تک محسوس کیا تھا جبھی اپنے آپ کو کمپوز کرتے ہوئے اس نے ناب گھما کر دروازہ کھولا، سیٹ پہ بیٹھنے کے بعد اس نے سامنے ٹیبل پہ رکھے جگ میں سے پانی بھر کر نکالا اور اسے گھونٹ گھونٹ پی کر اپنے آپ کو کمپوز کیا اور انٹر کام پہ اس نے رابیل اور احسن کو اندر آنے کا کہا اور خود سامنے رکھی فائل کو کھول لیا وہ اپنی کوئی بھی کمزوری ان پہ عیاں نہیں کرنا چاہتی تھی، یہی وجہ تھی کہ جب رابیل اور احسن کمرے میں داخل ہوئے تو وہ وہی خول اپنے اوپر چڑھا چکی تھی جسے دیکھنے کے وہ لوگ عادی تھے، وہ دونوں خاموشی سے آکر بیٹھ گئے۔
''رابی! پرچے کا کام کہاں تک پہنچا، اگر پرچے کا تمام فائل ورک کمپلیٹ ہوگیا تو مجھے ابھی دکھا دو کیونکہ پھر ہو سکتا ہے، اگلے دو دن میں بہت بزی ہو جاؤں احمد انڈسٹریز والوں کے ساتھ میٹنگ بھی ارینج کرنی ہے اور نہ جانے کیا کیا ہے۔'' اس نے سائیڈ درازوں کو بے وجہ کھول کر بند کیا اور اپنے آپ کو مصروف ظاہر کرنے لگی۔
''سامی! آپ رہنے دیں یہ رابیل کبھی کچھ نہیں کر سکتی مجھے پتا ہے اس نے فائل پوری نہیں کی آپ نے خوامخواہ اس کو آفس میں رکھا ہوا ہے ابھی بھی یہ صرف میرا دماغ اس لئے کھا رہی تھی کہ میں اسے زنگر لا کر دوں۔'' احسن نے رابیل کے جواب دینے سے پہلے ہی بے وجہ ہانکنی شروع کر دی وہ سمجھ گیا تھا سامعہ اس وقت ذہنی طور پر ڈسٹرب ہے اور اپنی ڈسٹربنس کو چھپانے کے لئے وہ اپنے آپ کو مصروف ظاہر کر رہی ہے، جب اس نے اپنے اوپر پردہ ڈالا ہوا تھا تو احسن نے بھی اس پردہ کو اٹھانا مناسب نہیں سمجھا اور اِدھر اُدھر کی بلاوجہ ہانکنی شروع کر دی اور رابیل جو اس کی مزاج آشنا تھی وہ بھی بھرپور تیاری سے میدان میں اتر آئی۔

"سامی یہ جھوٹ بول رہا ہے، میں فائل پوری تیار کر چکی ہوں یہ صرف مجھے اس آفس سے نکالنا چاہتا ہے اس لئے آپ سے جھوٹ بول رہا ہے تاکہ آپ کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر لڑکیوں سے فون پر باتیں کر سکے اسی نے مجھ سے کہا تھا رابی آج سامی کو اپنا فائل ورک مت دکھانا میں تمہیں زنگر کھلاؤں گا۔" رابی نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

"واللہ آپ کو ہمارے بارے میں کیا الہام ہوتے ہیں یا جبینی۔" احسن نے مسخرہ پن سے عزلی اسٹائل اپناتے ہوئے اسے چھیڑا تو وہ حسب توقع تپ گئی۔

"سامی اس سے پوچھیں آج یہ چاہتا کیا ہے؟" رابیل نے ایک ہاتھ سے فائل سامعہ کے آگے رکھ کر دوسرے ہاتھ سے احسن کے شانے پہ گھونسا دے مارا جسے سامعہ نے دیکھنے کے باوجود نظر انداز کر دیا۔

"تمہیں چاہتا ہوں میری باربی ڈول یہ بھی نہیں جانتی تم۔" احسن نے اس کی طرف جھکتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا جسے سامعہ نے بھی سن لیا لیکن ایک بار پھر نظر انداز کر دیا۔

(رابیل جسے سب پیار سے رابی کہتے تھے احسن کے باربی کہنے پہ یکدم سرخ پڑ گئی اور ڈھیلی ہو کر وہیں کرسی پہ گر گئی)۔

"احسن تم سدھر جاؤ۔" سامعہ نے اسے گھرکا تو احسن نے معنی خیز انداز میں رابیل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"پہلے دنیا والے تو سدھر جائیں۔"

"دنیا والے تو سدھر ہی جائیں گے مگر تم قیامت تک نہ سدھرنا۔" سامعہ نے زچ ہوتے ہوئے اسے بال پوائنٹ اٹھا کر مارا جو سیدھا احسن کے کاندھے پر لگا۔

''ہا! ہائے اللہ! امی جان میں امریکہ اور اسرائیل کے بیچ پھنس گیا ہوں مجھے ان کے ڈرون حملوں سے بچا لیجئے، ورنہ آپ کے بیٹے نے آج شہید ہو جانا ہے۔'' احسن نے مصنوعی دہائیاں دینی شروع کیں تو سامعہ بے اختیار ہنستی چلی گئی احسن نے بند آنکھوں کے پیچھے سے ہلکا سا جھانک کر اسے دیکھا، جہاں ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے جسے اس نے سرعت سے صاف کر لیا تھا۔

''ویسے سامی آپس کی بات ہے آپ کا دل نہیں چاہتا کہ آپ کے بھائی کے سہرے کے پھول کھلیں۔''

''ہاں کیوں نہیں۔'' سامعہ نے ناسمجھی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو پھر بادام یہ میرے برابر بیٹھی حسینہ کے تمام حقوق مجھے دلوا دیجئے، یقین کریں ساری زندگی دعائیں دوں گا اللہ آپ کو چاند سا دولہا دے، ننھے منے ستاروں کی طرح چمکتے ہوئے ڈھیر سارے بچے دے اور......'' احسن کی مظلومیت کے ساتھ اس کی بڑی بوڑھی عورتوں کے انداز میں دعائیں شروع ہو چکی تھیں اور اس کے اس طرح بے باکی اور نان اسٹاپ بولنے پر جہاں سامعہ ایک بار پھر ہنستی چلی گئی وہیں رابیل کا رنگ سرخ پڑ گیا، احسن کی باتوں سے جہاں اس کا ڈپریشن دور ہو گیا تھا وہیں اس نے احسن کی منتوں سے ہار کر آخر کار اس کی والدہ ریحانہ آنٹی سے بات کرنے کی ہامی بھر لی تھی۔

☆☆☆

شام کی سنہری دھوپ یکدم سیاہ بادلوں میں چھپ گئی تھی، دھوپ اور بادلوں کی آنکھ مچولی نے شام کے منظر کو حسین تر بنا دیا تھا، وہ گلاس ونڈو کے پاس کھڑی بادل اور دھوپ کی آنکھ مچولی دیکھ رہی تھی جب ہی موبائل کی رنگ ٹون نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی اس نے موبائل اٹھا کے دیکھا احسن کی کال تھی اس نے لیس کا بٹن دبایا تو احسن نان اسٹاپ شروع ہو چکا تھا۔

''سامی یار! آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ مما سے ضرور بات کریں گی آج تو مما کا موڈ بھی بہت اچھا ہے مجھ پر واری صدقے جا رہی ہیں اس سے پہلے کہ مما مجھے طالبان سمجھ کر خود امریکہ بن جائیں، مجھ غریب پر رحم کریں یار آ جائیں آواری میں لنچ کراؤں گا۔'' احسن نے اسے لالچ دیا تو وہ بے اختیار مسکرا دی اور اپنے آنے کی رضا مندی دے کر کال ڈس کنکٹ کر دی، وہ جس وقت احسن ولا پہنچی پورے گھر میں لیڈی گاگا کی آواز گونج رہی تھی، لان میں لگے آم کے درخت پر بیٹھی کوئل کوک رہی تھی جبکہ سامنے ہی لگے بادام کے درخت پر بیٹھی چڑیا چوں چوں کر رہی تھیں، شاہ خاور سیاہ ہوتے بادلوں کے پیچھے اپنی چھب دکھا کر غائب ہو جاتا، سامنے ہی ریحانہ آنٹی بیٹھی ہوئی تھیں، سلام کے بعد وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''کیسی طبیعت ہے آنٹی آپ کی آج احسن بھی بتا رہا تھا کہ پرسوں آپ کی شوگر ڈاؤن ہو گئی تھی آپ اپنا بالکل بھی خیال نہیں رکھتی ناں۔'' سامعہ نے انہیں خفگی سے دیکھا۔

''نہیں بیٹا، بس یہ احسن تو کچھ زیادہ ہی ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھتا ہے۔'' انہوں نے اسے ٹالا۔

''تم سناؤ تمہارا ماہنامہ اور مارکیٹنگ کا کام کیسا چل رہا ہے خوش ہو تم۔'' انہوں نے سامعہ سے پوچھا۔

''جی آنٹی بہت خوش ہوں۔''

''لیکن کتنی کمزور ہو گئی ہو بیٹا اپنا خیال رکھا کرو۔'' ان کے لہجے میں ماؤں کی سی فکر تھی ان

کے انداز پہ سامعہ کی آنکھوں کے فرش گیلے ہونے لگے تھے جسے اس نے سرعت سے سمیٹ لیا تھا۔

''ارے نہیں آنٹی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' جبھی اسے سامنے سے رابیل اور احسن آتے دکھائی دیے احسن ٹرالی گھسیٹ کر لا رہا تھا۔

''ہائے سامی!'' رابیل نے اس سے ہیلو ہائے کرتے ہوئے گرم جوشی سے اس کا گال چوما تو احسن اور آنٹی کے سامنے محبت کے اس مظاہرے پر وہ جھینپ کر رہ گئی، رابیل نیچے گھاس پر بیٹھ گئی جبکہ احسن ریحانہ بیگم کے برابر والی کرسی پر بیٹھ چکا تھا، رابیل اب گھاس پر بیٹھی ان لوگوں کو چیزیں سرو کر رہی تھی جبھی احسن کے بے تابی سے اشارہ کرنے پر سامعہ نے مسکراہٹ چھپائی پھر ریحانہ بیگم سے کہنے لگی۔

''آنٹی اب تو آپ احسن کی شادی کر ہی دیں اب تو ان دونوں کی منگنی کو بھی کافی ٹائم ہو چکا ہے تھوڑا رونق ہو جائے گی گھر میں پھر آفس میں احسن کو بھی بے فکری ہو جائے گی ورنہ آفس میں بھی اس کا ذہن آپ میں ہی اٹکا رہتا ہے۔'' سامعہ نے کچھ جھوٹ سچ کی آمیزش کرتے ہوئے انہیں راغب کرنا چاہا۔

''ہاں میں بھی سوچ رہی ہوں اگلے ماہ کی ڈیٹ رکھ لوں کیونکہ آفاق بھی بتا رہا تھا کہ اس کے سمسٹر ختم ہو جائیں تو پھر شاید وہ بھی چکر لگائے اور پھر اس کے فرض سے فارغ ہو کر میں اپنی بیٹی کے لیے بھی اچھا سا دولہا ڈھونڈوں گی بیٹی ماں کو تم کچھ نہیں سمجھتی تو کیا ہوا ماں تو اسے بیٹی ہی سمجھتی ہے ناں۔'' ریحانہ بیگم نے تفصیلی جواب دیتے ہوئے خفگی کے ساتھ اس کے متعلق اپنے ارادے اور خیالات سے آگاہ کیا تو وہ جو مطمئن ہو کر احسن کے لیے راہ ہموار کر رہی تھی اپنے بارے میں ان کے منہ سے خیالات سن کر اس کے لب خاموش وہ گئے وہ ان کی محبت پر شک نہیں کر سکتی تھی لیکن ان کو رضا مندی دینے میں بھی تامل کا شکار تھی احسن نے رابیل کے ساتھ سامعہ کو بھی اٹھنے کا اشارہ کیا جسے اس نے سرعت سے نظر انداز کر دیا، سامعہ ریحانہ بیگم سے جان بوجھ کر مارکیٹنگ پہ باتیں کرنے لگی تھی اور اس کو جان بوجھ کر موضوع بدلتے دیکھ کر احسن پیر پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا، ریحانہ بیگم نے اس کے پیر پٹخنے کو حیرت سے دیکھا تھا، لیکن سامعہ جانتی تھی کہ یہ صرف وقتی دکھاوا ہے ورنہ اندر تو وہ بھنگڑے ڈال رہا ہوگا۔

☆☆☆

ریحانہ سکندر ایک مشہور ماہنامہ کی چیف ایڈیٹر تھیں، ان کے شریک حیات احسن کی پیدائش پر وفات پا چکے تھے، ان کی دو اولادیں تھیں بڑا آفاق سکندر جو اس وقت اسپیشلائزن کے لیے لندن گیا ہوا تھا اور دوسرا احسن سکندر جو آج کل ان کا ماہنامہ میں بیک وقت کئی کام سر انجام دے رہا تھا، رابیل ان کی بہن کی بیٹی تھی جس کو وہ اپنی بہن کی وفات اور بہنوئی کے دوسری شادی کر لینے کے بعد اپنے گھر لے آئی تھیں، سامعہ حیدر ان کے ماہنامہ میں سب ایڈیٹر کی پوسٹ پر کام کر رہی تھی لیکن وہ ان کی صرف ایک ایمپلائی نہیں تھی بلکہ وہ اسے بیٹیوں کی طرح ہی چاہتی تھیں یہی وجہ تھی کہ سامعہ حیدر بھی ان کو ماں کا درجہ دیتی تھی، احسن اس سے بھائیوں والے لاڈ اٹھواتا تو اس کے بہنوں والے نخرے بھی برداشت کرتا تھا یہی وجہ تھی کہ جب احسن کی آنکھوں میں رابیل کی محبت کے جگنو چمکنے لگے اور رابیل کی پلکیں احسن کے نام پر جھکنے لگیں تو یہ سامعہ حیدر ہی تھی جس نے ریحانہ بیگم کو راضی کر کے ان دونوں کو ایک بندھن میں بندھوا دیا

تھا، لیکن وہ خود کو بھی ایک بے نام بندھن میں بندھا محسوس کرنے لگی تھی اور وہ بندھن تھا آفاق سکندر کے نام کا لیکن شاید وہ انجان تھا یا پھر وہ انجان تھی کہ آفاق سکندر اس کی محبت سے انجان ہے جبکہ حقیقت تو یہ تھی کہ آشنائی رکھنے کے باوجود دونوں انجان بنے ہوئے تھے لیکن وہ دونوں ہی یہ بات نہیں جانتے تھے کہ اس جاننے نہ جاننے کے چکر میں ایک تیسرا فریق بھی ہے جو اس بھید سے کچھ کچھ آگاہ ہونے لگا ہے۔

☆☆☆

احسن کی شادی کا ہنگامہ سرد پڑ چکا تھا وہ جس وقت آفس آئی کاموں کا ایک انبار جمع ہو چکا تھا، رابیل آفس چھوڑ چکی تھی اس کی سیٹ کے لئے کوئی ایمپلائی نہیں مل رہا تھا، احسن کی سرگرمیاں بھی آج کل پراسرار ہو گئی تھیں وہ اس سے پوچھتی لیکن وہ ٹال دیتا ایک آدھ مرتبہ پوچھنے پر جب اس نے تسلی بخش جواب نہیں دیا تو سامعہ کو کریدنا بھی اچھا نہیں لگا، اس دن بھی وہ احسن کو بتا کر میٹنگ اور لنچ کا کہہ کر نکلی تھی اس نے احسن کو بھی ساتھ چلنے کی آفر کی لیکن اس نے انکار کر دیا وہ جس وقت باہر نکلی اسے یاد آیا موبائل تو وہ اپنی ٹیبل پر ہی بھول آئی اس نے بیگ اتار کر احسن کی ٹیبل پہ رکھا اور اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی اس کے جانے کے بعد احسن نے اس کے بیگ کی پاکٹ میں ہاتھ ڈالا تو چابیوں کا ایک گچھا اس کے ہاتھ میں آ گیا اس نے تیزی سے اسے جینز کی پاکٹ میں منتقل کر دیا سامعہ کچھ دیر بعد باہر نکلی تو احسن سامنے رکھی فائل پہ جھک گیا۔

''احسن تم آفس وغیرہ لاک کر کے نکلنا کیونکہ ہوسکتا ہے مجھے دیر ہو جائے اور اگر دیر ہو گئی تو پھر میں وہیں سے گھر چلی جاؤں گی ٹھیک ہے۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' احسن نے اسے بغور دیکھا تو وہ اس کے اس طرح دیکھنے پر چونک گئی۔

''احسن کیا ہوا! تم ایسے کیوں دیکھ رہے ہو کیا رابی سے لڑائی ہوئی ہے۔'' اس نے احسن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر فکر مندی سے کہا تو احسن نے بغور دیکھا اس کے لہجے اور انداز میں وہی مخصوص بہنوں والی محبت تھی جو بھائیوں کی ہلکی سی تکلیف پر بھی جان قربان کر دیتی ہیں۔

''نہیں سامی ایسی کوئی بات نہیں۔'' اس نے اسے ٹالنا چاہا تو سامعہ دوبارہ بول پڑی اور جب وہ دوبارہ بولی تو اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

''تم بہت بدل گئے ہو احسن میں تو تمہیں ہمیشہ اپنا بھائی سمجھتی تھی لیکن تم شاید مجھے اپنی بہن نہیں سمجھتے، جبھی تو مجھ سے ہر بات چھپانے لگے ہو۔'' اس نے آخر کار شکوہ کر ہی دیا۔

''نہیں سامی ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ کل بھی میری بہن تھیں اور آج بھی میری بہن ہیں اور یہ ایک بھائی کا وعدہ ہے کہ وہ اپنی بہن کو ہر خوشی دے گا، بس آپ خوشیوں سے ڈرنا اور منہ موڑنا چھوڑ دیں۔'' احسن نے اس کے کاندھے پہ بازو پھیلا کے اسے اپنے بھائی ہونے کا مان بخشا تو سامعہ نے بھی آنکھوں کے گیلے ہوتے فرش کو سرعت سے سمیٹ لیا لیکن احسن دیکھ چکا تھا وہ تیزی سے وہاں سے نکلتی چلی گئی، اس کے جانے کے بعد احسن نے تمام فائلز سمیٹ کر لاک کیں اور پورے آفس میں نگاہ دوڑائی گو کہ اسٹاف بہت مختصر تھا لیکن وہ سب لوگ بھی اس وقت اپنے اپنے کاموں میں مگن تھے، لیکن احسن رسک نہیں لینا چاہتا تھا اسے آج یہ ٹاسک ہر حال

میں کھیلنا تھا سو وہ لنچ ٹائم کا انتظار کرنے لگا جس میں تھوڑی ہی دیر باقی تھی اور لنچ ٹائم ہونے پر اس نے پورے اسٹاف کو چھٹی اناؤنس کر دی، تھوڑی ہی دیر میں سب لوگ خوشی خوشی اپنے گھروں کی طرف چل دیئے اس نے مین گیٹ کو لاک کیا اور خود سامعہ کے کمرے میں آ گیا ویل ڈیکوریٹڈ وہ کمرہ سامعہ حیدر کی اعلیٰ ذوقی کا منہ بولتا ثبوت تھا، احسن نے جیب سے چابیاں نکال کر تیزی سے ٹیبل کی دراز میں لگانی شروع کی تو دوسری چابی پر ہی وہ کھٹ کی آواز سے کھل گیا، دراز کے اندر رکھی گلابی ڈائری نے اسے مسکرا کر دیکھا گویا احسن کی جاسوسی پر اسے کامیابی کی مبارکباد دے رہی ہو، احسن نے وہ گلابی ڈائری نکال کر دراز واپس لاک کی اور کرسی سے ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھ گیا، اسٹاف کو وہ پہلے ہی فارغ کر چکا تھا سو اب وہ آرام سے سامعہ حیدر کو دریافت کر رہا تھا کیونکہ اتنا تو وہ جان گیا تھا کہ سامعہ حیدر وہ نہیں جو وہ نظر آتی ہے۔

☆☆☆

''18 مارچ 2010ء آج میرا جاب کا پہلا دن تھا میں بہت خوش ہوں، اپنی کمائی کا خواب جو آج پورا ہو گیا ہے، آج ہر چیز اجلی روشن اور چمکدار لگ رہی ہے میں آج خدا کے حضور جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے، آج امی جان کے انتقال کو بھی پورا ایک سال ہو گیا ہے اور یہ ایک سال میری زندگی کے بیس سالوں سے زیادہ لوگوں کے چہرے کو پڑھنا، نظروں کا میٹھا تیکھا پن و لہجوں کی تلخیاں اور نہ جانے کتنی بے شمار چیزوں سے آگاہی دے گیا ہے، زندگی کبھی اتنی تلخ اور آزردہ نہیں لگی تھی جتنی اس ایک سال میں لگنے لگی، لیکن میں آج بہت خوش ہوں اور ان تلخ باتوں اور یادوں کو بالکل بھی نہیں سوچنا چاہتی مجھے ایک ماہنامہ میں اکاؤنٹ اسسٹنٹ کے طور پر اپائنٹ کر لیا گیا ہے کام نہ بہت زیادہ ہے نہ بہت کم لیکن خیر میں کام سے گھبرانے والی نہیں ہوں کیونکہ یہ جاب میرے لئے قارون کے خزانے سے کم تو نہیں ہے بس ایک ہی خواہش ہے کہ اپنی محنت اور دیانت داری سے ایک مقام پا سکوں اور مجھے کچھ نہیں چاہیے، اچھا اب رات بہت ہو گئی ہے صبح جلدی بھی اٹھنا ہوتا ہے۔''

''25 مارچ 2010ء زندگی بہت خوبصورت ہے اس بات کا مجھے ہر پل احساس ہونے لگا ہے، آفس آنے جانے کے بعد تو یہ زندگی اور بھی خوبصورت لگنے لگی ہے، حالانکہ اتنی ٹف روٹین کے بعد کوئی مجھے شاید پاگل کہے مجھے خوبصورت زندگی کہنے پر لیکن خیر مجھے اب اس لفظ سے کوئی تکلیف نہیں، صبح فجر کی نماز کے ساتھ اٹھ کر گھر کے دیگر کام نپٹا کر میں دو گھنٹے پڑھائی کرتی ہوں کیونکہ مارکیٹنگ میری زندگی کا سب سے بڑا خواب ہے اور انشاء اللہ مارکیٹنگ کی دنیا میں نام ضرور بناؤں گی، دس بجے تک آفس روانہ ہوتی ہوں پھر اور فائلیں مجھے ہر فکر اور بوجھ سے آزاد کر دیتی ہیں میں جلد از جلد کام نپٹا کر سکون سے اپنی سوچوں کو قلم کے حوالے کر دیتی ہوں قلم سے رشتہ گو کہ پرانا ہو چکا ہے مگر شکر ہے ٹوٹا نہیں اور اب تو مجھے اپنا ناول جلد از جلد پورا کرنا ہے کیونکہ اب میرا ایک اور خواب اس کو کتابی شکل میں لے کے آنے کا بھی تو پورا ہو جائے گا، آج میں اس بات پر ایمان لائی ہوں کہ زندگی بے شک خوبصورت ہے اور اس کو خوبصورت بنانے میں ریحانہ سکندر جیسے لوگوں کا بھی ہاتھ ہے۔''

''18 مارچ 2011ء وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے کسی گھونسلے سے اڑتے پرندے کی طرح آج مجھے اس جاب پر پورا ایک سال ہو گیا ہے،

ڈیئر ڈائری تم بھی کہتی ہوں گی کہ سامعہ حیدر تو تمہیں بھول گئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سامعہ حیدر تمہیں بھولی نہیں بلکہ اپنے آپ کو منوا رہی ہے، میری زندگی کا سب سے بڑا خواب صرف اپنا آپ منوانا ہے کہ میری ذات بھی اہم ہے اور کسی اور کے لئے نہیں بلکہ صرف میرے لئے اور جب زندگی نے مجھے میری خوابوں کی تعبیر عطا کی تو وہ آسانی چیز بھی مجھے ودیعت کردی گئی جسے ہم محبت کہتے ہیں، خلیل جبران کہتا ہے، محبت صنوبر کے درختوں کی طرح دل سے شاخ در شاخ پھوٹتی ہے کچھ روز بعد وہاں سے ایک نئی کونپل پھوٹتی ہے سو میرے لئے محبت صنوبر کے درخت کی کہانی ہے، میری زندگی بھی صنوبر کے درخت کی طرح بدلنے لگی ہے، وہ بہت خوبصورت نہیں تھا جتنا خوبصورت اس کا کردار تھا وہ کبھی کبھی وہاں آتا تھا اور نہ جانے کیوں صرف ایک نظر دیکھ لینے کے بعد ہی میں سیراب ہو جاتی ہوں وہ سیدھا میڈیم ریحانہ سکندر کے کمرے میں بغیر کسی سے نظریں ملائے اور بات کیے چلا جاتا تھا لیکن آہستہ آہستہ ہم دونوں میں سلام دعا بڑھی اور پھر نوبت ہلکی پھلکی بات چیت تک آ گئی لیکن میں اس سے زیادہ بات نہیں کرتی کیونکہ میں اپنی حیثیت سے آگاہ ہوں کیونکہ آفاق سکندر اس ماہنامہ کے مالکان میں سے تھا اور میں ایک ادنی سی ورکر تھی دل کی مچلتی خواہش اور بدلتی نظروں پر میں نے آفس چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا کیونکہ جو عزت اور محبت میں نے یہاں کمائی تھی وہ میں دل کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے ضائع نہیں کرسکتی تھی۔''

''16 جولائی 2011ء آج میرا جاب کا آخری دن تھا اور آفاق کو جب سے پتا چلا تھا کہ میں آفس چھوڑ رہی ہوں وہ مجھ سے ناراض ہو گیا اس کی ناراضگی سہنا بھی آسان نہیں تھا لیکن میں مجبور تھی، ریحانہ سکندر کے مجھ پر اتنے احسانات تھے وہ بھی مجھ سے آفس چھوڑنے پر ناراض ہو رہی تھیں لیکن میں نے ان کو منالیا تھا اس وعدے پر کہ میں ان کے پرچے کے لئے لکھنا نہیں چھوڑوں گی اور ساتھ ہی میں نے ان کو جب اپنے نئے مارکیٹنگ کے بزنس کا شروع ہونے کی خبر دی تو وہ بہت خوش ہوئی اور دعاؤں کے ساتھ انہوں نے مجھے رخصت کیا تھا، میرے آفس چھوڑنے کے بعد مجھے پتا چلا تھا کہ وہ لندن چلا گیا ہے اپنی اسٹڈیز کمپلیٹ کرنے، ڈاکٹر بننا اس کا شوق اور اسپیشلائزن اس کا جنون تھی اس کے جانے کے چھ ماہ بعد جب ریحانہ سکندر کو پہلا ہارٹ اٹیک ہوا تو اس وقت احسن صرف بیس سال کا تھا کاروبار کی سمجھ بوجھ نہ ہونے کی بنا پر میں آج چھ ماہ بعد پھر دوبارہ اسی ماہنامہ میں بطور ایڈیٹر مقرر ہو گئی ہوں اور میں ان کے حکم پر ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی تھی وہ میری محسنہ تھیں انہوں نے مجھے اس وقت سہارا دیا جب میں کچھ نہ تھی ڈیئر ڈائری تم بھی میری دوست ہونے کے ساتھ بہت اچھی محسنہ ہو اچھا اب رات بہت ہو گئی ہے سو گڈ نائٹ۔''

''26 ستمبر 2015ء آج کا ایک طویل عرصے بعد میں نے اسے احسن کی مہندی میں دیکھا ہے اور آج پانچ سال گزر جانے کے بعد بھی اسے دیکھ کر دل کی دھڑکن نجانے کیوں رکنے لگی تھی لیکن یہ مانا ویسا نہ تھا نہ ہی اس کی آنکھوں میں وہ رنگ تھے شاید وہ مجھے بھول گیا تھا یا پھر شاید اس کی ترجیحات بدل گئی تھیں لیکن مجھے اس کے بدلنے کا اتنا دکھ نہیں ہے جتنا احسن کے بدلنے کا ہی مجھے لگتا ہے احسن بھی بدلنے لگا ہے پہلے وہ مجھے اپنی بہن سمجھتا تھا لیکن اب شاید بھائی

کے آ جانے کے بعد اسے میری ضرورت نہیں رہی اس لیے میں نے سوچا ہے کہ اب جلد از جلد کلفٹن والا آفس ری نیو کروا کر اپنا بزنس وہیں سیٹ کر لوں کیونکہ اب احسن اتنا تو سمجھدار ہو ہی گیا ہے کہ وہ ماہنامہ کی ذمہ داریاں سنبھال سکے آخری بار جو ڈائری لکھی گئی تھی وہ احسن کی شادی کے دن تھی جو ایک ماہ پہلے کی تھی اس کے بعد کیا ہوا تھا وہ ڈائری لکھنا بھول گئی تھی یا اس کو اپنی راز داں سے باتیں کرنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔'' احسن حیرت زدہ سا ساکت بیٹھا تھا یعنی سامعہ حیدر، آفاق سکندر سے محبت کرتی تھی لیکن اس بات کا اظہار تو دور کی بات وہ اس بات کو قبول کرنے میں بھی تامل کا شکار تھی احسن نے کلائی پہ بندھی گھڑی کو دیکھا رات کے آٹھ بج رہے تھے وہ ڈائری پڑھنے اور سامعہ حیدر کو جاننے میں اتنا مگن ہوا کہ اسے وقت گزرنے کا بھی پتا نہیں چلا تھا اس نے موبائل دیکھا رابیل کی چار مسڈ کالز اور ان گنت میسجز آ چکے تھے، اس نے ٹیبل پر سے گاڑی کی چابیاں اٹھائیں اور باہر کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

سیاہ کار تول سڑک پہ پھیلی چاند کی نرم کرنیں بادلوں کے پیچھے اپنی چھب دکھا کر چھپنے لگی تھیں ہوائیں جھوم جھوم کر پتوں سے تالیاں بجانے لگی تھیں، سیاہ لینڈ کروز تیزی سے سڑک پہ بھاگ رہی تھی، تھوڑی دیر بعد لینڈ کروزر احسن ولا میں داخل ہو گئی، احسن نے ابھی اپنی طرف کا دروازہ کھولا تھا سامنے سے رابیل آتی دکھائی دی۔

''کہاں رہ گئے تھے نہ کوئی میسج نہ کال اور نہ تم ریپلائی کر رہے تھے۔'' رابیل پریشانی سے بولتی اس کے ساتھ لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی، احسن نے آستین کے کف اوپر کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں بزی تھا میں یہ بتاؤ، بھیا جان کہاں ہیں۔''

''وہ اپنے کمرے میں ہیں طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے شاید۔'' وہ رابیل کو چائے کا کہہ کر خود آفاق سکندر کے کمرے کی طرف بڑھ گیا، اس نے ناب گھما کر دروازہ کھولا، کمرہ نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، وہ سینے پہ ڈائری رکھے آنکھیں بند کیے کسی گہری سوچ میں گم لگ رہے تھے احسن نے قریب جا کر دیکھا تو وہ گہری نیند کی وادیوں میں اترے ہوئے تھے، اس نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور نفی میں سر ہلایا سینے پہ رکھی ڈائری اٹھا کر اس نے کرسی سے لٹکتی شال ان کے گرد اچھی طرح پھیلا دی اور جونہی مڑا تو ہاتھ میں موجود ڈائری میں سے ایک تصویر نکل کر گر پڑی اس نے تصویر اٹھا کر دیکھا گلابی دوپٹے کے ہالے میں ستاروں کی مانند چمکتی لیکن اداس آنکھوں میں بھی وہ بہت پیاری لگ رہی تھی وہ اس تصویر والی کو اچھی طرح جانتا تھا وہ کوئی اور نہیں بلکہ سامعہ حیدر تھی، تصویر کی پشت پر لکھی خوبصورت نظم کو پڑھ کر احسن بے ساختہ مسکرا دیا۔

چلو جذبہ دل آزما کے دیکھتے ہیں
خواب اس کی آنکھوں میں سجا کے دیکھتے ہیں
نہ جانے کیوں وہ ہمیں اپنا اپنا سا لگتا ہے
دل کے آنگن میں جب اسے سجا کے دیکھتے ہیں
سنا ہے مانگیں دل سے تو مل کر رہتا ہے
چلو اب معجزے اپنی دعا کے دیکھتے ہیں
جب بھی لکھتا ہوں کوئی لفظ اس کے نام بھی
سارے لفظ مجھے مسکرا کر دیکھتے ہیں

اس نے ڈائری میں تصویر واپس رکھی اور خاموشی سے باہر آ گیا کیونکہ وہ جان گیا تھا کہ اب جو کرنا ہے اسے ہی کرنا ہے۔

☆☆☆

وہ دن بھی ایک عجیب دن سامعہ کو فون کر کے ریحانہ سکندر نے اسپیشل فون کر کے بلوایا تھا، گو کہ آفاق کی موجودگی میں وہ جانے سے پرہیز کرتی تھی لیکن ان کے بے حد اصرار سے بلانے پر وہ انہیں انکار نہ کر سکی، جس وقت وہ احسن ولا پہنچی گھر میں اچھی خاصی چہل پہل تھی ریحانہ سکندر بھی بہت خوش اور ہشاش بشاش نظر آ رہی تھیں۔

ریحانہ بیگم نے اس سے گلے ملتے ہوئے باقاعدہ اس کی پیشانی چومی تھی، سامعہ نے ان سے گلے ملتے ہوئے ان کے خوش اور بے ساختہ کھلتی مسکراہٹ کا راز پوچھا۔

''خیریت اتنی چہل پہل اور آپ بھی بہت خوش لگ رہی ہیں خوشی کا راز کیا ہے۔'' اس نے راز دارنہ اسٹائل میں ان کی طرف جھک کر پوچھا تو انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا اور اس کی پیشانی چومی۔

''کل آفاق کے آنے اور اسپیشلائز کی خوشی میں، میں نے پارٹی رکھی ہے اور آفاق کا نکاح بھی ہے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''نکاح۔'' سامعہ نے ان کے نکاح کہنے پر یکدم ساکت ہوئی لیکن اس نے اپنے آپ کو یکدم سنبھال لیا، وہ یہ راز کسی پر آشکار نہیں کرنا چاہتی تھی کہ آفاق سکندر اس کے دل پر دستک دینے والا پہلا شخص ہے۔

''بہت بہت مبارک ہو آنٹی۔'' اس نے گرم جوشی سے مبارکباد دینی چاہی لیکن اپنے لہجے کو کھوکھلے پن سے وہ خود بھی واقف تھی، یکدم نہ جانے کیوں گلے میں آنسوؤں کا پھندہ لگنے لگا تھا جبھی وہ اپنا بھرم رکھنے کے لئے فوراً جانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔

''اچھا آنٹی چلتی ہوں ایک سیمینار اٹینڈ کرنا ہے آج میں لیٹ ہو جاؤں گی، آپ کو بہت بہت مبارک ہو اور کل میں کوشش کروں گی آنے کی۔'' اس نے اپنے نہ آنے کا ہلکا سا عندیہ پیش کر دیا تھا۔

''سامی۔'' وہ جانے کے لئے مڑ چکی تھی جبھی پلٹ کر دیکھا ریحانہ بیگم اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

''بیٹا تم کو بیٹی کہا ہی نہیں بلکہ مانا بھی ہے تم بیٹی ہو تو وہ بیٹا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ایک بیٹی اپنی ماں کی خوشی میں ضرور شریک ہوگئی۔''

وہ سمجھ چکی تھیں کہ وہ آنا نہیں چاہتی کیونکہ اس کے دل کے راز سے واقف ہو گئی تھیں لیکن اس بات کا افسوس تھا کہ انہیں اس راز سے آگاہی اتنی دیر میں کیوں حاصل ہوئی۔

''اوکے آنٹی ضرور آؤں گی۔'' اس نے جھلملاتی آنکھوں سے انہیں آنے کا عندیہ دیا اور پلکیں جھکا گئی، ریحانہ بیگم نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی چومی اور اسے فی امان اللہ کہہ کر رخصت کر دیا وہ اس کی آنکھوں کی جھلملاہٹ دیکھ چکی تھی لیکن اس کا بھرم بھی نہیں کھونا چاہتی تھی، اس لئے اسے جانے کی اجازت دے دی، وہ جانتی تھیں کہ آج کوئی سیمینار نہیں ہے وہ صرف جانے کا بہانہ تلاش کر رہی تھی سو انہوں نے بھی اس کے بہانے کو کامیاب کرنے میں مدد دی تھی۔

☆☆☆

رات دھیرے دھیرے بیت چکی تھی، پو پھٹنے لگی تھی اذان کی آواز پر یکدم اس کی آنکھ کھل گئی، ساری رات سوتے جاگتے گزار کر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی اس نے اٹھ کر پردے سرکائے اذان کی آواز واضح سنائی دینے

لگی تھی، اذان ختم ہوئی اس نے جا کر وضو کیا اور پھر جائے نماز بچھا کر نماز کی نیت باندھ لی، نماز ختم کر کے اس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو کب کے رکے آنسو ایک بار پھر اس کے گال پر لڑھک گئے، ہچکیوں سے روتے کچھ دیر بعد جب اس کے دل میں سکون محسوس ہوا تو وہ چہرے پہ ہاتھ پھیرتی اٹھ گئی، تیار ہو کر وہ کمرے سے باہر آئی تو پورے گھر میں سناٹا ہو رہا تھا پورا گھر سو رہا تھا اس نے گھڑی دیکھی ساڑھے سات ہو رہے تھے، آج کل گھر والوں کی کیا روٹین تھی وہ بالکل بھی بے نیاز ہو چکی تھی، وہ خاموشی سے گاڑی کی چابی اٹھا کر بیگ کندھے پر ڈالا اور باہر آ گئی اس نے ناشتہ نہیں کیا تھا سو قریبی ہوٹل کے قریب گاڑی روک کر اس نے کافی وہیں منگوالی اور پھر گاڑی کلفٹن والے آفس کی طرف ڈال دی اس کا ارادہ تھا کہ وہ اگلے ماہ تک اس آفس میں شفٹ ہو جائے گی لیکن جب گاڑی آفس کے بیس منٹ تک پہنچی تو وہ ایک فیصلہ کر چکی تھی وہ آفس میں جب وقت داخل ہوئی اس کا انٹیریئر تقریباً مکمل ہو چکا تھا، اس نے بیگ اتار کر ٹیبل پر رکھا اور تفصیلی نظر آفس پر ڈالی پھر انٹرکام پہ مینجر کو اپنے کمرے میں بلایا، وہ اس وقت ایک فائل اپنے آگے کھولے بیٹھی تھی لیکن درحقیقت اس کا ذہن احسن ولا میں ہی تھا جبھی دروازے کی دستک پر اس نے اندر آنے کی اجازت دی۔

''جی میڈم آپ نے بلایا تھا۔'' وہ ٹیبل کے پاس آ کر مودب انداز میں کھڑا پوچھ رہا تھا۔

''جی وقاص صاحب یہ آفس میں نے آج سے جوائن کر لیا ہے اس لئے آپ کول پلازہ سے تمام اسٹاف آپ آج لنچ کے بعد بلوا لیجئے اور لنچ کے بعد میری اسٹاف کے ساتھ میٹنگ بھی ارینج کروا دیجئے گا۔''

''جی میڈم! لیکن میڈم باہر کے سائیڈ تھوڑا سا کام رہتا ہے تو......'' انہوں نے ابھی بات پوری بھی نہیں کی تھی سامعہ نے ان کی بات کاٹ دی۔

''لیکن ویکن کو چھوڑیں وقاص آپ یہ جو کام ادھورا ہے اسے آج ابھی ہر حال میں پورا کروائیں، اسٹاف بلوائیں میٹنگ بھی ارینج کریں فوراً۔''

''جی میڈم۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مڑے۔

''اور ایک منٹ وقاص صاحب اس آفس کے سارے ڈیوز کلیئر کر کے آیئے گا۔''

''جی میڈم۔'' وہ بیچارے حیران سے سامعہ کو دیکھ کر اثبات میں سر ہلا رہے تھے، پچاس سے پچپن سال کی عمر کے درمیان سے وقاص صاحب آج خود حیران تھے کہ سامعہ کو آج ہو کیا گیا ہے یہ سارا کام ایک دن میں کیسے ہو گا لیکن انہیں کرنا ہی تھا کیونکہ آج سامعہ کا مزاج ٹھیک نہیں لگ رہا تھا ورنہ وہ اسٹاف پہ اتنا بوجھ ڈالنے کی عادی نہیں تھی اور وقاص صاحب کے ساتھ تو ان کی عمر کی وجہ سے بہت لحاظ کرتی تھی، وہ کمرے سے نکل رہے تھے، جبھی سامعہ کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔

''وقاص صاحب آپ جائیں گے کیسے؟''

''لوکل ٹرانسپورٹ سے میم۔''

''اچھا آپ ایسا کریں میری گاڑی لے جائیں لیکن سارے کام آج ہی ہونے چاہیے۔'' اس نے بیگ سے گاڑی کی چابی نکالی اور ان کی طرف بڑھا دی تھی جس کو وقاص صاحب حیرانی سے تھامتے سامعہ کو دیکھتے ہوئے باہر نکل گئے۔

لنچ ٹائم کے بعد وہ آفس اسٹاف کی میٹنگ ارینج ہو جانے کی خبر پر وہ میٹنگ روم کی طرف جا

رہی تھی جبھی اس کے موبائل کی رنگ ٹیون بجنے لگی اس نے سکرین کو دیکھا تو ریحانہ آنٹی کالنگ لکھا ہوا تھا، اس نے کال کاٹنی چاہی لیکن پھر نجانے کس احساس کے تحت اس نے کال ریسیو کر لی۔

''السلام علیکم آنٹی کیسی طبیعت ہے آپ کی؟'' اس نے سلام کے ساتھ ان کی خیریت دریافت کی۔

''وعلیکم السلام میں تو خیریت سے ہوں لیکن میری بیٹی کے ارادے خیریت سے نہیں لگ رہے۔'' انہیں شاید اس کی کلفٹن آفس میں موجودگی کا پتا چل گیا تھا۔

''نہیں آنٹی اصل میں آج اسٹاف سے میٹنگ ہے اور پھر آج سے یہ آفس بھی جوائن کر لیا تو سارا دن اسی مصروفیت میں گزر گیا۔''

''کب تک پہنچ رہی ہوں گھر پہ۔'' ریحانہ سکندر نے اس کی تفصیل کو نظر انداز کر دیا، ان کے سوال پہ وہ چپ ہو گئی۔

''پانچ بجے، میں تمہارا انتظار کروں گی سامی اور پانچ بجے کا مطلب پانچ بجے ہی ہونا چاہیے، سمجھ رہی ہو ناں میری بات۔'' ان کے لہجے میں مان و محبت کی ایسی مٹھاس تھی کہ سامعہ حیدر جوانکار کا پورا ارادہ کیے بیٹھی خاموش رہ گئی اور انہوں نے اس کی خاموشی کو رضامندی سمجھ کر فون بند کر دیا، وہ موبائل ہاتھ میں لئے کھڑی رہ گئی اپنے کمرے میں آ کر وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی نہ جانے اسے کتنی دیر گزر گئی تھی جبھی اسے یکدم خیال آیا تو اس نے سب سے پہلے میٹنگ کینسل کی اور بیگ اور چابیاں لے کر باہر آ گئی کیونکہ ساڑھے چار ہو چکے تھے وہ جس وقت گھر پہنچی تو گھر میں بھی خلاف توقع معمول چہل پہل تھی سب لوگ کہیں جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے پہلے اس نے ان لوگوں سے پوچھنا چاہا پھر کچھ سوچ کر ارادہ ترک کر دیا اور اپنے کمرے میں آ گئی شاور لے کر وہ جس وقت باہر آئی وہ لوگ تیار ہو چکے تھے اور گاڑی میں بیٹھ رہے تھے آہستہ آہستہ پورا گھر خالی ہو گیا صرف ہانیہ کی آواز آ رہی تھی جبھی ہانیہ نے اس کے کمرے میں جھانکا۔

''سامعہ ہم لوگ ریحانہ آنٹی کی طرف انوائٹڈ ہیں اگر تمہارا ارادہ ہو تو تم بھی آ جانا ہم لوگ جا رہے ہیں دیر ہو رہی ہے۔'' وہ جلدی جلدی کہہ کر تیزی سے نکل گئی اور وہ یہ بھی نہ کہہ سکی کہ میں تم لوگوں کے ساتھ چل رہی ہوں کتنی دیر وہ بیڈ پہ خالی خالی ذہن بیٹھی رہی آسان تو نہ تھا اس کے لئے اپنی کسی اور کے حوالے سے ہوتا دیکھنا، وہ ایک ان دیکھی اذیت میں تھی جبھی اس کے موبائل نے بجنا شروع کر دیا، اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا تو احسن کالنگ لکھا ہوا تھا، اس نے یس کا بٹن دبایا۔

''سامی یار کہاں ہیں آپ چھ بج چکے ہیں مما پریشان ہو رہی ہیں رابیل نے الگ جان کھا رکھی ہے کہ وہ آپ کے بغیر تیار نہیں ہو گی پلیز یار آ جائیں آواری میں لنچ کرواؤں گا۔'' نان اسٹاپ بولتے ہوئے آخر میں اس نے حسب عادت اسے لالچ دیا تو وہ بے ساختہ ہنس دی۔

''آ رہی ہوں دس منٹ میں۔''

''اوکے۔'' احسن نے جواب سن کر فوراً فون بند کر دیا اور پھر جس وقت وہ بے نام سوچوں کو جھٹکتی ہلکا پھلکا تیار ہو کر نکلی تو رابیل کی کال آ گئی اس نے اسے آنے کا یقین دلا کر گاڑی فوراً چوتھے گیئر میں ڈال دی، وہ جس وقت احسن ولا پہنچی تو آفاق سامنے ہی کھڑا تھا، بلیک ڈنر سوٹ میں اس کی وجاہت دیکھنے سے تعلق رکھ رہی تھی

سامعہ نے فوراً نظروں کا رخ پھیرا اور رابیل کے کمرے کی طرف بڑھ گئی، اس نے رابیل کے کمرے پہ دستک دے کر ساتھ ہی دروازہ بھی کھولا سامنے ہی رابیل بلڈ ریڈ میکسی پہنے ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پہ بیٹھی میک اپ کو فائنل ٹچ دلوا رہی تھی دوپٹہ بیڈ پہ پڑا ہوا تھا، بالوں کا آبشار سا کمر پہ گر رہا تھا، سامعہ کی آواز پر وہ بیوٹیشن کو چھوڑ کر تیزی سے اس کی طرف لپکی تھی اور جھٹ سے آگے بڑھ کر اس نے سامعہ کے گال کو چوما، سامعہ اس کی محبت پہ مسکرا کر رہ گئی۔

''بہت خوبصورت لگ رہی ہو رابی آج تو احسن کے ہوش و حواس دونوں غائب ہو جائیں گے۔'' سامعہ نے اسے ہلکا سا چھیڑا ورنہ یہاں آ کے اس کا دل کسی طور اس کے قابو میں نہ تھا وہ اِدھر اُدھر اپنا دھیان لگانے کی کوشش کر رہی تھی جبھی رابیل نے بیڈ سے ایک شاپر اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

''ماما نے آپ کے لئے اسپیشل ڈریس بنوایا ہے آپ جلدی سے چینج کر کے آئیں بیوٹیشن آپ کے انتظار میں بیٹھی ہے۔''

''مگر رابی.....'' وہ کہنا چاہتی تھی لیکن رابی نے اس کو بولنے کا موقعہ دیئے بغیر ڈریسنگ روم کی طرف دھکیل دیا، وہ رابیل کے جیسی ہی میکسی تھی صرف کلر کا فرق تھا رابیل کی ریڈ تھی اور اس کی گولڈن وہ خاموشی سے ڈریس پہن کر باہر آئی تو رابیل نے اس کو ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پر بٹھا کر بیوٹیشن کو اشارہ کیا اور اس کے کیچر میں بندھے نم بال کھول دیئے بالوں کی آبشار پھسل کر اس کی کمر پہ آ گری تھی۔

''رابیل یہ تم کیا کر رہی ہو۔''

''میں تیار ہوں اور......''

''چپ آج کے دن میں آپ کی باس ہوں۔'' اس نے سامعہ کو دھمکایا۔

''اور سنو ناز یہ زیادہ تنگ کریں تو منہ پہ ٹیپ چپکا دینا۔'' اس نے بیوٹیشن کو مخاطب کیا تو وہ ان دونوں کی محبت پر مسکرا دی ایک گھنٹے کی محنت کے بعد وہ پہچان میں نہیں آ رہی تھی، بیوٹیشن نے

ابھی اس کے دوپٹے پر آخری پن لگائی تھی جبھی دروازہ کھلا تو ریحانہ بیگم اندر آرہی تھیں وہ ان کے احترام میں فوراً کھڑی ہوگئی۔

''السلام علیکم آنٹی یہ رابیل.....'' وہ ان سے پوچھنا چاہ رہی تھی لیکن انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموشی کا اشارہ کیا اور اس کی پیشانی چوم لی۔

''آج صرف میرے بیٹے کا ہی نکاح نہیں ہے سامی بلکہ آج میری بیٹی کی بھی شادی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے الجھن بھرے انداز میں ان کی طرف دیکھا پھر رابیل کو جو دروازے میں کھڑی احسن کو نہ جانے کیا اشارہ کر رہی تھی۔

''آیئے قاضی صاحب۔'' اور قاضی صاحب کے اندر آتے ہی رابیل نے ہاتھ میں پکڑی گلابی چادر اس کے سر پہ ڈال دی۔

''سامعہ حیدر آپ کا نکاح، آپ کا نکاح آفاق سکندر سے حق مہر، مہر فاطمی کے مطابق کیا جاتا ہے آپ کو قبول ہے۔'' قاضی صاحب کے الفاظ پر اسے یکدم کرنٹ لگا تھا، اس نے نگاہ اٹھا کے ریحانہ بیگم کو دیکھا ان کے پیچھے اس کے تمام گھر والے موجود تھے گویا وہ سب اس نکاح سے باخبر تھے صرف وہ ہی ایک بے خبر تھی یا پھر اسے جان بوجھ کر بے خبر رکھا گیا تھا، اس کے باپ نے شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور ریحانہ بیگم نے اس کے شانوں کے گرد اپنا بازو پھیلایا تو وہ انکار نہ کر سکی اور قاضی صاحب کے بتائے ہوئے مقامات پر سائن کرتی چلی گئی سب لوگ کمرے سے جا چکے تھے وہ جھلملاتی آنکھوں سے ریحانہ بیگم کو دیکھ رہی تھی۔

''بیٹا ماں کبھی بھی اولاد کے خوابوں اور خواہشوں سے انجان نہیں ہوتی میں نے تمہیں بیٹی کہا ہی نہیں بیٹی سمجھا بھی ہے مگر تمہارے خواب اور خواہشوں کو جاننے میں اس ماں کو جو دیر ہوئی اور جو تکلیف تم کو اٹھانی پڑی اس پر اسے معاف کر دینا۔'' ریحانہ بیگم نے کہا تو وہ نفی میں سر ہلاتی ان سے لیٹ کر زار و قطار رو دی، ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے، جبھی احسن کمرے میں داخل ہوا تو اس نے روتی ہوئی سامعہ کو ریحانہ بیگم سے الگ کیا، اس کے پیچھے آفاق کھڑا تھا جسے سامعہ نہیں دیکھ سکی تھی احسن نے رابیل اور ریحانہ بیگم کو اشارہ کیا تو وہ دونوں باہر نکل گئیں احسن نے آفاق کو سامعہ کے برابر لا کھڑا کیا اور خود بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز پہ جھک گیا، انہوں نے پہلے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر احسن کو اس کا ہاتھ جب ان دونوں کے سامنے آیا تو دونوں کی آنکھیں کھلی رہ گئیں اس کے ہاتھ میں ان دونوں کی وہ ڈائری تھی جس میں چھپی محبت کی خوشبو کو انہوں نے اپنے آپ سے بھی چھپایا تھا لیکن احسن سکندر پھر بھی اس راز کو پا گیا، احسن نے سامعہ کی ڈائری آفاق کی اور آفاق کی ڈائری سامعہ کو دے کر خود شرٹ کے کالر فخر سے کھڑے کیے اپنے اس کارنامے پر وہ ان دونوں کی طرف مسکراہٹ اچھالتا باہر نکل گیا گویا وہ ان دونوں کے راز سے نہ صرف آگاہ تھا بلکہ ان دونوں کو ملانے کا بھی ذریعہ بنا تھا، سامعہ نے حیرت سے پہلا صفحہ کھولا تو اس کی تصویر فرنٹ پیج پہ لگی ہوئی تھی آفاق نے سامعہ کی ڈائری کھولی تو سامنے ہی آفاق سکندر کا نام جگمگا رہا تھا، دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا اور دونوں ہی ہنس دیئے انہیں معلوم تھا اب زندگی کا سفر بہت سہل اور خوبصورت ہوگا۔

☆☆☆

شبانہ شوکت

آج معمول سے زیادہ کام تھا آفس میں، سوریان بہت تھکا ہوا تھا، دل چاہ رہا تھا گھر جا کر لمبی تان کر سو جائے، ساڑھے آٹھ بج رہے تھے جب وہ گھر پہنچا تھا دادو اور رانیہ لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہی تھیں، وہ سلام کرتا وہیں دادو کے پاس ڈھیر ہو گیا۔

''چائے لاؤں آپ کے لئے؟'' رانیہ نے پوچھا۔

''نہیں، اب چائے پیے گا تو کھانا گول کر دے گا۔'' دادو نے ٹوکا۔

''میں پہلے فریش ہو جاؤں، پھر دیکھتا ہوں کھانے کو۔''

''دیکھنا نہیں ہے، کھانا ہے سمجھے۔'' وہ مسکرا دیا۔

''اوکے گرینی۔'' وہ پیار سے ان کے گال چھو کر اوپر اپنے کمرے میں آ گیا، وہ اکثر تھکاوٹ میں کھانا گول کر دیتا تھا، جس پر دادو بہت ناراض ہوتی تھیں، شاور لے کر واش روم سے باہر آیا تو رانیہ بیڈ پر بیٹھی تھی، اسے یوں منتظر پا کر اسے کوفت سی ہونے لگی۔

''کتنی دفعہ کہا ہے کہ مجھے کچھ چاہیے ہو گا تو میں کہہ دوں گا یوں اپنے آپ کو باؤنڈ کر کے کیوں بیٹھ جاتی ہو۔''

''نانو کہتی ہیں آپ کے گھر آنے کے بعد آپ کے پاس ہی رہا کروں، کیا پتا کب آپ کو کس چیز کی ضرورت پڑ جائے۔'' اس کی معصومیت سے کی گئی وضاحت نے اسے لب بھینچ لینے پر مجبور کر دیا تھا، کھانے کے دوران دادو نے اچانک اسے پکارا تھا۔

''ریان کل شام تک کوئی ٹائم نکال سکتے ہو؟''

''جی، کل شام۔'' اس نے اپنی کل شام کی مصروفیات کے بارے میں ذہن پر زور دیا۔

''کچھ کام ہے آپ کو؟''

''ہاں میں چاہ رہی ہوں تم ذرا اسے ڈاکٹر طاہرہ کے پاس لے جانا، مجھے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' انہوں نے رانیہ کی طرف اشارہ کیا، اس نے بھی اسے دیکھا آنکھوں میں حیرت اتری۔

''ٹھیک تو لگ رہی ہے بالکل۔'' اس نے دل میں سوچا۔

''آپ مجھے فون کر کے یاد کروا دیجئے گا۔''

اس نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ کیا ہوا ہے جو ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت پیش آئی تھی، دادو گہری سانس لے کر رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

صبح ریان کی آنکھ کچھ نامانوس آوازوں سے کھلی، کچھ دیر غور کرنے کے بعد اسے یہ آوازیں واش روم سے آتی محسوس ہوئیں، وہ اٹھ بیٹھا کمبل ایک طرف پھینک کر واش روم تک آیا تو کھلے دروازے میں رانیہ واش بیسن پر جھکی ہوئی قے پر قے کر رہی تھی، اس نے آگے بڑھ کر اس کی پشت سہلائی اور کندھوں سے تھام کر باہر بیڈ پر لا کر بٹھا دیا۔

''کیا کھا لیا تھا، یہ تو فوڈ پوائزن لگتا ہے؟''

اس نے جواب نہیں دیا، اتنی نڈھال ہو رہی تھی، ریان نے تکیے سیٹ کر کے اسے لٹا دیا۔

''اب اتنی صبح تو کوئی ڈاکٹر بھی نہیں ملے گا، دادو بھی سو رہی ہوں گی، خواہ مخواہ ڈسٹرب کرنے والی بات ہے، تم یونہی لیٹی رہو، انشاء اللہ کچھ دیر میں آرام آ جائے گا۔'' اس نے ہمدردی سے رانیہ کو دیکھا، اس کی رنگت زرد ہو رہی تھی۔

اسی پل اسے پھر سے ابکائی آئی اور وہ بھاگ کر واش بیسن پر جھک گئی، اب ریان کو

تشویش ہوئی، ایک بار پھر قے کر کے منہ دھو کر وہ دیوار پکڑ کر آنے لگی تو وہ جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سہارا دے کر بیڈ تک لایا۔

''دادو کو جگا دوں؟'' رانیہ کے اثبات میں سر ہلانے پر وہ تیزی سے ان کے کمرے تک پہنچا، کچھ ہی دیر میں وہ اس کے پاس تھیں۔

''یہ کل سے یونہی وومیٹنگ کر رہی ہے، تبھی میں نے اسے لیڈی ڈاکٹر کو دکھانے کے لئے کہا تھا۔'' وہ اس کی کمر سہلاتے ہوئے مسکرائیں۔

''میرے خیال میں تو یہ خوشخبری ہے۔''

''خوشخبری؟'' ریان نے ناسمجھی سے انہیں دیکھا، اسے تو ان کی دماغی حالت کچھ مشکوک لگ رہی تھی، کہاں رانیہ الٹیاں کر کر کے بے حال ہو رہی تھی اور دادو تھیں کہ اسے مسکرا مسکرا کر خوشخبری کی نوید دے رہی تھیں، اسے یوں دیکھتا پا کر وہ بے اختیار ہنس پڑیں۔

''میں پاگل نہیں ہوئی کہ تم مجھے یوں گھور رہے ہو، میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کی کنڈیشن بتا رہی ہے کہ تم دونوں پیرنٹس بننے والے ہو؟''

''Its mean? Parents'' ریان تو چکرا گیا، رانیہ کو دیکھا جس نے اپنا سرخ ہوتا چہرہ تکیے میں چھپا لیا اور وہ پیچھے ہوتا ہوا دھت سے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

☆☆☆

شام کو اسے لے کر ڈاکٹر طاہرہ کے پاس گیا تو دادو کی بات کی تصدیق ہو گئی، دادو بہت خوش تھیں اور ہر طرح سے اپنی خوشی کا اظہار بھی کر رہی تھیں، ساتھ ہی اسے بہت سی ہدایات بھی دے رہی تھیں جو رانیہ کا خیال رکھنے سے متعلق تھیں، وہ اس وقت تو خاموشی سے سنتا رہا مگر رانیہ کے کمرے سے جاتے ہی وہ پھٹ پڑا۔

''یہ ساری ڈائریکشن میرے بجائے اسے دیں، جو ابھی تک خود بچہ بنی رہتی ہے، سنجیدگی نام کی کوئی چیز محترمہ میں پائی نہیں جاتی اور چلیں ہیں یہ مرحلہ سر کرنے۔''

''ریان!'' انہوں نے تنبیہ کی۔

''بہت بری بات ہے، وہ کتنی بدل گئی ہے تم نے کبھی غور ہی نہیں کیا، تمہاری پسند کا کھانا بنواتی ہے، تمہاری پسند کا لباس پہنتی ہے، ہر طرح سے تمہارے بتائے ہوئے سانچے میں پورا اترنے کی ہر ممکن کوشش میں لگی رہتی ہے، اس کا یہ صلہ اگر تم دے رہے ہو تو یہ یقیناً زیادتی ہے۔''

''آپ نے پہلے میری کب سنی تھی جو اب سنیں گی۔'' وہ ناراض ہوتا اٹھ گیا، وہ گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

ان کے دو بچے تھے کیونکہ وہ ورکنگ وومن تھیں تو کم بچوں پر ہی گزارہ کیا، بس اللہ تعالیٰ کی آزمائش تھی کہ دونوں بچے ان کے سامنے دنیا سے رخصت ہوئے، بیٹا آسٹریلیا گیا تھا اور وہیں شادی کر لی اور جب ریان کے بعد ان کے معاملات خراب ہونے لگے تو وہ ریان کو ماں کے سپرد کر کے اس کا فیصلہ کرنے آسٹریلیا پہنچے تو وہ اتنی بپھری ہوئی تھی کہ خنجر کے پے در پے وار کر کے ارسلان کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

وہ کوئی دبلی پتلی ایشیائی عورت تو تھی نہیں، مغرب کی چھ فٹی مضبوط قد کاٹھ کی عورت تھی سو مرد پر وار کرتے ہوئے ذرا نہ جھجکی تھی، یہ صدمہ جانکاہ برداشت کیے صرف پانچ سال ہی گزرے تھے کہ ان کی بیٹی سونیا دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی، بچہ بھی ساتھ ہی لے گئی، عباس (داماد) کی دوسری بیوی کا سلوک رانیہ کے ساتھ روایتی سوتیلی ماؤں جیسا تھا، وہ برداشت نہ کر پائیں اور عباس سے درخواست کی

کہ وہ رانیہ کو ان کے حوالے کر دے، وہ خود بھی معصوم بچی کے ساتھ بیوی کا سلوک دیکھ کر خون کے گھونٹ بھر رہے تھے، یہی بہتر سمجھا کہ رانیہ کو نانی کے حوالے کر دیں، کچھ عرصہ تو باقاعدگی سے ملنے آتے رہے، لیکن رفتہ رفتہ عید، شب برات پر ہی ملاقات ہو پاتی اور فون بھی اب دو دو مہینے کے وقفے سے آنے لگا تھا، صفیہ خاتون نے ان دونوں بچوں کو متاع حیات سمجھ کر پالا تھا، ریان دس سال کا تھا جب چھ سال کی رانیہ اس گھر میں لائی گئی تھی، اسے دادو کی محبت بٹتی دکھائی دی تو وہ ان سے کھنچا کھنچا رہنے لگا، وہ کیسے نہ سمجھ جاتیں، انہوں نے اسے بہت پیار اور محبت سے سمجھایا کہ رانیہ کتنی مظلوم ہے وہ اس کا مقابلہ کرنے نہیں، صرف پیار کی تلاش میں یہاں لائی گئی ہے، ساتھ ہی انہوں نے اسے رانیہ کی سوتیلی ماں کے مظالم کے متعلق بتایا اور اس پر رانیہ کی بے بسی واضح کی۔

ریان کا دل پسیج گیا، وہ رانیہ کا بہت خیال رکھنے لگا، رانیہ دادو کے بعد ریان کی توجہ پا کر لا ابالی سی ہو گئی تھی، جبکہ ریان اس کے مقابلے میں بہت سمجھ دار اور سنجیدہ بچہ تھا، جیسے جیسے وہ دونوں بڑے ہو رہے تھے ان کے دل میں یہ خواہش زور پکڑنے لگی تھی کہ ان دونوں کو آپس میں ایک بندھن میں باندھ دیا جائے، اس لئے وہ دن رات رانیہ کی ٹریننگ کرنے میں ہلکان ہوتی رہتیں، کبھی اسے کوکنگ سکھا رہی ہیں تو کبھی کپڑے پریس کرنے تو کبھی کمرہ سیٹ کرنا، فی الحال تو وہ کچھ بھی سیریس نہیں لے رہی تھی، سارا دھیان تو اپنے دوستوں میں لگا رہتا، جن کے ساتھ کرکٹ، سائیکلنگ ویڈیو گیمز، ٹینس جیسے گیمز کھیلنے میں جو مزہ آتا تھا وہ ہرگز نانو کے ان بور کر دینے والے کاموں میں نہیں آ سکتا تھا پر نانو

جانے کیوں اس کے پیچھے پڑ گئی تھیں، اسے کام سکھا رہی تھیں جن میں اسے کوئی انٹرسٹ ہی نہیں تھا، کوئی انجوائے منٹ ہی نہیں تھی، پھر یہ سخت ترین ہدایت کہ ریان کے سامنے بہت مہذب اور سنجیدہ بن کر بیٹھو، بھلا کیوں، اچھی زبردستی ہے، میری مرضی میں جیسے چاہوں رہوں، یہی خیالات نانو تک پہنچائے تو انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''اس لئے کہ میں چاہتی ہوں تم ان عادات کے ساتھ کسی اور سے کیا نباہ کرو گی، میں ریان کو ہی راضی کر لوں تمہارے لئے اور ان کرتوتوں کے ساتھ ورنہ تو وہ بھی تم سے شادی پر راضی نہیں ہو گا۔'' انہیں تو رہ رہ کر افسوس ہوتا تھا کہ اس وقت وہ اس کا دل بہلانے کے لئے لڑکے، لڑکیوں کی تخصیص کیے بنا اسے دوست بنانے کی اجازت دیئے گئیں اور اب اس کی عادات پختہ ہو گئیں تو اسے گھریلو لڑکی بنانا ایک مصیبت ہو گئی تھی۔

''ریان سے شادی؟'' وہ گم صم ہو گئی، وہ شہزادوں جیسا کزن جو ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی کم کم ہی نظر آتا تھا اور مخاطب تو کہیں قسمت سے ہی ہوتا تھا، اس سے شادی؟ اس کا دل بے طرح دھڑکنے لگا، گال سرخ ہو گئے، نانو نے دلچسپی سے اس کے تاثرات دیکھے اور نرمی سے اسے سمجھانے لگیں۔

☆☆☆

ریان دادو کے ساتھ گروسری شاپنگ کے لئے آیا تھا۔

''اور کچھ؟'' دادو آ کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھیں تو اس نے پوچھا، انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''بس اب گھر چلو، تھکاوٹ سی ہو گئی ہے، رانیہ سے کہوں گی اچھی سی چائے پلا دے۔''

''ہاں وہ پلائے گی، آپ فکر ہی نہ کریں۔''
''نہ کیوں نہیں پلائے گی، آج تو میں اسے بریانی بنانے کا بھی کہہ کر آئی ہوں، وہ بھی بنا رکھی ہوگی اس نے۔''
''چلیں دیکھتے ہیں، اس نے کیا کیا کرلیا ہوگا۔'' استہزائیہ مسکراتے ہوئے اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی، گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو وہ سامنے لان میں اپنے چھوٹے بڑے دوستوں کو جمع کیے کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھی، اچھلتی کودتی، چیختی چلاتی، دادو کے ہونٹ بھینچ گئے تھے۔
''یہ بنائیں گی بریانی؟'' ریان کا دھیما سا طنزیہ لہجہ ان کے کان سے ٹکرایا، وہ خاموشی سے گاڑی سے نیچے اتر آئی تھیں، انہیں دیکھتے ہی رانیہ نے سب کو فارغ کیا اور پیچھے ہی اندر آگئی۔
''ہوگئی شاپنگ؟''
''پہلے پانی پلاؤ۔'' خود پر قابو پا کر انہوں نے تحمل سے کہا، وہ سر ہلاتی ہوئی مڑی اور پانی لے آئی، پانی پلا کر ان کے پاس بیٹھنے لگی کہ انہوں نے ایک اور حکم صادر کیا۔
''اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔'' وہ بدمزہ سی ہوگئی، کرکٹ کھیل کر تھکن سی ہوگئی تھی، وہ تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتی تھی مگر ناچار اٹھنا پڑا، ریان نے ٹی وی آن کرلیا تھا۔
''بریانی تیار ہے؟'' چائے پیتے ہوئے دادو نے پوچھا تو رانیہ کو اچھو لگ گیا۔
''ب...... ب...... بریانی، وہ...... وہ تو۔''
''کیا وہ تو......؟'' ان کے تیور کڑے تھے۔
''وہ مجھے یاد ہی نہیں رہی۔''
''کیا یاد نہیں رہی بریانی؟ تمہیں بریانی بنانا یاد نہیں رہی۔'' انہوں نے کپ ٹرے میں پٹخ کر ...ر شروع ہوگئیں، وہ مجرمانہ انداز میں سر جھکائے ان کی بری بھلی سن رہی تھی۔
''پلیز دادو، چھوڑیں، میں بریانی آرڈر کر دیتا ہوں۔'' ریان نے اکتا کر بات ختم کردی، بھلا یہ کام رانیہ کے بس کے تھے جو دادو اس سے کروانا چاہ رہی تھیں۔

☆☆☆

''کیا کہہ رہی ہیں دادو، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' انہوں نے ریان سے یہ ذکر کیا تو وہ بیٹھے سے کھڑا ہوگیا۔
''جیسے سب کے ساتھ ہوتا ہے ویسے۔'' انہوں نے اطمینان سے کہا۔
''نہیں، میں نے کبھی رانیہ کے لئے ایسا نہیں سوچا، مجھے ایک میچور اور سیریس لائف پارٹنر چاہیے جو میرے موڈ کو دیکھ کر میرے مسائل کو سمجھ کر میرے ساتھ چلے نہ کہ رانیہ جیسی چلبلی لڑکی جو زندگی کو صرف انجوائے منٹ سمجھے، آئی ایم سوری، میں کم از کم اپنے آپ کو اتنی مشکل میں نہیں ڈال سکتا۔''
وہ حتمی لہجے میں انکار کرکے رکا نہیں تھا لیکن صفیہ خاتون کے لئے وقت کی گردش رک گئی تھی، وہ اپنے تئیں ان کی جوڑی بنا کر خوش تھیں، ہلکا سا خدشہ تو تھا ریان کی طرف سے مگر اتنی سختی سے انکار کے بعد کہنے کو کیا رہ گیا تھا۔
''بات سنو ریان!'' انہوں نے ریان کو پکارا جو آفس سے آکر انہیں سلام کرنے کے بعد تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا، وہ فوراً پلٹا۔
''جی دادو۔''
''یہاں آؤ، مجھے ضروری بات کرنی ہے۔'' انہوں نے قریب آکر بیٹھنے کا اشارہ کیا، وہ بیٹھ گیا۔
''عباس کا فون آیا تھا، وہ اپنے بھانجے کا

رشتہ رانیہ کے ساتھ طے کرنا چاہتے ہیں، سوا سے لے جانا چاہتے ہیں، میں نے ان سے کہا ہے کہ وہ اپنی بہن کو کہیں کہ وہ یہیں رشتہ لے کر آ جائیں، میں بھی ان سے ملنا اور لڑکے کو دیکھنا چاہتی ہوں، کل تم پانچ بجے تک آ جانا، ان سے مل لینا اور بہتر ہوگا کہ تم بھی مجھے اپنی پسند بتا دو تو میں دونوں کی ساتھ ہی شادی کر کے فارغ ہو جاؤں۔''

''میں نے کب کہا کہ میں کسی کو پسند کرتا ہوں۔'' وہ حیرت سے بولا۔

''ایسا حتمی انکار تو تبھی کیا جاتا ہے، جب کوئی اور سامنے ہو۔''

''آپ ایسا سمجھتی ہیں تو میں کیا کہہ سکتا ہوں ورنہ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے شانے اچکائے۔

''بہر حال میں نے عباس سے کہا ہے کہ میں رانیہ کو یہاں اپنے گھر سے رخصت کرنا چاہتی ہوں اور وہ مان بھی گئے ہیں، بس کل تم ٹائم سے آ جانا۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

☆☆☆

جلدی جلدی کرتے بھی اسے ساڑھے پانچ ہو گئے، جب وہ گھر پہنچا، ڈرائنگ روم سے آتی آوازوں سے پتا چل رہا تھا کہ مہمانوں کی آمد ہو چکی ہے، اس نے سلام کیا اور دادو کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

''یہ ہے شہریار، عباس کا بھانجا۔''

فرداً فرداً تعارف کرواتے ہوئے جب وہ مطلوبہ لڑکے تک پہنچیں تو ریان نے بھی بطور خاص اسے دیکھا اور بری طرح چونک پڑا، شہریار کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا تھا لیکن دونوں نے خود پر قابو پا لیا تھا، رات کے کھانے کے بعد مہمان رخصت ہوئے تھے۔

''کیسا لگا تمہیں شہریار؟'' انہوں نے ریان سے پوچھا۔

''آپ نے معلوم کیا ہے کہ اس رشتے میں اس کی مرضی بھی شامل ہے۔'' وہ چونک گئیں۔

''کیا مطلب؟ مرضی نہ ہوتی تو وہ آتا ہی کیوں؟''

''خیر وہ تو پیرنٹس مجبور کر کے بھی لا سکتے ہیں؟''

''اچھا تو کوئی مجبور بھی ہو جاتا ہے، ہمارے آگے تو کوئی نہیں ہوا۔'' انہوں نے طنز کیا، وہ چپ رہا۔

''دیکھنے میں تو نارمل ہی تھا، لگتا تو نہیں تھا کہ اسے اس کی مرضی کے بغیر لایا گیا ہے، باقی واللہ اعلم، تمہیں کیوں شک ہوا، کیا اسے پہلے سے جانتے ہو؟''

''ہمارے آفس میں ہی ہوتے ہیں موصوف اور باس کی بیٹی کے ساتھ زبردست افیئر چل رہا ہے ان کا اور شنید یہی ہے کہ بہت جلد شادی کرنے والے ہیں دونوں۔''

اس کے انکشاف نے تو صفیہ خاتون کو وہیں ڈھے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

''یا اللہ کیسا نصیب بنایا ہے میری بچی کا، ہر طرف سے ہی وہ دھتکاری جائے گی؟'' وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی تھیں۔

''دادو پلیز، دادو فار گاڈ سیک پلیز خاموش ہو جائیں۔'' وہ انہیں چپ کروانے کی جتنی کوشش کر رہا تھا وہ اتنی ہی مزید رو رہی تھیں۔

''آئی ایم سوری دادو، مجھے شاید آپ کو نہیں بتانا چاہیے تھا۔'' اس کی بے تکی بات پر انہوں نے سخت ملامتی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''جاؤ جا کر آرام کرو، میں اب خود اس کے لئے کوئی بہت اچھا سا لڑکا دیکھوں گی جو اس کی

عزت تو کرے، محبت نہ سہی۔'' ان کی آواز پھر سے بھرا گئی تھی، وہ کچھ دیر لب بستہ سا وہیں کھڑا رہا۔

''کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے دادو، میں ہوں نا، میں ہی شادی کرلوں گا رانیہ سے۔''

''نہیں کوئی ضرورت نہیں خود پر جبر کرنے کی۔'' وہ ناراضگی سے منہ موڑ کر بولی تھیں۔

''آپ کی خاطر یہ بھی سہی۔'' مسکراتا ہوا ان سے زبردستی لپٹ گیا، وہ بھی ہنس پڑیں تھیں۔

☆☆☆

انہوں نے عباس سے ساری بات کلیئر کرکے ریان کا رشتہ پیش کیا تھا اور وہ تو ان کی رضا میں راضی تھے، دونوں کی شادی بخیر وخوبی ہو گئی اور جیسے تیسے دونوں کی گاڑی چل ہی پڑی تھی، بس اب وہ رانیہ کو ڈھیلا نہیں چھوڑتی تھیں، ہر وقت اسے ریان کی پسند ناپسند کے متعلق بتاتی رہتیں کہ اسے اس کے سامنے کس طرح رہنا چاہیے، آگے بڑھ کر اس کا ہر کام خود کرنا چاہیے، کیا کھانا وہ پسند کرتا ہے، کیسی ڈریسنگ اسے پسند ہے، رانیہ تو ان کی ہدایتوں پر عمل کرکر کے ہلکان ہو جاتی تھی، اب جبکہ وہ اس کنڈیشن میں تھی کہ اس کا وہ بہت خیال تو رکھ رہی تھیں لیکن اسے سختی سے کہا تھا کہ ریان کے سامنے اپنی کسی بھی تکلیف یا کمزوری کا اظہار نہیں کرنا ورنہ وہ اسے بھی اس بچکانہ پن میں شمار کرے گا، اس دن ریان کے دوست کے ہاں ان کی دعوت تھی، وہ تیار ہو کر جیولری پہن رہی تھی کہ اسے اتنی زور کی ابکائی آئی کہ لگا آنتیں ہی الٹ کر باہر آجائیں گی۔

''مائے گاڈ، ایسے جاؤ گی تم وہاں؟'' ریان نے غصے اور کوفت سے اسے دیکھا، وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر واش روم کی طرف بھاگی، عقلمندی یہ کی کہ تولیہ آگے رکھ لیا تو کپڑوں کی بچت ہو گئی، باہر آتے ہی اس نے اپنی دواؤں میں سے ایک گولی، دو گھونٹ پانی کے ساتھ نگل لی۔

''اس سے تھوڑی دیر میں متلی رک جائے گی۔'' اسے تسلی دی۔

''تو پہلے نہیں کھا سکتیں تھیں۔'' وہ غصے سے بڑبڑایا۔

''اب اگر ٹھیک ہو تو چلو۔'' وہ بے بسی سے اسے دیکھتی اٹھ کر پیچھے چل پڑی، سچ کہا ہے کسی سیانے نے بلکہ سیانی نے کہ مرد کا ایک بچہ پیدا ہوتا تو اسے لگ پتا جاتا کہ کیا تکلیفیں سہنی پڑتی ہیں، ہائے رے عورت، آفرین ہے تجھ پر۔

☆☆☆

''اُف۔'' رانیہ بہت زور سے کراہی، اسے بہت درد ہو رہا تھا، ریان کو اٹھانے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا، تھوڑے تھوڑے وقفے سے درد کی وہ لہر آتی کہ وہ بے حال ہو جاتی، رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کرے، نانو نے تو اسے سمجھایا تھا کہ اسے جب بھی بہت تیز درد محسوس ہو تو چاہے ٹائم کوئی بھی ہو وہ انہیں فوراً بتائے، اسے خود ہی نانو کو بتانا چاہیے، وہ اٹھی تو اس کا ہاتھ لگنے سے گلاس گر پڑا، سائیڈ ٹیبل کی گلاس ٹاپ پر گلاس ٹکرانے کی زوردار آواز پیدا ہوئی، جس سے ریان اٹھ گیا تھا۔

''کیا ہوا؟'' مندی مندی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''مجھے بہت پین ہو رہا ہے، آپ نانو کو بلا دیں۔''

''اس وقت؟'' اس نے ایک نظر وال کلاک پر اور دوسری اس پر ڈالی۔

''دماغ ٹھیک ہے، کوئی پین کلر لو اور سو جاؤ۔'' وہ اسے جھڑک کر پھر سونے لگا تھا کہ وہ چیخ مار کر رو پڑی تھی۔

''نانو..... نانو کو بلا دیں پلیز۔'' وہ بلک بلک کر رو پڑی تھی، وہ غصے سے کمبل پھینک کر دادو کے کمرے تک تیزی سے آیا، خلاف توقع دو دفعہ کی دستک پر ہی وہ اٹھ کر آ گئیں۔

''کیا ہوا، خیریت؟''

''وہ آپ کی لاڈلی بلا رہی ہے آپ کو، ذرا سی تکلیف برداشت نہیں ہو رہی اور رات کے اس پہر رونا دھونا ڈالا ہوا ہے۔'' وہ اتنی تیزی سے اس کے پاس سے گزریں کہ اس کی آدھی بات تو منہ میں ہی رہ گئی تھی۔

''ریان جلدی گاڑی نکالو، اسے ابھی ہاسپٹل لے کر جانا ہے۔''

''لیکن میرا ڈریس، یہ تو نائٹ سوٹ۔''

''ہمیں چھوڑ آؤ، پھر جو دل چاہے کرتے رہنا۔''

دادو تو اس کے بھی ہاتھ پاؤں پھلائے دے رہی تھیں، خود تو حد درجہ گھبرائی اور بوکھلائی تھیں ہی، اس نے گاڑی اسٹارٹ کی، جب تک وہ رانیہ کو ساتھ لئے ایک ہاتھ میں چھوٹا سا بیگ لئے آ گئیں پھر جب رانیہ کو اندر لے جایا گیا تو نانو نے اسے گھر جا کر کپڑے تبدیل کرنے کے لئے کہا، اب اتنا تو وہ بھی سمجھ گیا تھا کہ جس خوشخبری کی نوید کئی ماہ سے سنی جا رہی تھی، وہ بس آیا ہی چاہتی ہے، وہ کپڑے چینج کر کے واپس ہاسپٹل پہنچا، دادو منتظر نگاہوں سے باہر ہی کی سمت دیکھ رہی تھیں۔

''بہت بہت مبارک ہو، اللہ تعالیٰ نے بیٹا عطا کیا ہے۔'' انہوں نے اس کا ماتھا چوما، چہرہ خوشی سے گلرنگ ہو رہا تھا، وہ مسکرایا۔

''آپ کو بھی مبارک ہو۔''

کچھ ہی دیر میں بچہ ان کے پاس تھا، ریان نے بے اختیار اپنے لب اس کے ننھے سے ماتھے پر رکھ دیئے، ایکدم اتنی ساری محبت اس ننھے سے وجود کے لئے امڈ آئی کہ وہ حیران رہ گیا، پھر جب رانیہ کو روم میں شفٹ کیا گیا تو وہ اس کے پاس پہنچے، دادو نے اسے بہت سا پیار کیا اور بچہ اس کے ہاتھوں میں تھمایا، وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگی، ریان نے آگے بڑھ کر اسے مبارک باد دی۔

''آپ کو بھی بیٹا مبارک ہو۔'' وہ مسکرائی، اتنی زرد اور نڈھال سی ہو رہی تھی مگر مسلسل مسکرا رہی تھی، کتنی تکلیف اٹھائی لیکن بڑھ کر اسے نہیں جگایا، حالانکہ بچے کی اتنی جلدی پیدائش ہی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی تھی کہ وہ کتنی تکلیف میں تھی، وہ جو چھوٹی سی چوٹ پر چلا اٹھتی تھی، اتنی بڑی تکلیف سے اس کو خاطر خاموشی سے بہت حد تک صبر سے گزر گئی، کتنا بدل لیا تھا اس نے خود کو ریان کے لئے وہ اس کی محبت میں اپنی ذات کی مکمل نفی کرتے ہوئے اس کی پسند کے سانچے میں ڈھلنے کی ہر ممکن کوشش کرنے کے بعد حقیقتاً اس کا دل جیت چکی تھی، ریان کو اس پر بے حد پیار آ رہا تھا، وہ خود سے عہد کر رہا تھا کہ آئندہ اپنی ہر غلطی کی تلافی کرے گا، وہ مسکراتا ہوا اس کے قریب آیا۔

''کیسا لگ رہا ہے؟'' اس کا اشارہ بچے کی طرف تھا۔

''بہت پیارا۔'' رانیہ نے اسے سینے سے لگا لیا۔

☆☆☆

دو ہفتے انتہائی مصروفیت کے گزرے تھے، نئی نئی مصروفیت تھی، بچے کے ساتھ راتوں کو جاگنا اور دن بھر آنے جانے والوں سے ملنا، رانیہ کا تو دماغ پلپلا ہو گیا تھا، یہ تو ابھی نانو اعیان کو لے کر بیٹھتی تھیں تو وہ کچھ سو لیتی تھی، ریان آفس سے

آنے کے بعد مکمل طور پر اعیان کی طرف ہی متوجہ رہتا، اس کو ایک کھلونا مل گیا تھا، وہ اس کی کیئر بھی بہت کرتا تھا، اس کی سنجیدہ و خاموش طبیعت کو دیکھتے ہوئے کسی کو امید نہیں تھی کہ وہ بچے سے اتنا والہانہ پیار کرے گا، مگر وہ تو اس سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا، کتنی کتنی دیر اسے گود میں لئے بیٹھا رہتا۔

رات کو آنکھ کھل جاتی تو اٹھ کر رانیہ کے ساتھ لگ جاتا، کبھی اس کے رونے پر ناگواری ظاہر نہیں کی تھی، کبھی ٹائم بے ٹائم اس کی ضرورت کی کوئی چیز لانے پر ماتھے پہ کوئی بل نہیں پڑا تھا، ہاں رانیہ کو وہ بہت چیک کرتا تھا کہ وہ اس کی صحیح کیئر کر رہی ہے یا نہیں، کوئی ذرا کمی محسوس ہوتی تو جھڑکنے سے باز نہیں آتا تھا، اعیان جیسے جیسے بڑا ہو رہا تھا، ویسے ویسے ہاتھ پاؤں بھی چلانے لگا تھا۔

اس دن اتوار کی چھٹی تھی، وہ اسے تیار کر کے ریان کو دینے آئی، وہ دادو کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھا تھا۔

''یہ اعیان کو لے لیں، میں کچھ کام نمٹا لوں۔'' وہ اسے اس کی طرف بڑھانے لگی کہ اس نے اتنی تیزی سے ہاتھ پاؤں چلائے کہ اس کے ہاتھوں سے چھوٹتے چھوٹتے بچا، ریان نے جھپٹ کر اسے پکڑا اور دھاڑا تھا۔

''ایسے پکڑتے ہیں اتنے سے بچے کو، ابھی یہ گر جاتا تو۔'' وہ سہم کر پیچھے ہٹی تھی۔

''دادو آپ اس کی خود کیئر کیا کریں، اسے کیا پتہ بچہ کیسے پالتے ہیں۔''

''تو پالنے سے ہی پالنا آئے گا نا۔''

''ایسے آئے گا پالنا، جب دو چار دفعہ اسے گرا لے گی، اگر یہ تم سے گرا تو میں اس کے لئے گورنس کا انتظام کرلوں گا، تمہیں تو ہاتھ بھی لگانے

نہیں دوں گا۔"

وہ تو صحیح ردھم میں آیا تھا، رانیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، دادو نے تاسف سے سر جھٹکا تھا۔

پھر سارا دن وہ چپ چپ اور کھنچی کھنچی رہی تھی، ریان پہلے اس کی کتنی پرواہ کرتا تھا کہ اب فکر ہوتی، جمعے کو نونومبر کی چھٹی تھی، وہ پھر سارا دن گھر پر تھا، اپنے معمول کے کاموں سے فارغ ہو کر وہ لیپ ٹاپ لے کر اپنی میلز چیک کرنے لگا کہ اعیان کے رونے کی آواز پر چونکا۔

وہ کیری کاٹ میں اس کے پاس بیڈ پر موجود تھا، اس نے حیرت سے اسے دیکھا، پتا نہیں کب رانیہ اسے چھوڑ گئی تھی، اس نے اسے کیری کاٹ سے نکالا اور گود میں لے کر بہلانے لگا مگر شاید وہ بھوکا تھا۔

"رانیہ......رانیہ۔" وہ کچھ تاخیر سے کمرے میں آئی تھی۔

"سنائی نہیں دے رہا، کتنا رو رہا ہے یہ؟"

"تو آپ چپ کروا لیتے نا۔" اس کے تلخی سے کہنے پر ریان تو سکتے میں ہی رہ گیا تھا۔

"کیا، کیا کہا میں چپ کرواتا تو تم کس مرض کی دوا ہو۔" ہوش میں آ کر وہ دھاڑا تھا۔

"تو جب گورنس رکھیں گے تو وہ کیسے چپ کروائے گی؟" وہ بھی ترکی بہ ترکی جواب دے رہی تھی۔

"تو یہ تکلیف ہے تمہیں اب تک، کہ میں نے گورنس کا کیوں کہا، تو ٹھیک ہی کہا تھا میں نے، اس طرح میرا بچہ پالو گی تو بندوبست کرنا ہی ہوگا۔"

"تو یہ صرف آپ کا بچہ ہے، میرا کچھ نہیں لگتا۔"

"تم بدتمیزی کر رہی ہو رانیہ اور میں بہت برداشت کر رہا ہوں، اسے لو اور فیڈ کرواؤ، کتنا رو رہا ہے یہ۔"

وہ چپ سی ہو گئی، اعیان کو لے کر فیڈ کروا کر، کندھے سے لگا کر تھپکا، اسے ڈکار آئی تو بیڈ پر لٹا دیا، وہ خوب ہاتھ پاؤں مارنے لگا، ریان نے لیپ ٹاپ سائیڈ پر رکھا اور اس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے لگا۔

"آپ یہ نہیں سوچتے کہ آپ اسی طرح مجھے سب کے سامنے ڈانٹیں گے، جھڑکیں گے تو ہمارے بیٹے پر کیا اثر پڑے گا، وہ میری کیا عزت کرے گا، اس کی اچھی تربیت کے لئے تو ہم دونوں کو ہی خود پر قابو پانا ہوگا، ہم خود بروکن فیملیز کے بچے ہیں، ہمیں اپنی محرومیوں کا اچھی طرح پتا ہے تو ہم اپنے بچے کو تو ایک مکمل ماحول، ایک مکمل فیملی دے سکتے ہیں، اس طرح چیخ چلا کر تو ہم اسے بھی ابنارمل کر دیں گے۔"

ریان تو جیسے اعیان پر جھکا ہوا تھا، کتنی ہی دیر اسی پوزیشن میں رہ گیا تھا، اتنی گہری بات اور رانیہ کے منہ سے، سننے کا تو خواب بھی نہیں دیکھا تھا، بہت دیر خاموشی چھائی رہی، پھر وہ سیدھا ہوتا ہوا مسکرایا۔

"یعنی اب تم ماں بن چکی ہو، تو تمہارا احترام بھی مجھ پر فرض ہو گیا ہے، اچھی بات ہے آئندہ تمہیں مجھ سے یہ شکایت نہیں ہوگی۔" رانیہ سمجھ نہیں پائی کہ وہ سنجیدہ تھا یا مذاق اڑا رہا تھا۔

"نانو نے کبھی مجھے نہیں ٹوکا، کبھی میری غلطی کو درست نہیں کیا، مجھے تو چھوٹ دیتی گئیں اور اس کی خامیاں نکالتیں رہیں، شاید میں بھی اندر کہیں خود کو مسٹر پرفیکٹ سمجھ کر، اسے ہر بات پر ٹوکنا اپنا فرض سمجھ بیٹھا یہ بھول گیا کہ اب وہ صرف میری بیوی نہیں، ایک ماں بھی ہے۔" وہ مسکرا دیا، جانے کیا سوچ کر۔

"چلو تمہیں خود احساس ہو گیا یہ اچھی بات

ہے، اب تم دونوں مل کر اپنے بچے کو وہ سب دو جو تمہیں نہیں مل پایا۔" دادو شفقت سے مسکرائیں۔

"انشاءاللہ۔"

☆☆☆

اعیان سو رہا تھا، رانیہ صوفے پر بیٹھی کسی گہری سوچ میں گم تھی، ریان پاس آ کر بیٹھا تو وہ چونکی۔

"ناراض ہو؟"

"نہیں، میں تو ناراض نہیں ہوں۔" وہ بہت دھیمے سے بولی۔

"ہو بھی تو میں منا لوں گا۔" وہ دلکشی سے مسکرایا اس نے نظریں جھکا لیں۔

"میں مانتا ہوں میں بہت جگہ غلط تھا، میں سمجھتا تھا کیونکہ ہم دونوں بروکن فیملیز کے بچے ہیں تو ہم نہ تو ایک مکمل فیملی بنا پائیں گے نہ ہی بچوں کی صحیح تربیت کر پائیں گے لیکن تم نے تو میرے سارے خدشات کا خاتمہ کر دیا، نہ صرف میرا ایل پل خیال رکھا بلکہ اپنے بچے کی اتنی اچھی دیکھ بھال کی کہ میں اب کہنے پر مجبور ہوں کہ دادو ہماری شادی کر کے ایک بہترین فیصلہ کیا تھا، دو بروکن فیملیز کے بچے تو شاید زیادہ اچھی فیملی بنا سکتے ہیں، وہ جن دکھوں، تکلیفوں اور محرومیوں سے گزرے ہوتے ہیں، ان سے اپنے بچوں کو تو کبھی نہیں گزرنے دیں گے، کب کہاں اور کیوں انہوں نے اپنے پیرنٹس کو مس کیا ہوتا ہے، وہاں وہ اپنے بچوں کو مس نہیں کرنے دیں گے، تم نے تو میری آنکھیں کھول دیں رانیہ میرے اندر جو ایک خوف تھا جو تمہاری محبت کو تسلیم نہیں کرنے دیتا تھا، وہ تم نے ایک جھٹکے سے ختم کر دیا ہے۔" رانیہ نے چونک کر اسے دیکھا، وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔

"کیوں تم کیا سمجھتی ہو، محبت صرف تم کرنا جانتی ہو، میں نہیں کر سکتا۔" اس کے شرارت سے کہنے پر وہ جھینپ گئی تھی۔

"میں شروع سے جانتا تھا کہ میری لاابالی کزن میرے لئے خاص فیلنگز رکھتی ہے، مجھے بھی وہ گڑیا بہت پیاری لگتی تھی لیکن میرے اندر کا خوف مجھے تمہاری طرف بڑھنے سے روکتا تھا، اب پتا چلا ہے کہ میں کتنا غلط تھا، اپنی غلطی تسلیم کی ہے تو اپنی محبت کو بھی تسلیم کرنا ہو گا۔" رانیہ نے غیر یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"مجھے تو نہیں لگتا کہ آپ کو مجھ سے کوئی محبت بھی ہے، اتنے دن ہو گئے، ہماری ناراضگی کو تو آپ نے اسے ختم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔"

"تو یہ اب کیا کر رہا ہوں، ویسے بائی دا وے آپ کس قسم کی کوشش چاہ رہی ہیں۔" اس کی معنی خیز بات پر رانیہ کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"آپ بہت فضول......" ریان کے بے ساختہ قہقہے کی گونج میں اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی، خوشیاں اس کے گرد رقص کر رہی تھیں، دکھ، ہرشیانیاں، خدشات واہمے سب کہیں دور رہ گئے تھے۔

☆☆☆

سونیا چوہدری

وہ دس دن پہلے ولی سے ناراض ہو کر اپنے میکے چلی گئی تھی، مگر ولی کو اس کی غیر موجودگی کا احساس اس قدر ستانے لگا تھا کہ اسے لگا وہ سالوں سے اس دور ہو۔

لیکن اخر کیوں؟؟؟

''آخر کیوں ہمیں کسی بھی چیز کی قدر اس وقت ہوتی ہے جب وہ ہم سے دور چلی جائے۔'' ولی نے آنکھیں موندے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے ہوئے سوچا تو دفعتاً وحشت کے احساس سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''ولی احمد ابھی میں آپ کے پاس ہوں اسی لئے آپ میری قدر نہیں کرتے مگر آپ دیکھئے گا جب ایک دن میں آپ سے دور چلی جاؤں گی تو آپ کو میرا احساس ہو گا اور تب آپ دوڑے دوڑے میرے پاس چلے آئیں گے۔'' ناراضگی میں کہا گیا اقراء کا جملہ سوچوں سے نکل کر اس کی سماعتوں سے ٹکرایا تو ولی نے سر جھٹکتے ہوئے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سامنے وال کلاک کی جانب دیکھا۔

رات کے دو بج چکے تھے اور وہ اب تک صرف اس کی یاد میں جاگ رہا تھا۔

''کیوں؟ ولی احمد کہیں تمہیں اس عورت سے محبت تو نہیں ہو گئی؟'' دل کے کسی کونے سے بہت ڈرتے ڈرتے یہ آواز باہر نکلی تھی۔

''محبت اور وہ بھی اقراء سے؟ بھلا میں اس سے محبت کیسے کر سکتا ہوں؟ میں تو ہمیشہ سے اس سے نفرت کرتا آیا ہوں، میں نے تو کبھی اک نظر ہمدردی کی بھی اس پر نہیں ڈالی تو مجھے اس سے محبت کیسے ہو سکتی ہے؟''

''محبت کیسے یا ایسے نہیں ہوتی ولی احمد، محبت تو بس محبت ہوتی ہے اور یہ ہو ہی جاتی ہے، کسی کو بھی...... کسی سے بھی۔'' اس نے سوچتے ہوئے آنکھیں موندلیں اور کروٹ بدلتے ہوئے سونے کی سعی کرنے لگا، لیکن شاید آج نیند بھی اس سے روٹھ کر کہیں چلی گئی تھی اور شاید اس کی آج کی رات کروٹیں بدلنے میں ہی گزرنے والی تھی۔

☆☆☆

آفس میں آج ایک ضروری میٹنگ تھی جس کے لئے ولی کو دس بجے آفس پہنچنا تھا، لیکن رات دیر سے سونے کی وجہ سے وہ جلدی بیدار نہ ہو پایا۔

اس نے مندی مندی آنکھوں سے گھڑی کی جانب دیکھا تو کرنٹ کھاتے ہوئے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، ساڑھے نو ہونے والے تھے، وہ جلدی میں بیڈ سے اتر کر وارڈ روب کی جانب بڑھا اور اپنی مطلوبہ شرٹ ڈھونڈنے لگا جو اس کو آج پہننی تھی، مگر وارڈ روب کی حالت اتنی بگڑی ہوئی تھی کہ بے ترتیب چیزیں دیکھ کر اب الجھنے لگا تھا، اقراء کی موجودگی میں ہر چیز اس کو وقت سے پہلے تیار ملتی تھی، غصے میں جو شرٹ اس کے ہاتھ لگی پکڑ کر وہ شاور لینے چلا گیا اور چند لمحوں میں شاور لے کر نکل آیا، وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے بال بنا کر ہٹا تو اپنی گھڑی اور والٹ تلاش کرنے لگا،

ولی اکثر آفس جانے سے پہلے اپنا والٹ گھڑی اور موبائل بیڈ کی سائیڈ ٹیبل سے اٹھاتا تھا لیکن آج وہاں والٹ تھا نہ گھڑی اور نہ ہی اس کا موبائل، اب تو آفس جانا بھی اس کو عذاب لگنے لگا تھا، اس نے مختلف جگہوں سے اپنی مطلوبہ چیزیں تلاش کی اور بنا ناشتے کے ہی باہر پورچ میں چلا آیا، گاڑی کے قریب پہنچ کر اس کو یاد آیا کہ وہ گاڑی کی چابی تو ڈریسنگ ٹیبل پر ہی بھول آیا ہے، ولی نے جھنجھلاتے ہوئے اپنے قدم واپس کمرے کی جانب بڑھائے اور ڈریسنگ

ٹیبل سے چابی اٹھاتے ہوئے اس کی نظر وہاں پڑی ایک تصویر پر ٹھہر گئی، وہ ان دونوں کی شادی کی تصویر تھی، جس میں اقراء نازک پری کی مانند نظریں جھکائے ہلکی سی مسکان لبوں پر سجائے ولی کے ہمراہ کھڑی بے حد مطمئن سی لگ رہی تھی، مگر ولی...... ولی کے چہرے پر تو خفگی غصہ، اکتاہٹ ہر طرح کے آثار صاف نمایاں تھے۔

آخر کیوں وہ اقراء سے گریز کرتا تھا؟ محض اس لئے کہ وہ اس کے والدین کی پسند تھی؟ نہیں بلکہ اس لئے کے اس کو ہر عورت سے ہی نفرت ہو چکی تھی، صرف اور صرف ایک عورت کی وجہ سے، جس سے کبھی وہ بے حد محبت کرتا تھا، جس کو وہ بہت چاہتا تھا اور وہی عورت اس کو دھوکہ دے کر کسی اور کے ہمراہ چل دی تھی، لیکن ان سب میں اقراء کا کیا قصور تھا؟ اس نے اب تک اقراء کو کیوں اس کے تمام حقوق و فرائض سے محروم رکھا ہوا تھا، وہ تصویر کی جانب بغور دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا، جب موبائل پر آنے والی کال نے اس کو خیالوں سے حقیقت کی دنیا میں واپس آنے میں مدد کی تھی، اس نے فون کان سے لگایا تو اس کے پی اے کی کال تھی، ولی نے دس منٹ میں آفس پہنچنے کی اطلاع دیتے ہوئے فون آف دیا اور واپس ایک نظر تصویر کو دیکھ کر آفس کے لئے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

''اقراء تمہیں ایسے گھر چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا، تم تو اب تک ولی کی نیچر سے واقف ہو چکی ہو نا کہ وہ کیسا ہے اور اگر وہ تمہیں لینے نہیں آئے گا تو کیا تم کبھی واپس نہیں جاؤ گی؟'' اقراء کی بہن ایمل نے فکرمندی سے پوچھا۔

''وہ آئے گا ایمل، وہ ضرور آئے گا، ایسا میں نہیں میرا دل کہتا ہے اور دل کبھی جھوٹ نہیں بولتا، لیکن ایک بات تو طے ہے ایمل، اب جب تک وہ اپنی مرضی اور خوشی سے مجھے لینے نہیں آئے گا میں بھی نہیں جاؤں گی۔'' اقراء کے لہجے میں یقین کے ساتھ سنجیدگی بھی تھی۔

''لیکن تم ایک بار اسے کال تو کر لو؟'' ایمل نے التجائی انداز میں کہا۔

''کیوں؟ میں کیوں کروں کال؟ کیا اس کے پاس میرا نمبر نہیں ہے؟ کیا اس کو میری ضرورت نہیں ہے؟ ایمل پچھلے ایک سال سے میں ہی ہر کام میں پہل کرتی آئی ہوں، مگر اب مجھے لگتا ہے اگر میں مزید خاموش رہی اور اس کو اپنے رشتے کا احساس نہ کروایا تو وہ کبھی بھی میری کمی کو میری ضرورت کو میری اہمیت کو محسوس نہیں کر پائے گا اور میں بہتر جانتی ہوں کے میں نے اپنے شوہر کو اب کیسے اپنا احساس کروانا ہے، چار دن اور گھر کے معاملات سنبھالنے پڑیں گے تو یاد میں ہی آؤں گی۔'' اقراء نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا ایمل کو بھی جبراً مسکرانا پڑا، وہ بس اپنی بہن کو ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

اقراء نے ولی سے فرمائش کی تھی کہ وہ اس کو آئس کریم کھلانے کہیں باہر لے کر جائے تو ولی نے اقراء کو دسمبر کی سردی کا احساس دلانے کے بجائے کہ وہ اتنی سردی میں آئس کریم کھائے گی تو بیمار بھی ہو سکتی ہے، اس کو اتنا ڈانٹا کہ وہ اپنی الٹی سیدھی فرمائشیں لے کر اس کے پاس نہ آیا کرے اور اگر اس کا زیادہ کچھ کھانے پینے کا دل چاہے تو اکیلی ہی چلی جایا کرے، مگر اس کو تنگ مت کیا کرے۔

اس دن اقراء اس کی ڈانٹ کے بعد پوری رات روتی رہی تھی اور وہ سکون کی نیند سویا ہوا تھا، تب ہی اقراء نے سوچا کہ وہ اپنے والدین کے

گھر چلی جائے گی اور اب کبھی واپس نہیں آئے گی، جب کسی کو یہاں اس کی ضرورت ہی نہیں کوئی فکر ہی نہیں تو واپس آ کر کرے گی بھی کیا۔

اگلی صبح اس نے ولی کو اپنے جانے کی اطلاع دی تو وہ نہ حیران ہوا اور نہ ہی پریشان، ولی نے اس کو روکنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی اور وہ اداس سی ایک نگاہ اس کے سنجیدہ چہرے پر ڈال کر چلی آئی۔

☆☆☆

میٹنگ کے بعد وہ آفتاب کے ہمراہ اس کے بہت زور دینے پر کافی بار چلا آیا، وہ دونوں کونے میں کھڑکی کے قریب لگے ٹیبل پر چلے آئے۔

آفتاب کرسی کھسکا کر ولی کے سامنے آ بیٹھا، آفتاب نے ویٹر کو ہاتھ کی انگلی کے اشارے سے دو کپ کافی کا آرڈر دیا، تو چند ہی لمحوں میں ویٹر بھاپ اڑاتے کافی کے مگ ان کو پیش کر گیا۔

ولی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا، یہ دسمبر کے آخری دنوں میں سے ایک دن تھا، وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا جب آفتاب کے مخاطب کرنے پر اس کی جانب متوجہ ہوا۔

''کیا تم اب تک بھابھی کو واپس نہیں لے کر آئے؟'' آفتاب نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ اس نے نظریں چرا لیں اور چند ثانیے بعد کچھ کھوئے ہوئے سے انداز میں بولا۔

''اس کو واپس آنا تھا تو گئی ہی کیوں؟''

''کیونکہ وہ تمہاری اس بے رخی سے تنگ آ گئی ہوگی، آخر کوئی کب تک برداشت کرے گا ولی؟ وہ تم سے چاہتی ہی کیا ہے؟ صرف تمہاری محبت اور تھوڑی سی توجہ؟ جو کہ ان کا حق بھی ہے۔'' آفتاب نے ولی کو سمجھاتے ہوئے کہا، وہ دونوں بہت گہرے دوست تھے، آفتاب جانتا تھا ولی کا اقراء کے ساتھ اچھا رویہ نہیں ہے، اس لئے موقع ملتے ہی اس کو سمجھانے لگتا تھا۔

''عورت مرد سے صرف عزت اور محبت چاہتی ہے، لیکن تم نے تو نہ کبھی ان کو عزت دی ہے اور نہ ہی محبت، ان کا قصور کیا ہے یار؟'' آفتاب نے کافی کا مگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے نہیں پتہ اس کا کیا قصور ہے...... لیکن......''

''لیکن کیا؟ اگر تم نے یہی رویہ اختیار کرنا تھا تو تم شادی ہی مت کرتے جوگیوں کی طرح ہی اس بے وفا کی یاد میں اپنی ساری زندگی گزار لیتے، کم از کم اپنے ساتھ کسی بے گناہ کی زندگی تو برباد مت کرتے۔'' آفتاب عاجز آ گیا تھا اس کو سمجھاتے سمجھاتے۔

ولی نے گہری نظروں سے آفتاب کی جانب دیکھا اور خاموشی سے کافی کے گھونٹ حلق سے اتارنے لگا۔

☆☆☆

شال اوڑھے اداسی میں ڈوبی وہ تنہا بالکونی میں کھڑی ولی کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی، نہ جانے اس نے کچھ کھایا ہوگا کہ نہیں، وہ سونے سے پہلے کافی ضرور پیتا تھا پتہ نہیں وہ خود بناتا بھی ہوگا کہ نہیں یا بنا کافی کے ہی سو جاتا ہوگا، صبح آفس جاتے اس کو اپنا موبائل ڈھونڈنے میں مشکل تو نہیں ہوتی ہوگی کیونکہ ولی کی عادت تھی جہاں بھی بیٹھتا تھا موبائل وہیں رکھ کر بھول جاتا تھا، اداسی سے اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی، وہ شادی کے بعد پہلی بار اتنے دن تک اپنے والدین کے گھر رہی تھی، اس کو ولی سے محبت کے ساتھ اس کی عادت بھی ہو چکی تھی، سب کے سامنے وہ خود کو کیسے نارمل اور خوش رکھتی تھی یہ بس

وہی جانتی تھی، لیکن اتنے دن گزرنے کے بعد بھی جب ولی نے اس کی کوئی خبر نہیں لی تو وہ اندر ہی اندر ٹوٹ کر بکھرنے لگی تھی۔

☆☆☆

تھکا ہارا شام کو جب وہ آفس سے لوٹا تو جوتے اتار کر ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر ہی نڈھال سا ہو کر گر گیا، اس نے پورے دن میں صرف ایک کپ کافی پی تھی وہ بھی آفتاب کے بہت کہنے پر، اب اس کو شدید بھوک کا احساس ہوا تو وہ اٹھ کر کچن میں چلا آیا، سینک میں رات کے کھانے والے برتن اب تک پڑے تھے، اس نے فریج کھول کر کچھ کھانے کے لئے ڈھونڈا مگر سب کچھ ختم ہو چکا تھا، گھر کی مالکن کے بغیر گھر بالکل بے ترتیب ہو چکا تھا۔

''عورت بے جان بنی اینٹوں کی عمارت میں جان ڈالتی ہے اور جس گھر میں عورت موجود نہ ہو وہ ایسا ہی ہوتا ہے، بے ترتیب، بکھرا اور ادھورا۔'' ولی نے اکتا کر فریج کا دروازہ زور سے بند کیا اور واپس لاؤنج میں چلا آیا، اس نے ٹیبل سے گاڑی کی چابی اٹھائی اور جیکٹ پہنتا ہوا گھر سے نکل گیا۔

کئی لمحے وہ یونہی سڑک پر گاڑی بھگاتا رہا، اس کو بھوک بھی لگی تھی لیکن کچھ کھانے کا دل بھی نہیں چاہ رہا تھا، سردیوں میں سورج جلد ہی غروب ہو جاتا ہے، ولی نے گاڑی سڑک کنارے کھڑی کی اور خود باہر نکل آیا، اس نے آسمان کی جانب نظریں اٹھائیں، آسمان بادلوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا، ہوا سرد بوجھل اور نم ہو چکی تھی، کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد وہ واپس گاڑی میں آکر بیٹھ گیا، اس نے کچھ کھوئے کھوئے سے انداز میں چابی اگنیشن میں گھمائی اور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اقراء کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

چند منٹوں کی ڈرائیونگ کے بعد وہ اقراء کے گھر کے سامنے تھا، گھر میں داخل ہوا تو اقراء کی امی سفینہ بیگم اور ایمل لونگ روم میں آتش دان کے قریب بیٹھے دسمبر کی سرد شام میں چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے، ولی نے آگے بڑھ کر انہیں سلام کیا تو سفینہ بیگم نے پر جوش انداز میں اس کی سلام کا جواب دیا اور اس کے استقبال میں کھڑی ہو گئیں، ان کے اتنی عزت دینے پر ولی آج پہلی بار اندر ہی اندر شرمندہ ہوا تھا، ان کی بیٹی کے ساتھ اتنی ناانصافی کرنے کے بعد بھی وہ اس کو کتنی عزت اور مان دیتی تھیں، یا پھر شاید اقراء نے ایمل کے علاوہ بھی کسی اور سے ولی کی بے رخی اور اس کے رویے کے بارے میں شیئر نہیں کیا تھا، اسی لئے اقراء کے والدین اس سے اتنے پرجوش انداز میں ملتے تھے۔

''آؤ بیٹھو بیٹا!'' سفینہ بیگم نے شائستگی سے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ صوفے پر براجمان ہو گیا۔

''ایمل جاؤ بیٹا ولی کے لئے چائے لے کر آؤ، اتنی سردی میں باہر سے آیا ہے۔'' سفینہ بیگم نے چائے پیتی ایمل سے کہا تو اس نے بغور ولی کو گھورا اور بنا کچھ کہے کچن کی جانب بڑھ گئی۔

''اور بتاؤ واپس کب آئے؟ اقراء بتا رہی تھی تم کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے تھے۔'' سفینہ بیگم نے بتایا تو ولی نے دل ہی دل میں اقراء کی مخلصی کو سراہا کہ اس نے ناراضگی میں بھی ولی کا مان رکھا تھا۔

''جی بس آج ہی واپسی ہوئی ہے، تو اقراء کو لینے چلا آیا، کہاں ہے وہ؟'' ولی نے تلاشتی نظروں سے لاؤنج میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اپنے کمرے میں

گئی تھی، میں ابھی بلاتی ہوں۔'' سفینہ بیگم اٹھ کر جانے لگی کہ اقراء ہاتھ میں چائے کے ساتھ تمام لوازمات کی ڈش تھامے داخل ہوئی، ایمل نے شاید اس کو ولی کے آنے کی خبر کر دی تھی، وہ ولی کی جانب دیکھے بغیر ڈش ٹیبل پر رکھ کر سلام کرتی ہوئی سامنے صوفے پر بیٹھ گئی، وہ ولی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے موبائل کی جانب متوجہ ہو گئی، وہ جان بوجھ کر اس کو اگنور کر رہی تھی۔

''اقراء ولی تمہیں لینے آیا ہے، جاؤ بیٹا تیار ہو جاؤ۔'' سفینہ بیگم نے محبت سے مسکراتے ہوئے کہا تو اقراء نے ولی کی جانب دیکھا جو پہلے سے ہی اس کو دیکھ رہا تھا، اقراء کو اس کی حالت دیکھ کر تکلیف بھی ہوئی تھی لیکن وہ جان بوجھ کر اس کو چھوڑ کر آئی تھی کہ وہ اس کی کمی محسوس کرے، وہ ولی کو صرف اس کی زندگی میں اپنے ہونے کا احساس کروانا چاہتی تھی، جو کہ وہ کروا چکی تھی، ولی کی حالت اس کو بتا رہی تھی کہ اس نے یہ دن کیسے گزارے ہیں۔

بڑھی ہوئی شیو، بکھرے بال اور چہرے پر چھائی برسوں کی سی تھکاوٹ اس کی کیفیت بیان کر رہی تھی۔

اقراء بنا کچھ بولے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی جہاں ایمل پہلے سے موجود تھی، اقراء کے پاؤں مارے خوشی کے زمین پر نہیں پڑ رہے تھے، اس نے جھوم کر خوشی سے ایمل کو گلے سے لگا لیا تو ایمل بھی مطمئن سی ہو کر مسکرا دی۔

''آخر تمہارا پلان کامیاب ہو ہی گیا۔'' ایمل نے شرارت سے اس کو چھیڑتے ہوئے کہا تو وہ کھلکھلا اٹھی۔

''وہ تو ہونا ہی تھا، آخر ولی صاحب کب تک اپنی حسین بیوی سے دوری اختیار کر سکتے تھے۔'' اقراء نے ہنستے ہوئے کہا تو ایمل بلند آواز میں ہنسنے لگی۔

''اچھا اب ہنسنا بعد میں میرے ساتھ پہلے میرا سامان پیک کروانے میں مدد کرو۔'' اقراء نے بیگ میں اپنا ضروری سامان رکھتے ہوئے کہا، چند لمحوں بعد وہ دونوں واپس لاؤنج میں چلی آئیں۔

''چلیں؟'' اقراء نے سپاٹ لہجے میں ولی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بھی جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

دونوں سفینہ بیگم اور ایمل سے اجازت طلب کرتے ہوئے وہ گاڑی میں آ بیٹھے، ولی نے اب تک اس کو مخاطب نہیں کیا تھا تو اقراء نے بھی اس سے کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

کئی لمحے وہ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا اور پھر اپنی انا ضد اور بے رخی کو ختم کرتے ہوئے آج پہلی بار وہ اس سے نرم لہجے میں مخاطب ہوا تھا۔

''کیسی ہو؟''

''آپ کے بغیر کیسی ہو سکتی ہوں؟'' اقراء نے سوال کے بدلے میں سوال کر ڈالا تو وہ چند ثانیے کے لئے خاموش ہو گیا۔

''تم مجھے چھوڑ کر کیوں چلی آئی تھی؟'' ولی نے نظریں سامنے سڑک پر جمائے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

''تو آپ نے مجھے جانے سے روکا کیوں نہیں تھا؟'' اقراء نے تنک کر کہا۔

''تمہیں نہیں جانا چاہیے تھا۔'' ولی کے لہجے میں شکایت تھی۔

''آپ کو بھی جانے سے روکنا چاہیے تھا۔'' اقراء بھی شکوہ کرنا نہیں بھولی تھی۔

''معذرت چاہتا ہوں۔'' ولی نے بے بسی سے کہا۔

''آپ کی معذرت قبول کی جاتی ہے۔''

اقراء نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو ولی نے بریک لگا کر گاڑی روکی اور بنا کچھ کہے گاڑی سے اتر گیا، اقراء بھی نا سمجھی کے سے انداز میں اس کے ساتھ گاڑی سے اتری، باہر ہلکی ہلکی رم جھم برس رہی تھی، ہوائیں بے حد خنکی تھی۔

ولی سامنے ایک گلابوں کے اسٹال کی جانب بڑھ گیا اور ایک سرخ گلاب کا بکے خرید کر واپس اس کے قریب چلا آیا۔

رات جیسے جیسے ڈھلتی جا رہی تھی سردی کی شدت کا احساس بھی بڑھ رہا تھا، اقراء نے کندھوں سے سرکی ہوئی شال کو درست کرتے ہوئے سامنے کھڑے ولی کو دیکھا۔

''یہ گلاب تمہارے لئے، میں چاہتا ہوں اب ہمیشہ تمہاری زندگی کو ان پھولوں کی طرح مہکا دوں، اب کبھی تمہیں خود سے دور نہیں جانے دوں گا، تم نہیں جانتی اقراء یہ دس بارہ دن میں نے کس طرح گزارے ہیں، تم میری چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال کیسے رکھتی تھی یہ مجھے تمہارے جانے کے بعد احساس ہوا، تم دور ہوتے ہوئے بھی بہت قریب تھی میرے، تمہارے بغیر گھر کے ساتھ میری زندگی بھی بے ترتیب ہونے لگی تھی، اس لئے میں تمہیں لینے چلا آیا کہ تم مجھے اور ہمارے گھر کو ترتیب دے سکو، تمہارا وجود میرے لئے میرے گھر کے لئے کتنا اہم ہے یہ میں اب جان پایا ہوں، میں نے تمہیں بہت ستایا ہے اقراء، پلیز مجھے معاف کر دو۔'' ولی اس کے روبرو کھڑا اپنے کیے کی معافی مانگ رہا تھا، اقراء کی آنکھوں میں نمی تھی اور لبوں پر مسکراہٹ، اقراء نے محبت سے ولی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر اس کی شرمندگی کو کم کرنا چاہا۔

ہلکی ہلکی رم جھم دفعتاً تیز بارش کی شکل اختیار کر گئی تو وہ دونوں گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔

''ولی!'' اقراء نے مخصوص دھیمے لہجے میں اس کا نام پکارا، وہ گاڑی سے باہر تیز برستی بارش کو دیکھ رہا تھا۔

''ہوں۔''

''آپ تو واقعی ہی میرے بغیر بہت بے ترتیب ہو گئے ہیں اور اس کا ثبوت آپ کے موزے دے رہے ہیں، ایک جراب اور تو دوسری اور ہے۔'' اقراء نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے معصوم سی شکل بناتے ہوئے کہا، وہ جب گھر میں لاؤنج میں صوفے پر بیٹھا تھا اقراء نے اس وقت ہی اس کے پاؤں میں الگ الگ موزے دیکھ لیے، لیکن اس وقت وہ بمشکل اپنی ہنسی پر قابو پا سکی تھی، اقراء کے بتانے پر ولی نے بے اختیار اپنے پاؤں میں پہنی جرابوں کو دیکھا، ولی کا جاندار قہقہہ گاڑی میں گونجا تھا۔

''یار بس دیکھ لو ثبوت بھی میں ساتھ لے کر آیا تھا کہ میں کس قدر بے ترتیب ہو گیا ہوں۔'' ولی نے بمشکل اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا۔

''اور اس وقت تم جوتوں جرابوں پر نہیں بلکہ مجھ پر توجہ دو۔''

''اس لمحے صرف تم میں اور یہ حسین بھیگا دسمبر اہم ہے۔'' ولی نے محبت سے کہا تو اقراء نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا اور ولی نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے گھر کے راستے پر ڈال دی، دونوں کی زندگی ایک دوسرے کے ساتھ پا کر مکمل ہو گئی تھی اور اس بھیگے دسمبر نے ان دونوں کے ان لمحوں کو چار چاند لگا دیئے تھے۔

☆☆☆

تیری چاہت کے نام
سیما بنت مریم

وہ لاکھ سر پٹختی واویلا کرتی مگر اس کے ہمراہ اماں کا دم چھلا لگا رہنا اک لازمی امر تھا، جن کا خیال تھا کہ وہ اتنی نالائق تھی کم عقل ہے کہ کوئی بھی منٹوں میں اسے بے وقوف بنا سکتا ہے، خیر یہاں تک بھی درست تھا مگر جو اس ضمن میں اماں کے ال فیئرڈ رویے تھے اکثر اوقات اسے جی بھر کے پشیمان کیا کرتے، رستے میں کسی جان پہچان والے یا والی کا ٹکراؤ اماں کو گھنٹے بھر کے لئے ''بک'' کر دیا کرتا عین راستے میں کھڑے ہو کر جس کے خاندان بھر کی خیریت سے واقفیت اماں کے لئے لازم وملزوم، ایسے میں اس کی سیروں کے حساب سے بڑھتی کوفت کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا جس کے چہرے کے بنتے بگڑتے زاویے اس کی بدمزگی کا کھلم کھلا اعلان کیا کرتے۔

نجمی کے بیاہ کر آنے کے بعد اس نے سکھ کا سانس لیا تھا، انہوں نے جی بھر کے اکثر بازاروں کے پھیرے لگائے تھے دوستوں کے گھر یہاں تک کہ کالج کی بچھڑی بھولی بسری سہیلیاں بھی اسے یاد آ گئیں مگر ابھی اس کا سکھ کا سانس راستے ہی میں تھا کہ نجمی کی حالت کے پیش نظر اماں نے ڈھیروں ڈھیر دفعات اس پہ نافذ کر دیں جن کی بجا آوری پر بہر حال نجمی بھی مجبور تھی، نجمی اس کی ہم عمر سہی مگر اپنے اس گھر سے رشتے کی نزاکت کو بھی سمجھا کرتی تھی اور دریہ بلا ناغہ اس کی ہمت پر اس کی پیٹھ ٹھونکا کیا کرتی، بھلا اماں جیسی نان سٹاپ ہستی کو راضی رکھنا آسان کام تھا اور ابھی ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ دوپہر کی نام نہاد نگوڑی بیماریوں نے اک نیا رخ بدلا اسے نہ چاہتے ہوئے بھی ہسپتال کا منہ دیکھنا ہی پڑا، صاف ستھرے چکنے ماربل کے فرش، ڈاکٹرز کے خوبصورت گلاس وال والے کمرے، آدھا تو مریض یونہی اپنا مرض بھول جاتا ہے وگرنہ ہسپتالوں کی روایتی گندگی اس کی طبیعت ہمیشہ مکدر کر دیا کرتی تھی اور ایسے میں اماں کا شٹل کاک برقعے سے سجا وجود ہولنا، کھولنا جن کی غالباً پیدائشی بیماری تھی، ویٹنگ لاؤنج میں سنگی بینچ پر بیٹھنے کا لازمی بولڈ و بے تکلفانہ انداز اسے نظریں اٹھانے لائق نہ چھوڑتا، وہ فراغت پا کر اونگھنے بھی لگا کرتیں اور یہی وہ موقع ہوتا جب وہ اطمینان سے ڈاکٹر کے روم کا رخ کر سکتی تھی وگرنہ گھوڑ مارے جوان جہان ڈاکٹر بھلا اماں کی نظروں میں قابل اعتبار ٹھہرے ناممکن، مگر ان کا اونگھنا دریہ کو مزید شرمندگی سے بچا گیا اور دو چار روز میں اماں کو اہسپتال کے عملے سمیت ڈاکٹر پر بھی اعتبار آ ہی گیا۔

وہ مزید فراغت اور یکسوئی سے اونگھنے کا پروگرام جاری رکھا کرتیں اور دریہ چند سکوں کے سانس لیتی، انتہائی اعتماد سے ریسپشن پر جا کر نام درج کرواتے نمبر لیتے ہوئے وہ پل بھر کو اپنے آپ کو خاصا پروقار محسوس کیا کرتی تھی، مگر وہ جو اک مثل ہے ناں، آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا، غالباً ایسے مواقعوں کے لئے استعمال کی جاتی ہے، اس کا تیسرا یا چوتھا چکر تھا جب خوش پوش دور سے اسمارٹ نظر آنے والے ڈاکٹر کی نظریں پیغام دیتی محسوس ہونے لگیں اور مزے کی بات یہ تھی کہ اس کی بدمزگی بھی نہ اثر انداز ہو سکی اور آج بھی وہ اسے دیکھ کر قدرے کھل سا گیا تھا۔

''زہے نصیب، آج دیر ہو گئی آپ کو۔''

اس نے بے ساختہ گھڑی کی جانب دیکھا تھا اور دریہ کے دل کی دھڑکنوں نے اپنی لے تبدیل کر لی (بس یہیں تو مات کھا جاتی ہیں دریہ جیسی لڑکیاں)۔

''آپ نے انتظار کیا۔'' نجمی کا خیال تھا اور غالباً درست ہی تھا کہ وہ خاصی حاضر جواب ہے،

وہ جواباً ہولے سے ہنسا اور یونہی تھرمامیٹر اٹھا کر
کٹ کٹ کرنے لگا۔

"میرے منہ میں ڈالیں انشاء اللہ پارہ
اضافی حدود کراس کر جائے گا۔"

"خیریت۔" وہ پھر ہنسا غالباً یہ ادراک
اسے پہلے ہی نصیب ہو چکا تھا کہ اس کی ہنسی
خاصی دلکشی رکھتی ہے۔

"خیریت ہوتی تو یہاں نظر آتی؟" اس
کے تیور خونخوار تھے۔

"ارے تو حال چال ہی بتا دیجئے۔"

"حال خاصا بد حال ہے مگر چال چلن
نیک۔"

"گڈ۔" انہوں نے کہتے ہوئے تھرمامیٹر
اس کی جانب بڑھایا تھا۔

"منہ بند کروانا تھا تو ویسے ہی بتا دیتے، اس
کی کیا ضرورت تھی؟"

"تمہاری یہی باتیں سننے کے لئے تو تمہارا
انتظار کرتا ہوں اور معلوم ہے دنوں سرشار رہا کرتا
ہوں، تمہاری یہی گفتگو یاد کر کر کے۔" اور ایسا ہوتا
ہے ناں، جب مقابل ہماری ہر کڑوی کسیلی کو طرح
دے جائے تو یونہی بناوٹی غصہ کر کر کے ایسے ناز
اٹھوانا اچھا لگتا ہے اور غالباً اسی سے مات کھائی
جاتی تھی۔

☆☆☆

"اسے کہتے ہیں، شکل چڑیلوں کی مزاج
پریوں کے، ایک آنکھ نہیں بھاتے مجھے اس لڑکی
کے لیل و نہار، سمجھ میں نہیں آتا اس کا بنے گا
کیا؟" اماں کے ایور گرین راگ جاری تھے۔

"پیسہ پانی کی مانند بہہ رہا ہے مگر اسے ذرا
خیال نہیں، اسے ایسا کون سا اللہ مارا مرض ہو گا جو
جا کے نہیں دے رہا، گلے کے غدود پھولے
ہوئے ہیں آئے روز بخار کا بہانہ کر کے پڑی رہتی
تھی اور اسے ان کاموں کو اس کی اپنی حرکتوں نے
پہنچایا ہے، سینکڑوں کے حساب سے دن بھر میں
چھالیہ کی پڑیاں کھا جاتی تھی اور نخرا دیکھو، سرکاری
ہسپتالوں سے گھن آتی ہے شہزادی صاحبہ کی خاطر
پرائیویٹ اسپتال کا منہ دیکھنا پڑا مگر ذرا جو اسے
احساس ہو، ذرا افاقہ نصیب ہوا اور محترمہ نے
چھپ چھپا کر کیری کترنی شروع کر دی، دواؤں
کے بل کا تو کوئی حساب ہی نہیں مگر ان کے کون
سے پلے سے جا رہا ہے جو یہ احساس کریں، کم
بخت نے ہمیشہ میرا دل جلایا ہے نہ ڈھنگ سے
پڑھ کر دیا نہ گھریلو کام کاج کی سدھ بدھ، میں تو
سوچتی ہوں کون لے کر جائے گا عقل کا اندھا
گانٹھ کا پورا اس بے نتھنے بیل کو۔" اور اس میں
کوئی شک نہیں کہ اس کے ازلی لاپرواہ وغیر ذمہ
داریوں نے اماں کی جان عذاب کر رکھی تھی وہ
جتنا جھلاتیں کم تھا۔

"لوتھا کی لوتھا ہو گئی مگر تمیز نام کو نہیں، بچوں
کی مانند کرکٹ سے لگوا لو، جھولے کی اونچی اونچی
پینگیں لینا بھلے سے ماں کا دل ہولتا ڈوبتا ہی
رہے، گھنٹے گھنٹے بھر فون پر گفت و شنید اور اگر جو
فراغت نصیب ہو جائے تو موئے کیبل کے بے
ہودہ پروگرام جو دن رات ایمان خراب کیا کرتے
ہیں، جب دیکھو کوئی نہ کوئی منحوس ماری سہیلی منہ
اٹھائے چلی آ رہی ہے، بتائے دیتی ہوں اس کی
ساری سہیلیوں کا بائیکاٹ نہ کیا تو میرا نام نہیں
ہاہ۔" وہ جانے کسے سنا رہی تھیں اور کس سے
مخاطب تھیں، تبھی اپنے کمرے کے کسی کونے
کھدرے میں گھسی تھی جبکہ وہ دیر سے آنگن میں
پڑے جھولے پر جھولے لیتے ہوئے ان کی
لتاڑیں سنتے ہوئے کچی کیری چبا رہی تھی جسے
چوری سے کترنے پر اماں کے غیض و غضب کو
دعوت ملی تھی، اماں جانے کب تک جاری رہتیں

اور اس کی شکل ان کے غصے کو مزید ہوا دیتی رہتی، ناچار اس نے ایک لمبی پینگ لیتے ہوئے دھپ سے آنگن کے فرش پر قدم رکھے، اماں نے دہل کر کلیجے پر ہاتھ رکھا اور شعلہ بار نگاہوں سے اسے گھورا جوان کی سابقہ جھاڑ لاپروائی سے جھٹک کر نجمی کے کمرے کا رخ کر چکی تھی، وہ عادت کے مطابق دھپ سے اس کے بیڈ پر گری تو الماری میں منہ گھسیڑے نجمی نے مڑ کر اسے دیکھا اور مسکرائی۔

''سن لیں اماں کی سخت سست، ہفتے بھر کی ڈوز ایک ہی روز میں، کیا ضرورت تھی کھلم کھلا ان کے سامنے یوں کیری کترنے کی۔''

''جب انہوں نے چوری سے کھاتے پکڑ ہی لینا تھا تو پھر چھپا کر کھانے کی کیا تک۔''

''پھر گلے سوج جائیں گے اور پڑی نظر آؤ گی بخار میں، اماں کا غصہ بے جا نہیں۔''

''جب مسیحا ہی اتنا دلکش ہو تو کس کافر کا دل چاہے گا صحت مند ہونے کو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

''اماں تک پہنچا دوں تمہارے زریں خیالات۔'' وہ شرارت سے مسکرائی۔

''وقت آنے دو انشاء اللہ یہ کام تم ہی نے انجام دینا ہے۔''

''صرف چند ملاقاتوں میں اتنا بڑا فیصلہ، محترمہ یہ زندگی ہے فلم نہیں، حقیقت کی دنیا میں واپس آؤ۔''

''کاش تم نے بھی خوابوں کی دنیا میں جا کر رہنا سیکھا ہوتا، کتنا دل خوش کن ہوتا ہے وہ جہان، کتنا ہی وقت گزر جائے آنکھیں کھول کر حقیقت کی دنیا میں آنے کو دل ہی نہیں کرتا، بس اک ہجر اک آواز سماعت میں رس گھولتی رہتی ہے جسے بار بار کیسٹ کی مانند ریوائنڈ کر کے دہرانے کے عمل سے جی نہیں بھرتا، آنکھیں موندو تو دل کے آسمان پر فقط ایک ہی چہرہ چاند کی مانند چمکتا ہے جس کے دیدار سے طبیعت سیر ہی نہیں ہو پاتی کتنی دلفریب ہوا کرتی ہے یہ خوابوں کی دنیا، نجمی ڈیئر تم کیا جانو۔'' وہ سچ مچ آنکھیں موندے بے حد جذب سے کہہ رہی تھی نجمی کو قریب آ کر کتاب اس کے سر پر ہولے سے مارنی ہی پڑی۔

''محترمہ جاگ جائیے صبح ہو گئی ہے۔'' اس نے اس دخل در معقولات پہ اسے گھورنا چاہا تھا مگر وہ مسکرا رہی تھی۔

''میری زندگی کا بدترین دن تھا وہ، جب تمہیں بھابھی بنانے کا خیال میرے دل میں آیا۔''

''اور میری زندگی کا خوبصورت ترین دن تھا وہ، جب میں سچ مچ تمہاری بھابھی بن گئی۔'' اس نے برجستہ کہا تھا وہ شارق کے کپڑوں کا ڈھیر الماری سے نکال کر لائی تھی، استری کرنے کی نیت سے وہ استری سٹینڈ کی جانب بڑھ گئی، دریہ نے سارے کپڑوں کا ڈھیر اس سے جھپٹ کر ایک جانب ڈال دیا۔

''سارے کام چھوڑو، میرا فیشل کر دو۔''

''ہائیں فیشل کی تمہیں کیا ضرورت، بے بی اسکن ہے ابھی تمہاری۔''

''تم کیوں کیا کرتی ہو جبکہ تقریباً ہم عمر ہو میری۔''

''میری بات اور ہے، مجھے کسی کی خاطر سجنا سنورنا ہوتا ہے۔''

''تو مجھے بھی کسی کی فقط اک ستائشی نگاہ کے حصول کے لئے اپنا آپ سنوارنا بھاتا ہے اور جس روز وہ کہے گا کہ میں دنیا کی خوبصورت ترین لڑکی ہوں سمجھو کہ......''

''دری...... محض مفروضوں کی بنیاد پر

خیالات کے محل تعمیر کر لینا درست نہیں۔''

''مگر خواب دیکھنا تو ہر ذی روح کا فرض ہے۔''

''ایسے خواب بھی نہیں دیکھنے چاہئیں جو انسان کو گمراہ کر دیں۔''

''ہر دل خوش کن احساس کا بھیانک ترین روپ دکھا ڈالنے میں ماہر ہو تم۔'' اس نے خفگی سے کہا اور اسے مصروف پا کر سائیڈ ٹیبل پر پڑی کتاب اٹھالی۔

''جانے کیونکر ہضم کر پاتی ہو تم یہ ثقیل قسم کی شاعری، نجمی ڈیئر۔'' اس نے کہتے ہوئے اوراق الٹے تھے۔

باندھ لیں ہاتھ یہ سینے پہ سجا لیں تم کو
جی میں آتا ہے کہ تعویذ بنا لیں تم کو
پھر تمہیں روز سنواریں تمہیں بڑھتا دیکھیں
کیوں نہ آنگن میں چنبیلی سا لگا لیں تم کو
اسقدر ٹوٹ کر تم پہ ہمیں پیار آتا ہے
اپنی بانہوں میں بھریں مار ہی ڈالیں تم کو

کتاب کی پشت پہ وصی شاہ مسکرا رہا تھا وہ کتاب آنکھوں پہ رکھ کر اک اک لفظ اپنے اندر اتار تی رہی۔

☆☆☆

''جانے کون سے جنم کے کرم تھے جن کے عوض اللہ نے نجمی جیسے ہیرے کو میرے مقدر میں لکھا، ماشاءاللہ صورت شکل دیکھ کر ہی بندہ سیر ہو جاتا ہے اور گن ہیرے جیسے، سلیقہ، صفائی پسندی ختم ہے اس پہ، ذمہ دار اتنی کہ کبھی کسی کام کو کہنا ہی نہیں پڑا۔'' چہیتی بیوی کی تعریفوں پر شارق میاں کا دل بلیوں اچھل رہا تھا مگر بظاہر سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے ناشتہ کرتے وہ اماں کا لیکچر سن رہے تھے۔

''اور جانے کون سی بدنصیب گھڑی تھی جو اس بدبخت دریہ کو میں نے جنم دیا، ایک پل سکون کا سانس نہ دیا اس نے، جوڑوں کا درد چین لینے نہیں دیتا مگر جتی رہا کرتی تھی چولہے چوکی میں، اگر کبھی کوئی کام کہہ بھی دو تو ڈھنگ سے نہ کر کے دیتی ہے، اللہ میاں مجھے تو سوچ سوچ کر ہول چڑھتے ہیں اس مردود کا بنے گا کیا۔''

''اماں بلاوجہ کے اندیشے نہ پالیے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' انہیں فی الوقت اماں کی تسلی کی خاطر یہی لفظ مناسب معلوم ہوئے ان کی متلاشی نظریں دور دور تک سفر کر کے لوٹ آئیں تو وہ آفس کی تیاری کی غرض سے اپنے کمرے کا رخ کرنے کے لئے پر تولنے لگے۔

''اللہ کیوں نہ اندیشے پالوں، لاکھ چاہتی ہوں یہ کوئی گن نجمی ہی سے سیکھ لے، بیچاری نے صبح سے مشین لگا رکھی ہے مگر اسے یہ توفیق نہیں کہ ساتھ مل کر بھاوج کا ہاتھ ہی بٹا دے، ابھی دیکھتی ہوں کدھر ہے وہ۔''

''نجمی...... نجمی پلیز یار، مشین میں کپڑے گھوم گھوم کر تھک گئے ہیں اب تو انہیں نظر التفات بخش دو۔'' ادھر دریہ نے بے خیالی میں آلو چھیلتے ہوئے جملہ اچھالا، ادھر اماں کا سنسناتا اور کرارا دو ہتڑ انگارے کی مانند اس کی کمر جھلسا گیا۔

''کمبخت، نامراد، ہزار مرتبہ کہا ہے کہ دلہن کو اس طرح مخاطب نہ کیا کر، بڑی بھاوج ہے وہ تیری، مگر تو ہے ہی بے ہدایت، آئندہ زبان کھینچ لوں گی تیری اگر جو اس طرح بات کرتے ہوئے سن لیا، غضب خدا کا کیسا زمانہ آگیا، رشتوں کی حرمت کا ذرا پاس نہیں اس نسل کو، ہماری بھاوج نے بہشتن اماں کے گزر جانے کے بعد چھاتی سے لگا کر پالا تھا ہمیں، کبھی ہم میں اور اپنی اولاد میں تفریق نہ کی اور ہم بھی آج تک انہیں ماں کا

درجہ دیا کرتے ہیں۔'' اب اماں کے نان سٹاپ مکالموں کو بند باندھنا سہل نہ تھا سو وہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر باہر صحن میں نکل آئی اور واشنگ مشین میں سر جھکائے نجمی نے اسے دیکھ کر دانت نکالیے۔

''اڑا لو میرا مذاق، خوش ہولو جی بھر کے، نیا نیا خمار چڑھا ہے اماں کو، حسین وجمیل بہو کا، کچھ روز گزر جانے دو پھر دیکھوں گی کون کس کا حامی ہے۔'' اسے اپنی عزت افزائی پر نجمی کا ہنسنا ایک آنکھ نہ بھایا۔

''تم بھول رہی ہو دری ڈیئر، میرے رشتے کی خاطر سب سے زیادہ جوتیاں بھی تم ہی نے گھسائی تھیں۔''

''تو ہمارے بھیا کو اپنی من موہنی صورت کی جھلک دکھا کر دیوانہ بنانے کا مشورہ کس نے دیا تھا، ہائے مجھے کیا معلوم تھا عزیز ترین دوست کو بھابھی بنا ڈالنے کا تجربہ اتنا مہنگا پڑے گا۔'' اسے نئے سرے سے اپنی دکھتی کمر کا غم ستایا تو وہ صوفے پہ بیٹھ کر بیک کشن سے کمر سہلانے لگی، گاڑی کا ہارن خاصی بے قراری سے بجایا گیا تو دریہ تمام تکالیف بھول بھال کر سرعت سے اٹھی اور بیڈ شیٹ کھنگالتی نجمی کے ہاتھ تھام لئے۔

''تم جاؤ اپنے میاں کو رخصت کرو، ورنہ وہ یونہی ہارن بجا بجا کر سب کے، کان کھاتے رہیں گے۔''

''خدا تم جیسی نند سب کو دے۔'' نجمی نے بمشکل مسکراہٹ دبائی تھی۔

''مگر تم جیسی بھاوج دشمن کو بھی نہ دے۔'' اس نے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا۔

''جس دن تم بھاوج بن گئیں ناں، اسی روز طبل جنگ بج اٹھے گا اب جاؤ اور اپنی حسین صورت کا دیدار بخش دو انہیں، تاکہ بقیہ دن خوشگوار گزرے۔'' نجمی ہنستی ہوئی چلی گئی تو وہ بھی مسکراتے ہوئے مشین سے کپڑے نکال کر کھنگالنے لگی۔

☆☆☆

''جب وہ بولتا ہے تو دل چاہتا ہے کہ بس وہ بولتا ہی رہے اور ہم صرف سنا کریں، جب وہ مسکراتا ہے تو لگتا ہے آس پاس کئی خوش رنگ پھول کھل اٹھے ہوں جن کی خوشبو سے روح تک سیراب ہوئی جاتی ہے، طبیعت معطر ہو جاتی ہے۔''

''اف دری پلیز یہ اپنا ڈاکٹر نامہ بند کر دو، ورنہ میں اپنا یہ سر کہیں دے ماروں گی۔''

''تم مذاق اڑا رہی ہو میرے جذبوں کا۔'' نہ جانے وہ اس کے تذکرے کے معاملے میں اتنی ٹچی کیوں تھی، ذرا جو نجمی نے لقمہ دیا اور اس نے ہرٹ ہونے کی تیاری کی۔

''او بندی خدا، مجھے تو لگتا ہے تمہارا وہی معاملہ ہے کہ۔''

یا تیرا تذکرہ کرے ہر شخص
یا کوئی ہم سے گفتگو نہ کرے

''ہاں سچ بالکل دل چاہتا ہے ہر بات میں موضوع خواہ کوئی بھی ہو ہر شخص صرف اسی کے بارے میں بات کرے اور یہ وہ تذکرہ ہے جس سے میں کبھی سیر ہو ہی نہیں سکتی۔'' اس نے جذب سے اپنی کشادہ بھوری آنکھیں موند لیں تو نجمی کو اس پر بے طرح پیار آ گیا۔

''محبت کے ہجے تو سیکھ لو پہلے، یہ تم کس طرح کہہ سکتی ہو کہ وہ بھی تم میں اتنا ہی انٹرسٹڈ ہے، بلاوجہ ہی ون وے ٹریفک چلائے جا رہی ہو۔''

''سنو! اس روز مجھے کلینک پہنچنے میں تاخیر ہو گئی تو اس نے بے ساختہ گھڑی دیکھ کر کہا تھا

''آج آپ کو دیر ہو گئی'' کتنے ہی روز تک اس کا جملہ میرے کانوں میں گونجتا رہا، کیا یہ سن کر کوئی بھی یقین نہیں کر سکتا کہ وہ منتظر رہا کرتا ہے، مریضوں کی لمبی قطار میں سے صرف میرا اور میں منتظر ہوں اس روز کی جب وہ یہ بھی کہے گا کہ وہ صرف میرا ہے، صرف میرا۔'' بے نیازی سے یونہی چبا چبا کر چاکلیٹ کھاتی وہ خاصی لاپروا نظر آ رہی تھی۔

''مرد کی محبت صرف سراب ہوا کرتی ہے اور یکطرفہ محبت نری حماقت، وقت کا ضیاع۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ اس سفر میں، میں تنہا ہوں، کبھی تم اس کی نظریں دیکھو، ان کی زبان پڑھنے کی کوشش کرو تو تمہیں ادراک ہو کہ وہ نظریں صرف میرے لئے ہیں ان میں چھپا اک اک پیغام میری روح کو شانت کر دیا کرتا ہے، مجھے دیکھ کر اس کے ہاتھوں میں جیسے بجلی بھر جاتی ہے وہ جس اکتاہٹ اور تیزی سے مریض بھگتاتا ہے تم دیکھو تو میری مانند ہی چھکو، بعض اوقات تو بیماری کا حال مریض کے منہ میں ہی ہوا کرتا ہے اور وہ نسخہ لکھ کر ہاتھ میں بھی پکڑا دیتا ہے۔'' بقول اس کے صرف میری چند میٹھی میٹھی باتیں سننے کے لئے۔

''سنا تھا کہ محبت خوش فہم ہوا کرتی ہے اور آج دیکھ بھی لیا۔'' نجمی نے بے نیازی سے کہتے ہوئے سائیڈ ٹیبل پر رکھا فریم اٹھایا جس پر سندھی کڑھائی کے چند بوٹے جگمگا رہے تھے۔

''سنو نجمی سارے کام ادھورے چھوڑ دو صرف مجھے سنو، اس کے تذکرے اس کی باتیں اور لگاوٹوں کے قصے۔'' دریہ نے اس کے ہاتھوں سے فریم لے کر واپس رکھ دیا۔

''اتنا ڈھیر سارا وقت باتوں میں برباد کرنے کی بجائے کسی کام میں صرف کر لو تو تمہارا فائدہ ہے سراسر۔''

''میں نے کہیں پڑھا تھا، جو لمحہ کسی کی یاد میں گزر جائے ضائع نہیں ہوا کرتا۔''

''وہاٹ، تم نے پھر میری کتابوں کو ہاتھ لگایا۔''

''جی ہاں آپ کے وصی شاہ کی کتاب میں اپنے شاہ جی کو گفٹ کر چکی ہوں۔''

''دری آئی ول کل یو۔'' وہ اس پر جھپٹ دوڑی مگر وہ دریہ تھی اسے قابو کرنا اتنا آسان نہ تھا۔

''تم ہی تو کہتی تھیں، شاعری جذبات کی ترجمانی کا سہل ترین ذریعہ ہے۔'' اس کی دسترس سے دور جا کر دریہ کہہ رہی تھی۔

''کتنا سینت سنبھال کر رکھا تھا، اک خراش تک نہ تھی اس کتاب پر۔'' نجمی کا قلق مدھم پڑ کر نہ دے رہا تھا، مزید اپنی بے خبری کا تاسف۔

''جبھی تو وہ گفٹ میں دینے کے لئے موزوں ترین ٹھہری، مجھے لگا اسی مصرف کی خاطر اتنے عرصے سے یہ کتاب سنبھال کر رکھی گئی تھی۔''

وہ مزے سے کارنس پہ چڑھی پیر ہلا رہی تھی۔

''ایک بار ملواؤ تو سہی، کامران شاہ جیلانی ہے، میں بھی تو دیکھو کیا شئے ہیں وہ۔'' نجمی نے بڑی دیر بعد تاسف سے جھکا سر اٹھایا تھا۔

''تم ایسی حسین صورت کو اس کے سامنے لے جانے کا رسک میں تو نہیں لے سکتی، جانے میں اس کے معاملے میں اتنی کچی کیوں ہوں، یا پھر پوزسیو کہہ لو۔''

''جی ہاں، آپ کو تو وہ ہوائیں بھی بری لگتی ہوں گی جو شاہ جی کو چھو کر گزریں۔'' نجمی کی جان جل کر رہ گئی۔

''نہیں ان ہواؤں کو تو اپنے اندر اتار لینے کو دل کرتا ہے۔'' دریہ نے اک گہری سانس لے کر

آنکھیں موندلیں تو نجمی نے اسے کشن دے مارا۔

''اماں نے مجھے ذمہ داری بخشی ہے، اپنا ہنر تھوڑا بہت تم میں انڈیل ڈالنے کو سو تم یہ سندھی کڑھائی کا پھول بنانا سیکھو۔''

''اماں جانے کس جہان میں رہتی ہیں، دنیا چاند پر پہنچ گئی اور وہ مجھے سندھی کڑھائی سکھانے کے درپے ہیں، سیکھ لوں گی بابا، ذرا وقت آنے دو۔''

''کیوں شادی کی تاریخ مقرر کیے جانے کے بعد سوئی پکڑنا اور روٹی گول کرنا سیکھو گی۔''

''بالکل ابھی تو دلی دور ہے، معاملہ ابتدائی مراحل میں ہے، وہ کہتا ہے اپنے اور میرے تعلق کو اک باضابطہ شکل دے دو، دوستی کی شکل۔'' وہ خاصے عام سے لہجے میں فریم گھماتے ہوئے کہہ گئی۔

''وہاٹ دماغ درست ہے تمہارا، دری ڈیئر مرد و عورت کی دوستی کا ہمارے معاشرے میں جو تصور ہے وہ خاصا شرمناک ہے۔''

''یہ صرف ذہنوں کی پراگندگی ہوتی ہے جو وہ دوسروں کے معاملات پر تھوپ کر انہیں پراگندہ کیا کرتے ہیں۔''

''تو کیا تم ہامی بھر چکی ہو اس کی۔'' نجمی کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔

''نہ صرف ہامی بھری بلکہ اس کی آفر کو دل و جان سے قبول بھی کر لیا ہے میں نے، محترمہ فرسٹ سٹیپ ہے یہ۔''

''دری...... دری تم جانتی ہو یہ آگ پانی کا کھیل ہے، تم جھلس بھی سکتی ہو اور......''

''تم آخر ہر بات کا منفی پہلو کیوں کھوجا کرتی ہو، اگر مثبت پہلوؤں پر غور کیا جائے تو کوئی شئے بری نہیں ہوا کرتی، صرف بندے کی سوچ ستھری ہونی چاہیے۔''

''دری جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ تم نقصان اٹھاؤ گی۔''

''یہ محض تمہارے اندیشے ہیں ورنہ وہ اک نائیس بندہ ہے، ورنہ یہ عرصہ کم نہیں ہوا کرتا کسی کی بدنیتی کو سامنے لانے کے لیے اور نجمی ڈیئر اگر وہ غاصب ہو، یا پیشے کی آڑ ہی میں سہی معمولی سی بددیانتی کا بھی مرتکب ہوتا تو میں اس کے منہ پر تھوکنا بھی پسند نہ کرتی کہ بہرحال اپنی حرمت مجھے بھی پیاری ہے، مگر میرے جذبوں میں کوئی کھوٹ نہیں اور اس کا بے ریا خلوص اگر مجھے اس کے ساتھ کا خواہاں بنا بیٹھا ہے تو یہ آرزو اتنی نامناسب بھی نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ ٹھوس تھا نجمی کی آواز پست ہو کر رہ گئی۔

''میں نہیں چاہتی کہ تم غلط رستے کا انتخاب کرو۔''

''تم ایک بار اس سے مل لو تو تمہارے تمام اندیشے ختم ہو جائیں گے، نجمی میں اتنی بھی نادان نہیں ہوں، بس یوں سمجھ لو کہ میں فقط منتظر ہوں۔''

''صاف نیت رکھنے والے کبھی چور راستے نہیں اپنایا کرتے۔'' نجمی نہ چاہتے ہوئے بھی کہہ گئی اور صاف ظاہر تھا کہ دریہ کو برا لگا مگر بات بہرحال راست تھی، سو وہ خاموش ہی رہی۔

☆☆☆

نہ جانے اماں کو اسے سگھڑ بنا ڈالنے کی کیسی دھن سوار تھی اور اس کا ہر امتحان میں فیل ہو جانا اماں کے غصے کو شہہ دیا کرتا ان کا بس نہ چلا کرتا کہ تمام سلیقے طریقے اسے گھول کر پلا دیں اپنے اندیشوں کے راست نہ ہونے کی وہ دل سے دعا گو رہا کرتیں، ان کی بھاگ دوڑ اور تفکرات کے نتیجے میں جس قسم کے رشتے آئے وہ اماں کی طبیعت مکدر کر گئے، اکلوتی نازوں پلی بچی کے مزاج اور نخروں سے واقف تھیں اور وہ خود بھی

کہاں چاہتی تھیں لاکھوں میں ایک لڑکی کو کسی ایسے ویسے، کہ سے بیاہنے کا خیال بھی نہ دل میں لاسکتی تھیں اس کی غیر ذمہ داری و لاپروائی ہوا بن کر ان کے سر پر سوار رہا کرتی۔

اماں کی دور پار کی چچیری میری بہن رستہ بھول کر ادھر آنکلیں اور دریہ پر جو نظریں ٹکیں تو جانو کہ پلٹنا ہی بھول گئیں۔

''بس ایک ہی بیٹی ہے میری، انٹر کیا ہے پچھلے سال اس نے۔'' دریہ کے وجود سے ان کی چپکی نظریں ہٹانے کی خاطر انہوں نے اپنی جانب متوجو کیا تھا۔

''اور ایک ہی بیٹا ہے بڑا، جس کے فرض سے سبکدوش کیا اللہ نے، دلہن بھی ماشاء اللہ لاکھوں میں ایک ہے، ان دنوں میکے میں قیام ہے، خیر سے خوشخبری متوقع ہے، جی گھبراتا ہے ان دنوں یوں بھی، بیٹا کسی آفس کے کام سے اسلام آباد گیا تو جانے سے قبل اسے میکے چھوڑتا گیا۔''

''ماشاء اللہ...... ماشاء اللہ...... آپا کہیں بات چیت وغیرہ تو طے نہیں بچی کی۔'' ان کا رویہ ولہجہ کسی خوش آئند مرحلے کا غماز تھا ان کی سوئی مستقل دریہ میں اٹکی تھی۔

''نہیں ابھی تو نہیں، ابھی عمر ہی کیا ہے بچی کی، ابھی تو دور دور تک ارادہ نہیں اگر چہ کئی رشتے آ چکے ہیں۔'' اماں بھی گنوں کی پوری تھیں اتنی آسانی سے کیسے رضا مند ہوتیں لہٰذا ان کی آتش شوق کو بھڑکا گئیں وہ بے قرار ہو اٹھیں اور دریہ کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد جانے کون سی میٹھی میٹھی سرگوشیاں اماں کی سماعتوں میں گھولیں کہ جوش مسرت سے اماں کا چہرہ تمتما اٹھا، سونے پہ سہاگہ کہ نجمی کی غیر موجودگی میں دریہ نے جوان کی مدارات کا بیڑہ چاروناچار ہی سہی اٹھایا تو

سوئے اتفاق کوئی کام نہ بگڑا، وہ خاصے امید افزاء تاثرات لے کر پلٹی تھیں اماں کی امیدوں کا جہاں آباد ہو گیا دریہ سے اچانک ہی غیر معمولی طور پہ نرم رویہ اپنانے پہ مجبور ہو گئیں اور یہ خوشی شیئر کرنے کو نجمی کو بھی بلا بھیجا، جوان کے بلاوے پہ لپکی چلی آئی تھی، مگر جانے وہ ان جیسی خوشی کا بھرپور اظہار نہ کر سکی، دوپرے کی ساس کے اکلوتے بیٹے کی قابلیت و شرافت کے قصے سن کر بھی لبوں کا قفل نہ توڑ سکی۔

☆☆☆

''ارے یہ کون سا طریقہ ہے اداسیاں منانے کا۔'' دریہ نے کمرے میں آکر لائٹ آن کی تو نجمی نے بے ساختہ بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

''دری پلیز لائٹ آف کر دو، آنکھوں میں چبھن ہوتی ہے۔''

''یوں کہو کہ آنکھوں میں جھلملاتے ان موتیوں کا بھرم رکھنا ناگزیر ہے۔'' دریہ نے نجمی کی تھوڑی اٹھائی تو چند قطرے اس کی مکھن ایسے گالوں پہ لڑھک آئے۔

''ارے یہ بلیک میلنگ نہیں چلنے گی، مائی ڈیئر وہ آفس کے کام سے چند روز کے لئے گئے سالوں کا بن باس کاٹنے کے ارادے سے نہیں۔''

''تم کیا جانو تنہائی کتنی اذیت ناک ہوا کرتی ہے دری ڈیئر۔''

''تو پھر آپ کیوں اس تنہائی کو سیلی بریٹ کرنے کے لئے اندھیرے کمرے میں بند پڑی ہیں۔''

''کبھی کبھی یونہی اندھیرا کر کے خاموشی سے اپنی اداسیاں منانے کو دل کرتا ہے۔''

''دل کے کہے کو ٹال دیا کرو، دل کبھی کبھی بڑے غلط مشورے بھی دیا کرتا ہے۔'' وہ شرارت سے مسکرائی۔

''میرا دل تمہارے دل کی مانند نادان نہیں ہے۔''

''تو ایسا کون سا دانائی کا کام کر ڈالا ہے آج تک آپ نے، چکنی چپڑی سے ساس اور میاں کا دل مٹھی میں کرنے کے علاوہ۔'' وہ بولی۔

''تو تم نے کیوں نہ اب تک تیر چلا لئے۔''

''تم جانتی ہو میرا دل مستعار چلا گیا ہے اور جس کے پاس ہے اس کا لوٹانے کا کوئی ارادہ بھی نہیں اور تم یونہی تو من کی بوتھی لٹکائے بیٹھی رہیں تو منہ لمبا ہو جائے گا، بھیا ائیر پورٹ سے ہی اگلا جہاز پکڑیں گے واپسی کے لئے۔''

''منہ اچھا نہیں تو بات ہی اچھی کر لیا کرو۔'' نجمی نے اسے گھورا اور بری طرح مائنڈ کیا۔

''اس شکل کی یہ خوبی کیا کم ہے کہ اسے شرف پسندیدگی بخشا گیا ہے۔''

''ہاں یہ منہ اور مسور کی دال۔'' عادت کے مطابق پل بھر میں نجمی کا موڈ بدل گیا۔

''اور اسی منہ کی بدولت ہی آج فرمایا گیا ہے کہ میں اسے اچھی لگتی ہوں، تم یہاں ہجر و فراق کے ہنڈولوں میں جھول رہی ہو، بجائے اس کے کہ میرے ساتھ......''

''کیا کروں بھنگڑا ڈالوں اور اس ''اچھا لگنے'' کے لئے تم کتنے جتن کیا کرتی تھیں مجھے معلوم ہے اور اچھا لگنے کا مطلب صرف ''اچھا'' لگنا بھی ہو سکتا ہے، فار یو کائنڈ انفارمیشن۔''

''تم ہمیشہ یونہی میری خوشیوں کو غارت کیا کرو، تمہارا خیال ہے مجھ میں اچھا لگنے والی کوئی بات نہیں، یا وہ مجھے بیوقوف بنا رہا ہے۔''

''میری چندا، محض مفروضوں کی بنیاد پر خوابوں کے محل تعمیر کر لینا خود اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے تم یہ بات کب سمجھو گی۔''

''تمہارا کیا خیال ہے اس کا بطور خاص میری ذات کو اہمیت دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔''

''میرے نزدیک صرف اتنا کہ تم صنف مخالف ہو جو کہ بہر حال اک خاص کشش کا حامل ہوا کرتی ہے۔''

''اور یہی کوشش پسندیدگی کا پیراہن اوڑھ کر معنی بھی تو بدل جایا کرتی ہے۔''

''بالکل مجھے اس سے انکار نہیں، مگر یہ یقین بھی ہمراہ ہونا چاہیے کہ محبتوں کے سفر میں ہم تنہا نہیں ہیں۔''

''تم ہمیشہ ہولناک باتیں کر کے میرا دل توڑ دیا کرتی ہو۔''

''اسی لئے کہا جاتا ہے کہ سچائی تلخ ہوا کرتی ہے۔''

''اس کا مصنوعی و امتیازی رویہ اس امر کا غماز ہے کہ وہ بھی مجھے پسند کرتا ہے۔''

''مگر اس کی پسندیدگی کی اختتامی حد کیا ہے، کبھی یہ بھی جاننے کی کوشش کرو، تمہارا ہمیشہ بیمار رہنے کے لئے دوائیں ضائع کرنا انتہا پسندی ہے، گلے کی انفیکشن عموماً اتنا وقت نہیں لیا کرتی، مگر کیا تمہیں محسوس نہیں ہوتا کہ تم اپنے ہمراہ اپنے گھر والوں کو بھی دھوکہ دے رہی ہو۔''

''میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ میرے جذبے راست ہیں، وہ کہتا ہے میں اک مکمل لڑکی ہوں اور خوبصورتی اس کی کمزوری ہے کیا یہ مان کافی نہیں ہے میری تسلی کے لئے جس کا خیال اک پل کو مجھ سے جدا نہیں ہوتا، مقابل کے دل میں ہمارے لئے رتی بھر ہی جگہ تو ہے، ٹھکرائے جانے کا اذیت تو میرے ساتھ نہیں میرے غرور کو اتنا ہی کافی ہے۔''

''تم پاگل ہوئی ہو دریہ، جانتی ہو اماں کیا سوچ رہی ہیں۔'' نجمی کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔

''جانتی ہوں اور ان کی سوچ سے میرا متفق

ہونا لازمی نہیں۔" اس کے لہجے سے سرکشی ہویدا تھی اور نجمی جان سکتی تھی کہ ایسے میں اس پر دباؤ ڈالنا اسے مزید بھڑکا سکتا ہے سوائے رام کرنے کی سعی کرنے لگی اور وہ آمادہ ہو ہی گئی مگر اس حد تک نہیں کہ نجمی کوئی اچھی امید وابستہ کر سکے۔

☆☆☆

"تم سے ہزار مرتبہ کہا ہے کہ یہ لمبی لمبی پروسیجرز والی ڈشز کم از کم میرے بس سے باہر ہیں، اماں کو تو بس خواہ مخواہ کا شوق ہے مجھے چولہے میں جوتنے کا۔" وہ مزے سے سنگی تختے کے سامنے کھڑی سلاد بنانے سے زیادہ کھا رہی تھی اور نجمی کبھی توے پہ تلتے کبابوں سے نبرد آزما کبھی یخنی کی فکر میں ہلکان۔

"اگر تم اسی رفتار سے مولیاں، چقندر چرتی رہیں تو مجھے مہمانوں کے سامنے چھلکے سجا کر پیش کرنے پڑیں گے نتیجتاً تمہارا ہی نقصان ہوگا۔"

"اسی نقصان میں میری رضا پنہاں ہے یہ تم خوب سمجھتی ہو۔" اس نے لاپروائی سے سلاد کا پتہ چبایا۔

"دری تمہیں نہیں لگتا کہ تم سراب کے پیچھے دوڑ رہی ہو۔"

"آج تمہیں بتانا ہی پڑے گا کہ تمام خوفناک و ہولناک تشبیہات تمہیں میرے معاملے ہی میں کیوں راست نظر آیا کرتی ہیں جیسے محبت کر کے میں نے کسی بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔"

"دری تم سچ مچ بے حد خوش فہم ہو اور مجھے ڈر ہے کہ......"

"پلیز مزید کوئی خوفناک بات نہ کرنا، میں نے تمہارے اصرار پر کپڑے بھی بدل لئے میک اپ بھی کر لیا اور تمہارے کہنے کے مطابق سگھڑ پن و خوش اخلاقی کے ریکارڈ بھی توڑنے کی کوشش کروں گی اور تم بھی اپنا وعدہ نہ بھولنا، ہر حال میں میرا ساتھ دینے والا۔"

"دلہن بریانی دم دے دی۔" حسب عادت اماں کو تشویش نے آ گھیرا تو انہوں نے کچن میں جھانکی ماری۔

"اماں وقت تو دیکھیں آپ، شام کے چھ بجے ہیں اور آپ بریانی دم دینے کی بات کرتی ہیں۔" دریہ جھلا گئی۔

"اے لڑکی ہزار مرتبہ کہا ہے کہ اس لہجے میں بات نہ کیا کر، زبان گدی سے کھینچ لوں گی ہاں، نجمی ہی سے کچھ سیکھ لے باتیں کرتی ہے تو پھول جھڑتے ہیں منہ سے، ماشاء اللہ خوش گفتار، خوش اخلاق، سگھڑ، سلیقہ مند، مجال ہے جو ایک گر بھی بھولے سے سکھ کر دیا ہو تو نے۔" موضوع کوئی بھی ہو اماں کو نجمی کی تعریف کا موقع درکار ہوا کرتا، بساط بھر چند سخت سست دریہ کو سنا کر وہ لوٹ گئیں تو نجمی کو دانت نکالتے دیکھ کر وہ جھلا گئی۔

"سیروں کے حساب سے خون بڑھ گیا ہوگا تمہارا تعریفیں سن سن کر اور اماں ہمیشہ یہ بات بھول جایا کرتی ہیں کہ تمہیں بھائی کے لئے منتخب کرنے کی اولین رائے میری ہی تھی۔"

"اسی احسان کی وجہ سے تو سر نہیں اٹھا پاتی تمہارے سامنے، ورنہ میری تو عمر نکلی جا رہی تھی۔" نجمی کھی کھی کرنے لگی تو اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ رینگ آئی۔

"اب اپنے شاہ جی کو کہو کہ معاملات تمہارے بس سے باہر جا رہے ہیں اگر وہ مخلص ہیں تو دست سوال دراز کریں۔"

"کیا یہ کہنا اتنا ہی آسان ہے۔" دریہ اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

"کیوں تمہیں تو ان کے جذبوں کے

راست ہونے پر پختہ یقین ہے اور پھر وعدے کے مطابق تمہاری خاطر جدوجہد کرنے کا مرحلہ تو اگلا ہوگا ناں۔'' جانے بات دریہ کی ناقص عقل میں سمائی کہ نہیں تاہم من بھر کا سر ضرور ہلا دیا۔

☆☆☆

''اماں جی خواہ مخواہ میں ہولتی ہیں آپ، ابھی اپنی دریہ کی عمر ہی کیا ہے، فقط دو سال ہی تو ہوئے ہیں انٹر کیے ہوئے، ایک تو بلاوجہ آپ نے کالج چھڑوا دیا گھرداری میں جھونکنے کے لئے، بی اے کر چکی ہوتی اب تک۔'' شارق میاں خاصے جھلائے ہوئے تھے، لگتا تھا یہ اس کی حمایت میں نجمی کا پہلا قدم تھا، اسے بے اختیار نجمی پر پیار آ گیا، مگر اماں کے تو تلوؤں سے لگی سر پر بجھی۔

''اے میاں ہوش کے ناخن لو، ایسی بھی پالنے میں نہیں جھول رہی اپنی دریہ، لڑکیوں کی یہی مناسب عمر ہوا کرتی ہے شادی کی، خدا نخواستہ زائد عمر گزر گئی تو ایسا بر بھی ملنا مشکل اور پڑھائی کی بھی خوب کہی تم نے، کون سے لیاقت و قابلیت کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے اس کمبخت نے، ایسے نمبر لاتی تھی کہ کسی کو بتاتے ہوئے بھی شرماتی تھی میں، کالج میں سیکھا کیا اس نے، بال کٹوانا، ناخن بڑھانا جس کے سبب ہر کام سے فراغت نصیب ہو، بچوں کی مانند اچھل کود کروالو، آنگن میں پڑے جھولے پہ پینگیں لیتی رہے گی، یا پھر کیبل کے اللہ مارے واہیات چینل دکھوالو، اس سے فرصت ملے تو گھنٹہ بھر فون سے چپکے رہنا اور اسے بگاڑنے میں نجمی کا بہت بڑا ہاتھ ہے، سونے پہ سہاگا والی بات ہے۔'' حسین وجمیل بیوی کے وارفتہ بھیا پہلو بدل کر رہ گئے، دریہ نے بمشکل ہنسی ضبط کی۔

''اور ایسی ننھی بچی بھی نہیں ہے کالج چھڑوایا تھا کہ گھر کے کام کاج سیکھ لے گی، مگر نجمی نے اس کے ناز اٹھا اٹھا کر جو تھوڑی بہت کام کی عادت تھی وہ بھی چھڑوا دی، نام نہاد نگوڑی بیماری کو ہوا بنا رکھا ہے، اللہ حلق کا ایسا کیا مرض، غدود پھولے ہوئے ہیں ڈاکٹروں نے آپریشن تجویز کیا تو یہ سدا کی ڈرپوک بھاگ نکلیں، اب معلوم ہو رہا ہے کتنے پیسے خرچ ہوا کرتے ہیں میرے اس کے علاج کے چکر میں، مگر اس نامراد کو ذرا پروا نہیں، نہ کبھی ڈھنگ سے دوا کھاتے دیکھا اور پرہیز کا تو چند سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، کھٹی کیریوں کے چاؤ نے تو یہ دن دکھایا ہے۔''

''تو اماں جی اس کے صحت مند ہونے کا ہی انتظار کریں۔'' اماں کی عادت تھی بات کھینچ کر کہیں کی کہیں لے جایا کرتی اور دریہ سے تو وہ یوں بھی عاجز رہا کرتیں۔

''جب آپ کو من مانی ہی مقصود ہے تو مجھ سے بھی مشورہ طلب نہ کیا کریں۔''

''اے میاں تم باتیں ہی بچوں والی کیا کرتے ہو اور یہ عمر والی بات تو خوب ہی کہی، اسی کی سہیلی اور ہم عمر اپنی نجمی، ماشاء اللہ خیر سے اب ماں بن جائے گی اور سارا گھر سنبھال رکھا ہے میرا، پلنگ پر بٹھا دیا مجھے، اللہ اسے چاند سا بیٹا دے اور اس نامراد نے کبھی ڈھنگ سے کوئی کام نہ کر کے دیا۔''

''یہی تو میں کہتا ہوں کہ اسے ذرا ذمہ دار باشعور ہو لینے دیجئے۔'' انہوں نے لولی لنگڑی سی توجیہہ پیش کرنی چاہی محرک صرف بیوی سے کیے گئے وعدے کا بھرم رکھنا تھا ورنہ اماں کی ضد سے خوب واقف تھے اور ان کی خواہش بے جا تھی نہ توجیہات بے وجہ۔

''تم کچھ بھی کہتے رہو مگر اب میں کسی کی سننے والی نہیں ہوں ہاں، یونہی اس کے بچپنے کے

سبب میں معقول رشتے ٹھکراتی رہی تو ایک روز سر پہ ہاتھ رکھ کر روتی نظر آؤں گی۔'' شارق میاں نے بیچارگی سے کھڑکی کی اوٹ سے چھپ دکھاتی بیوی کو دیکھا جس کی خواہش کا کوئی سر پیر نہ پاتے ہوئے بھی وہ تعمیل پر مجبور تھے، نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کے مصداق عجب کشمکش میں گرفتار غصے تمام عذر، عذر لنگ ثابت ہو رہے تھے اور نجمی کی ایسی معاملے میں اس حد تک دلچسپی حد سے زیادہ تھی اور ان دونوں کی محبت ایسی مثالی تھی کہ دل میں کوئی ایسا ویسا خیال بھی نہ لا سکتے تھے اور ان کا خیال نہ تھا کہ وہ زیادہ دیر اس محاذ پر ڈٹے رہیں گے، اماں کی تمام تو جیہات راست تھیں اور عزائم خطرناک۔

☆☆☆

''اور محبتوں میں سود زیاں کا حساب کون رکھتا ہے نجمی ڈیئر، عقل احساسات انا سب ہی کچھ تو ہم مقابل کے قدموں میں رکھ دیا کرتے ہیں، ہمارے پاس بچتے ہیں تو صرف جذبات، جو ہمیں اندھا گونگا بہرا بنا ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے انہی جذبات کے عوض ممکن تھا کہ میں اپنا پندار اس کے قدموں میں رکھ دیتی اسے پا لینے کی خاطر ہر صورت اسے منا لیتی، مگر میں بھول گئی تھی کہ بظاہر خوش اطوار، ویل ڈریسڈ نظر آنے والے انسانوں میں بھی کچھ خامیاں ضرور ہوا کرتی ہیں ہم جنہیں اپنے آئیڈیل کے خانے میں فٹ کر کے دیکھتے ہیں ان کی شخصیت کے کچھ منفی پہلو بھی ضرور ہوا کرتے ہیں مگر محبت تو محبوب کو کل تصور کیا کرتی ہے ہر خامی سے مبرا۔

''میں نے پل پل گن کر اس روز کا انتظار کیا تھا جس پل اپنی تمام عزت نفس کو بالطاق رکھ کر میں اس سے اسی کو مانگ لینے کا فیصلہ کیا تھا، مگر کبھی کبھی صرف ایک لمحہ ہی ہمیں بچا لیا کرتا ہے، ہماری ساری زندگی کا دھارا پلٹ کر رکھ دیا کرتا ہے اس روز اس نے اک عام سی بات کی، جو اس کے لئے عام ہی رہی ہو گی، مگر مجھے فیصلہ کرنے کا ہنر بخش گئی، نجمی ڈیئر اس نے کہا کہ خوبصورت لڑکیوں سے دوستی کرنا اس کی ہابی ہے؟ سنا تم نے میں جو اسے جیون دان کرنے چلی تھی اس کے لئے فقط ہابی تھی، وقت گزارنے کا مشغلہ، تو کیا اس سے بڑھ کر بھی کسی کے جذبات کی بے حرمتی ہو سکتی ہے، تو کیا وہ سب کو اسی طرح تعریفیں کر کے چند انسیت بھرے الفاظ بدل، بدل کر چاہت کی انتہاؤں تک پہنچا دیا کرتا ہو گا؟'' دری اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی اور نجمی سوچنے لگی کہ کیا اتنی ہی آسان ہوا کرتا ہے لڑکیوں کو گمراہ کرنا فقط چند انسیت بھرے بول اور تعریف کے چند جملے، جن کے عوض لڑکی اپنی عزت نفس بھی کسی کے قدموں میں رکھنے پر تیار رہا کرتی ہے، کیا اتنی ہی تاثیر ہوا کرتی مرد کے چند لچھے دار جملوں میں، یا پھر لڑکیاں ہی اتنی ارزاں ہوا کرتی ہیں محض چند عناصر کی بناء پر بے وقوف بن جانے والی، صد شکر کہ دریہ کے پاس بہترین آپشن موجود تھا، مگر آپشن ہر کسی کے پاس کب ہوا کرتا ہے، دریہ چھکوں پھکوں رو رہی تھی اور اس کے آنسوؤں سے نجمی کا اپنا دل پگھلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

الجھا الجھا

سدرۃ المنتہیٰ

بائیسویں قسط کا خلاصہ

علی گوہر عمارہ سے سچ اگلوالیتا ہے اصل بات جان کر، وہ نڈھال ہے مگر بدلا ہوا بھی۔
امرت کو اپنے نکاح کا پتہ چلتا ہے، وہ چوری گھر سے نکل آنے میں کامیاب ہو جاتی ہے، گھر پہنچ کر عمارہ کی رائے ہے کہ اسے لاھوت سے نکاح کر لینا چاہیے تھا۔
لاھوت کاغذات کی فائل لے کر فنکار کے گھر جاتا ہے مگر تعارف نہیں کرایا تا اپنا۔
واپسی پر وہ فائل پڑھتے ہیں اور ان کے ساتھ نواز بھی حیران ہے، صدمے میں۔
لاھوت امرت کو وضاحت دینے آتا ہے۔
فنکار ایک عرصے بعد بھائی کی موت پر اپنے گاؤں جاتا ہے۔
امرت جاب کے سلسلے میں کئی جگہ انٹرویو دینے جاتی ہے۔
ھالار امرکلہ سے ملنے ایک عجیب علاقے تک آنکلا ہے اور اس نے امرکلہ کو شادی کے لئے پرپوز کر دیا، وہ شدید حیرت کی زد میں آجاتی ہے۔

اب آپ آگے پڑھیے

تیئسویں قسط
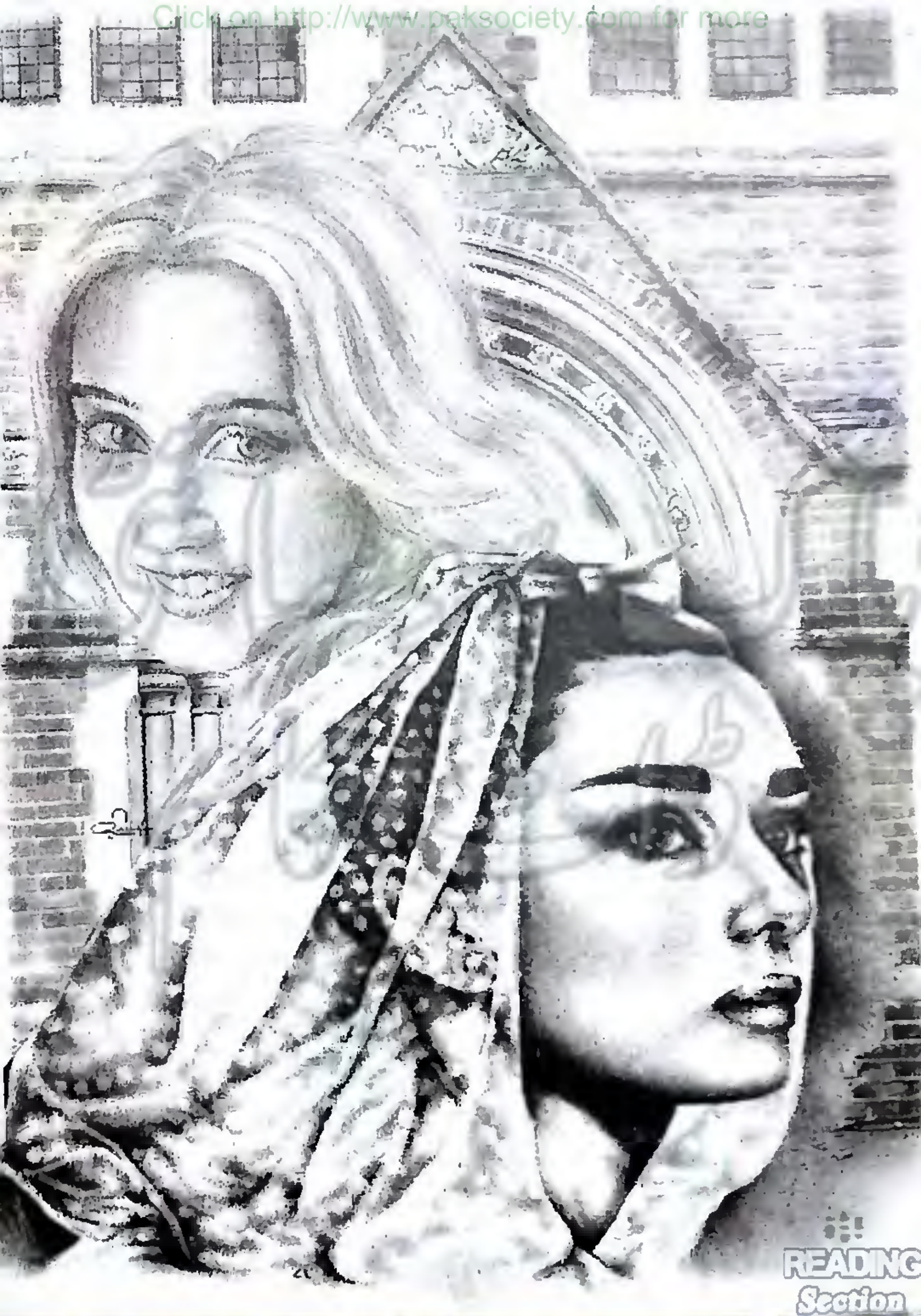
''تم اپنے آخری سوال کے لیے لیے کہاں کہاں پھرتی رہو گی، مجھے پتہ ہے بہت زیادہ سفر نہیں کر سکتی، تم تاش کے پتے کھیل رہی ہو کیا لڑکی؟'' خاتون خاصی چڑی ہوئیں لگ رہی تھیں۔

''ایک تو وہ لڑکا بہت سرکھا گیا ہے، پکا گمراہ بن گیا ہے۔''

''آپ لوگ تلاش میں نکلے ہوئے مسافر کو گمراہ کیوں کہتے ہیں آخر۔'' امرت کو اختلاف تھا۔

''جو راہ سے بے راہ ہوا سے گمراہ ہی کہتے ہیں۔'' خاتون کے چہرے پر سختی زیادہ تھی، امرت بہت تلخ ہو گئی اندر سے، کڑوی گولی۔

''تمہیں کیا چاہیے ہم سے، یہاں کیوں آئی ہو آخر؟۔''

''آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں آخر؟ کس لیے؟ اور کس کی اجازت سے؟'' امرا کو خود پتہ تھا کہ یہ سوال اسے نہیں کرنا چاہیے تھا، وہ خاتون ہنسنے لگی۔

''میرے ساتھ مذاق زیادہ دیر نہیں چلتا لڑکی، مجھ کو غصہ نہ آ جائے۔'' وہ خود کو کسی حد تک نارمل رکھ رہی تھیں۔

''تمہیں کیا چاہیے؟'' ایک عورت ڈری سہمی کوٹھی کے اندر آ گئی تھی، یہ چھوٹی سی فقیر کی چلہ گاہ تھی۔

''صوفی کے مزار پہ دعا لینے کا یہ کون سا طریقہ ہے بچی؟'' عورت کو ڈر تھا کہ بڑی بی کہیں خفا نہ ہو جائیں، اگر ہو گئیں تو بات مشکل ہو جائے گی۔

''اسے اپنے باپ کے لئے دعا چاہیے شاید۔'' عورت ماحول کو ذرا نرم بنانا چاہتی تھی۔

''نہیں مجھے ان سے کیوں دعا چاہیے ہو گی؟'' امرت کو تو چڑ تھی۔

''میں نے کہا بھی نہیں کہ تم مجھ گنہگار سے دعا لینے آؤ۔'' خاتون غصے میں آ گئیں تھیں، پیچھے بوا اماں آ گئیں ورنہ یقینی شامت تھی۔

''امرت تم یہاں کیوں آئی ہو؟'' بوا اماں کو اعتراض تھا۔

''آپ نے مجھے اپنے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔'' اسے اب بوا اماں سے بھی شکایت تھی۔

(امرت الو کی پٹھی تم پاگل ہو گئی ہو کیا؟) وہ کہنا ہی چاہ رہی تھیں۔

''ہماری مہمان کے ساتھ غلط سلوک کرنے کی تمہیں کس نے اجازت دی ہے؟'' خاتون کے چہرے کے تاثر دیکھتے ہوئے بوا اماں نے مزید امرت کو جھڑکا تھا۔

''آپ کی مہمان خاتون کو میرے ساتھ غلط کرنے کی اجازت کس نے دی۔'' عورت نے امرت کو ٹوکا آنکھوں ہی آنکھوں میں۔

عورت کا نام زہرہ تھا، درمیانی عمر اور درمیانی قد کاٹھ کی یہ سانولی اور تیکھے نقوش والی خاتون بہت بالحاظ بھی تھیں اور بامروت تھی۔

جو بڑی بی بی کی خادمہ کے طور پہ ساتھ ساتھ ہوتی تھیں، بڑی بی بی بوا اماں کی بچپن کی سہیلی تھیں، شادی کے بعد اولاد نہ ہوئی، علیحدگی کے بعد ان کا پورا رخ پلٹ گیا، ایک دفعہ فیض مانگا چھ دن بڑے سائیں کے مزار پہ اکیلے رہیں تھیں اور اس کے بعد اب حاضری کا حکم ہوا تھا اور پہلے ہی دن لاہوت برس پڑا تھا۔

''کہ لوگ بندوں سے دعا مانگتے ہیں، وسیلے لیتے ہیں، لوگ شرک میں مبتلا ہو گئے ہیں۔'' وہ لوگوں کی اصلاح کرنا چاہ رہا تھا، چیختا تھا تو باغی کہلاتا تا اثر کوئی نہ ہوتا تھا، مگر اب کی بار اس نے بہت کچھ بدل دینے کی ٹھان لی تھی۔

''تمہارے بچے گمراہ ہو چکے ہیں بی بی؟'' خاتون نے بوا اماں سے شکوہ کیا۔

''لو۔'' امرت ہنسی۔

بوا اماں نے اسے جانے کا اشارہ کیا، امرت نے کھڑے رہنا بھی فضول ہی جانا۔

''سنو جاتے ہوئے ہنستی ہوئی جانا، تمہارے چوتھے سوال کا جواب اللہ کے پاس ہے، تیسری کا میں دے دیتی ہوں، نکتہ گہرائی چاہتا ہے، تمہیں جز اور قل کے فلسفے کا نہیں پتہ؟'' امرت پلٹی تھی۔

''کیا اس کے لئے ایک بار پھر نئے سرے سے کوئی بساط بچھائی گئی تھی۔'' اس کے ذہن میں چھٹا معصومانہ سوال ابھرا تھا۔

☆☆☆

''تمہیں حیرت ہوئی، یہ سن کر۔'' وہ بچوں کی طرح خوشی سے پوچھ رہا تھا اور اس کا دل چاہا سر پیٹ لے۔

''ھالار میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ تم کچھ پی کر آئے ہو؟ کیونکہ مجھے پتہ ہے بہت عرصہ باہر رہنے کے بعد بھی تم نے کبھی پی نہیں ہو گی، مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ تم بے خبر ہو یا پھر ہوش میں تو ہو نا؟'' وہ اس کی بات پہ ہنس پڑا تھا اور ہنستا رہا۔

''آہستہ ھالار کوئی نہیں بھی جاگ رہا ہو گا تو جاگ جائے گا۔'' وہ اس کا خیال کرتے ہوئے چپ ہوا تھا۔

''اچھا پھر بتاؤ نا، چلو یہ تو رکھو، میں پہنا دوں؟'' اس قدر اعتماد اس نے سوچا بجائے اس کا سر پیٹ لے یا بچوں کی طرح کپ اٹھا کر دے مارے۔

''ھالی تمہیں کچھ حقیقتوں کا نہیں پتہ؟''

''مجھے سب پتہ ہے امر کلہ، اس نے بتا دیا ہے، امرت نے سب بتا دیا ہے مجھے، وہ خط امرت لکھتی تھی، مگر وہ ترجمانی تمہاری ہوتی تھی۔''

''ھالار ایسا ہرگز نہیں، میں خود بے سمجھ تھی اور تم ایک سراب کے پیچھے بھاگتے جا رہے تھے، مجھے تم میں دلچسپی ضرور تھی، انسیت تھی، احساس تھا، مگر محبت نہیں تھی۔'' یہ آخری جملہ کہتے ہوئے جتنی تکلیف اسے ہوئی تھی اس سے کہیں زیادہ تکلیف وہ سہہ رہا تھا۔

''یہ غلط ہے امر کلہ؟ ایسا نہیں ہے تمہیں مجھ سے محبت تھی۔''

''اگر وہ محبت تھی ھالار تو پھر اس پہ حالات کی گرد کیسے چڑھ گئی، میں تلاش کے رستے میں سب کچھ چھوڑ کر کیسے آ گئی، نجانے میں کیوں خوار ہو رہی تھی اور کس کے لئے، شاید میں صرف بھاگ رہی تھی۔'' اس نے اپنے سوال کا فوری جواب خود دیا تھا۔

''انسان کو اپنے سوال کے فوری جواب خود دینے پڑتے ہیں، کیونکہ ان سوالوں کے جواب ان کے اندر تب سے جنم لے چکے ہوتے ہیں جب سوال اٹھتے ہیں جیسے موت کے ساتھ زندگی اور

بیماری کے ساتھ علاج اترتا ہے، اسی طرح ہر سوال اپنے جواب کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کو سوالوں کے جواب فوری طور پہ ملتے ہیں اور کچھ کو بہت دیر سے اور کچھ کو تو ملتے ہی نہیں، اگر ملتے ہیں تو سمجھ سے گزر جاتے ہیں، ٹھہرتے نہیں، سوال بھی کانٹا ہوتے ہیں، کبھی توپ کا گولہ اور جواب کبھی موت ہوتے ہیں اور کبھی حیات کی خوشخبری، سوال اور جواب کی جنگ زندگی اور موت کی طرح ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے۔'' ھالار کی آنکھوں میں پانیوں کا سمندر تھا۔

''تمہیں خود یہ طے کرنا ہوگا ھالی کہ تمہیں کیا چاہیے تھا، تمہیں کس کی ضرورت تھی؟ میری یا پھر امرت کے صحت مند لفظوں کی، تمہارے زخموں پر مرہم وہ حرف لفظ بن کہ رکھتے تھے اور تم مجھے دیکھ کر خوش ہوتے تھے، ھالی یہ ایک لمبی کہانی ہے اور تکلیف دہ بھی، امرت نے تمہیں یہ تو بتا دیا کہ خط وہ لکھتی تھی، مگر اس نے یہ نہیں بتایا ہوگا کہ وہ کتنی دہری مشقت سے گزری تھی۔'' گفتگو کا رخ پلٹ چکا تھا، ھالار کے آنسو جاری تھے، وہ اس کی بات سن تو رہا تھا مگر اس کے ذہن میں صرف ایک جملہ گونج رہا تھا کہ ''مجھے تم سے محبت نہیں تھی۔''

''یہ ایک جملہ بہت بڑا فرق دیتا ہے، صرف یہ کہہ دینا کہ مجھے تم سے محبت ہے اور پھر یہ کہہ دینا کہ مجھے تم سے محبت نہیں، زندگی دینے اور چھین لینے والی بات ہو جاتی ہے، جیسے آپ کسی سے زندگی کا احساس چھین لو، یا اسے کسی گہرے کنویں میں دھکیل دو کہ جاؤ جا کر مرو، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے اور کسی سے سچا اظہار محبت کرنا ایسا ہوتا ہے جیسے آپ کہہ دو کہ مجھے تم سے محبت ہے گو کہ وہ کسی گہرے کنویں میں آخری سانسیں لے رہا ہو اور آپ اسے کہہ رہے ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے آپ اسے زندگی کی امید دے رہے ہوں، آپ اسے کہہ رہے ہوں کہ مجھے بہت فرق پڑتا ہے، اس ساری چیز سے، تمہاری تکلیف سے اور آخری سانسیں لینے والا اگر جم کر کنویں سے باہر نہ بھی آ سکا تب بھی وہ سکون کی آخری سانسیں آنکھیں موند کر چھوڑے گا، اس کے چہرے پر مسکراہٹ ہوگی اور وہ بتا رہا ہوگا کہ وہ خالی ہاتھ اس دنیا سے نہیں جا رہا، اس کے پاس ایک دولت ہے، جسے محبت کہتے ہیں، جو وفا سکھاتی ہے، جو وعدے کی پاسداری سکھاتی ہے، جو ذمہ داری ڈالتی ہے۔''

وہ کس منہ سے امر کلہ کو اپنے وعدے یاد دلاتا، اپنے ساتھ گزارے ہوئے وقت کا کون سا حوالہ دیتا، اس پر وفا کی کیا ذمہ داری ڈالتا، وہ تو صاف مکر گئی ہر احساس سے صرف یہ کہہ کر صرف اتنا کہ ''مجھے تم سے محبت نہیں ہے'' اور اسے لگا زندگی سارے در اس پر بند کیے جا چکے ہیں، ہر دروازے سے بس اک یہی صدا بلند ہوتی ہے کہ ''مجھے تم سے محبت نہیں، اس لئے دستک نہ دو''، یہ سب اس سے امر کلہ نے نہیں، جیسے زندگی نے کہا ہو، اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کا باپ کئی سالوں سے موت کی تمنا میں آخر کیوں جی رہا ہے۔

☆☆☆

دوسرے دن صبح سویرے لکی اس کے سر پہ کھڑی تھی کہ ''تمہارا وہ تو بہت اچھا خاصہ ہیرو آدمی ہے'' جبکہ اس کے لئے ڈوب مرنے کا مقام تھا کہ کسی مرد سے اس کے رشتے کو کن معنوں میں لیا جا رہا تھا، وہ بجائے ملامت کے سرگوشیاں تھیں نگاہوں کی روشنی معنی خیز انداز میں مسکراتی تھی، یہ سب

شاید ان سب کے لئے فخریہ تھا۔

''لے میری بات سن شادی کیوں نہیں کر لیتی اس سے یہ چھپ چھپا کر ملنے سے تو جان چھوٹے گی نا، دن دیہاڑے ملا کر۔''

اس کا دل کیا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

''دیکھو میں یہ پہلی اور آخری بار کہہ رہی ہوں تم لوگوں سے میرا کوئی ایسا تعلق نہیں ہے اس آدمی کے ساتھ، میرا ساتھ پڑھا ہوا تھا خیریت معلوم کرنے آیا تھا اور بس۔''

''لے کس کو سکھا رہی ہے میما، خیریت معلوم کرنے آیا تھا اور منہ اندھیرے چپ چھپا کر۔'' تکو ہنسنے لگی تھی اور بسکٹ کے دو پیکٹ ریشماں لڑکی کے ہاتھ لگے تھے، وہ بڑے شوق سے کھاتی ہوئی اندر آئی تھی۔

''بڑا اچھا ہے تیرا دولہا، کیسے خیال رکھتا ہے تیرا۔'' اس نے خونخوار نظروں سے اسے گھورا تھا۔

''چل دولہا نہیں بنا تو کیا ہوا بن جائے گا، ریشم کی دعا لگے تجھے۔'' اتنا کہہ کر وہ کھی کھی کرتی ہوئی کمرے سے چلی گئی تھی۔

اس کے لئے ذلت کے لمحات تھے، وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ اگر انکل کو ان باتوں کی بھنک پڑ گئی تو اک اور تماشہ لگے گا، وہ اسی رات انکل کے گھر گئی مزید پیسوں کا مطالبہ کیا انہوں نے یہی کہا کہ مزید کچھ دن مہلت دے دی جائے اور یہ کچھ دن اس کا وہاں رہنا مزید دامن داغ دار کرنے کے مترادف تھا، وہ بے بسی سے دیکھنے لگی۔

''دیکھو ہمیں کوئی مسئلہ تو سو بار بلا اسے ہمیں کیا پڑی ہے، کہے تو رکھوالی کریں تیری۔'' اس کا دل کیا اس تیز دھار والی چھری سے اپنایا پھر ان دونوں کا خون کر لے۔

''دیکھو تسکو اور تکی بس بہت ہو گیا یہ کھیل، اب اس سے آگے کچھ نہیں۔'' اسی شام اس کی دونوں سے اچھی منہ ماری ہو گئی تھی۔

دوسرے دن ھالار نے ضرورت کی اشیاء کسی اور کے ہاتھوں بھجوائیں تھیں اور ان کا شک تو پکا یقین میں بدل گیا تھا۔

آدمی چیزیں چھوڑ کر رکا نہیں تھا، چیزیں تسکو کا شوہر لے آیا تھا دروازے سے۔

امر کلہ نے وہ فروٹ بسکٹ چاکلیٹ اور چند ضرورت کی اشیاء والا تھیلا وہیں پھینک دیا تھا جسے آدھا سکو کے بچے لوٹ کر لے گئے۔

وہ سیدھی ھالار کے گھر کی طرف گئی تھی تاکہ اس کی اچھی خبر لے لے، مگر بدقسمتی سے اس کے دروازے پر تالا تھا، وہ اس کے آنے سے پچاس منٹ پہلے یہاں سے امرت کے ساتھ لاھوت کے گاؤں روانہ ہوا تھا۔

وہ اسے غیر حاضر دیکھ کر اپنی ساری بھڑاس اپنے اندر لیے وہیں لوٹ آئی، مزید ایک دو دن اس کے لئے وہاں گزارا کرنا زہر کے گھونٹ پی کر جینے کے مترادف تھا اور اسے یہ زہر کا گھونٹ پینا ہی پڑا تھا۔

زندگی میں پہلی نہیں کئی بار وہ خود سے بیزار ہوئی تھی اور یہ شکوہ کہ آخر میری زندگی کب پرسکون

ہوگئی، یہ زندہ رہنے والا ہر انسان کہتا تھا۔

☆☆☆

کسی مرے ہوئے مسلمان کے ساتھ آخری وفاداری کرنا بہت نیکی کا کام ہے، صبح سویرے اسے پتہ چلا تھا، علی گوہر کو جانے کہاں رات سے پھر سے پرانے روگ میں پھر رہا تھا، وہ عمارہ اور ھالار کو لے کر نکل آئی تھی، اس نے اپنے چاچے کا آخری مرتبہ منہ نہیں دیکھا تھا۔

اسے دیر ہوگئی تھی، اس نے سوچا تھا شاید وہ ان کو نہیں دیکھ پاتی، یا پھر دیکھتے شرمندہ ہو جاتی، مگر وہ دیکھنا ضرور چاہتی تھی، وہ جیسے بھی تھے ان سے وابستہ بہت یادیں رہی تھیں، پھر بہت ساری تلخی اپنی جگہ مگر ان کے احسانات اپنی جگہ، چودہ سال وہ ان کا لایا ہوا رزق کھاتی رہی تھی، ان کے لائے کپڑے پہنتی رہی تھی، ان کی دلائی چیزیں استعمال کرتی رہی تھی اور اس کے بعد بھی، جب تک اسے ماں باپ ساتھ لے گئی تب تک۔

وہ اتنی بھی احسان فراموش نہ تھی، لاسٹ ٹائم یہاں سے فرار ہو کر نکلنے کے بعد سب سے پہلی نگاہ ملانا دشوار تھا، مگر پھر اس نے سب کچھ سنبھال لیا، تین دن تک حویلی کے اندر کے انتظامات اس کے ذمے تھے اور اس نے بہت احسن طریقے سے نبھائے تھے۔

لاھوت کی ماں کو پتہ تھا اب کی بار وقت نہیں کسی ایسی بات کا، مگر دل میں یہ ایک بات رہ گئی تھی کہ کاش تب نکاح ہو جاتا۔

امرت سے وابستہ سب کی شکائتیں ختم ہو چکی تھیں، اس کی ماں گھر پہنچ چکی تھی تب اور فون پہ فون کر رہی تھی، مگر وہ دسویں تک وہیں رکی رہی تھی، علی گوہر چوتھے دن عمارہ کو لے کر گیا تھا اور ابھی وہ دونوں اسی مچھلی کے تالاب کے پاس بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے، جب عبدالھادی کو انہوں نے گھر سے باہر نکلتے دیکھا۔

''یہ درگاہ کی طرف جا رہے ہیں؟'' امرت نے لاھوت سے پوچھا نہیں رائے لی۔

''ہاں مگر جا نہیں سکیں گے، کل بھی آدھے رستے سے لوٹ آئے تھے، دیکھنا آج بھی لوٹ آئیں گے، کوئی خوف ان کو کہیں جانے نہیں دے رہا۔''

''ان کا پہلا سوال کیا تھا لاھوت جب وہ بوا ماں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔''

''ان کا پہلا سوال یہ تھا کہ کیا جانے والا اپنے کام پورے کر گیا ہے؟''

''اور ان کا دوسرا سوال یہ ہوگا کہ وہ کیا کام ہو سکتا ہے اور تیسرا یہ ہوگا کہ اگر وہ اپنا کام ادھورا چھوڑ گیا ہے، تو کیا کوئی اور یہ کام پورا کر سکتا ہے؟ اور یہ بقیہ دو سوال انہوں نے بوا ماں سے نہیں بلکہ خود سے کیے ہونگے، اگر انہیں پہلے سوال کا جواب مل گیا ہوگا تو ہو سکتا ہے بقیہ سوالوں کی نوعیت بدل گئی وہ، مگر مجھے اندازہ ہے کہ بوا ماں نے کہا ہوگا کہ جس نے کام دیا ہوگا اسی کو پتہ ہوگا یعنی کہ خدا کو، تمہارے اندر کے کیا سوالات ہیں امرت؟''

''کس کے خدا کے متعلق؟''

''نہیں ان کے بتائے ہوئے رولز کے متعلق، زندگی اور موت کے متعلق۔''

''لاھوت تمہارے ذہن میں خدا کے لئے کوئی وسوسہ ہے کیا؟''

''پتہ نہیں امرت، بس میں ان کو تسلیم کرتا ہوں۔''

''ان کو تسلیم کون نہیں کرتا لاھوت، جو نہیں کرنا چاہتا وہ بھی کرتا ہے بلکہ اسے کرنا پڑتا ہے، خدا کی موجودگی کی حقیقت ہر جگہ خود اپنا اعلان کرتی ہے۔''

''امرت کیا کبھی تمہارا دل کیا کہ تم خدا کو دیکھو۔'' اسے اندازہ تھا لاھوت اس سے یہ سوال ضرور کرے گا۔

''لاھوت تمہیں پتہ ہے خدا کو دیکھتے نہیں محسوس کرتے ہیں، کسی بڑے اسکالر نے سچ کہا تھا کہ وہ اپنی صفات سے پہچانا جاتا ہے، وہ اپنی قدرت سے پہچانا جاتا ہے اور ہم اس کی قدرت دیکھ رہے ہیں۔''

''امرت میں نے یہ نہیں پوچھا کہ تم اسے دیکھو یہ پوچھا کہ کیا دل میں یہ تمنا ہے؟'' امرت کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے، فنکار کو بہت دیر ہوئی لوٹا نہیں تھا۔

''چلو لاھوت ان کی خبر گیری کرو، وہ شاید درگاہ تک پہنچ چکے ہوں گے، اکیلے ہیں، اتنے بہادر نہیں رہے کہ وہاں جا کر ڈریں نہیں، پورے رستے ان کا لاشعور انہیں طرح طرح کے واہمے دے رہا ہوگا۔'' امرت نے یہ سوال کیوں کیا، وہ جان نہ سکا تھا۔

''پہلے انہوں نے اوطاق بسائی، اب اگر درگاہ میں روز روز جانے لگے تو درگاہ بسا لیں گے، جب لوگ ان کو یاد کرتے ہونگے، وہ نہیں لوٹنا چاہیں گے، وہاں بیٹھ کر اپنے مرنے کا انتظار کریں گے اور وہ انتظار بہت جان لیوا ہوگا، نہ مارے گا نہ زندہ رکھے گا۔''

''لاھوت انہیں گھر لے آؤ، بس ان کا وہم ٹوٹنے دینا اس لئے کچھ دیر انہیں وہاں چھوڑنا پھر لے آنا۔''

''امرت اگر انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی؟'' وہ بھی ڈرا ہوا تھا۔

''تو پتہ نہیں کیا ہوگا، اس سے آگے میں سوچنا نہیں چاہتی۔''

''کیا تم میرے ساتھ چل سکتی ہو؟''

''ہاں ٹھہر جاؤ میں اپنی چادر لے کر آ جاؤں، یہاں اتنی ٹھنڈ ہے تو باہر کتنی ہوگی۔''

''ہاں مگر جلدی آ جانا۔'' وہ وہیں کھڑا تھا، وہ چادر لاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اتنے بچہ ذہنی بیمار ہو جاتا ہے اور پھر وہ ذہنی طور پہ ہمیشہ اسی کرائسز کا شکار رہتا ہے، وہ اسی طرح ڈرے ہوئے تھے۔

''اور اس کی وجہ تمہیں پتہ ہے امرت کہ کیوں اور کس لئے ہمیں بچپن سے ایسے کئی ڈر دیئے جاتے ہیں، کئی خوف جو ہمیشہ ہمارے ساتھ سفر کرتے ہیں، تمہیں یاد ہے بیجی ماں بچپن میں ہمیں کتنے ڈر دیا کرتی تھیں اور تم تو جیسے چیلنج لے لیا کرتیں، یاد ہے ایک دن بڑے ابا کی کوٹھی کا تالا کھولنے تم رات میں چلی گئی تھیں مگر آدھا صحن عبور کرتے ہی تمہیں چیخوں کا دورہ پڑ گیا تھا، یہ بتاؤ کیا دیکھا تھا۔''

یہ چوتھا روز تھا لاھوت کے والد کی وفات کو پانچویں کی رات تھی اور چاندنی تھی، وہ دونوں چھوٹے مچھلیوں کے تالاب کے پاس بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے۔

ھالار واپس جا چکا تھا، وہ اسے لائی ہی زبردستی تھی یہ کہہ کر ھالار اگر زندگی میں کوئی نیکی نہیں کی تو یہ نیکی سمجھ کر کرلو۔

''مجھے اندازہ ہے ان کے سوال کس طرح کے ہو سکتے ہیں، مجھے بتاؤ لاھوت ان کا پہلا سوال کیا ہے؟''

''ان کا پہلا سوال کیا ہے؟ وہ یہ تو قطعی نہیں کہیں گے جانے والا کس لئے اور کیوں گیا، دیکھو تمہارا رونا فطری ہے، وہ تمہارے باپ تھے، بلکہ ہیں، جدائی کسی طور جدائی ہی ہے اور ان کا رونا بھی فطری ہے، مگر لاھوت وہ جس طرح رو رہے تھے اس دن، یقین مانو اپنے بھائی کے لئے نہیں روئے تھے، ان کے اندر بہت سارے دکھ رو رہے تھے، مگر ان کے رونے میں ایک خوف تھا، ایک ڈر تھا، جو دس سالہ بچے کے رونے میں ہوتا ہے، کسی ہونی انہونی کا ڈر، ماں کا دیا ہوا وہم جیسے مائیں بچوں کو منہ اندھیرے باہر نکلنے سے روکنے کے لئے عجیب واہموں میں ڈال دیتی ہیں، اس وقت معاشرے کی سو برائیوں سے روکنے کے لئے دینے والے ڈر کو وہ ہتھیار سمجھ رہی ہوتی ہیں، وہ سمجھتی ہیں ایک ڈر کا مقابلہ دوسرے ڈر سے کیا جاتا ہے بچہ رک جاتا ہے، ماں کے ڈر پر بچے کا خوف حاوی ہو جاتا ہے، بچہ جسمانی طور پہ رک جاتا ہے، بچ جاتا ہے، مگر اس کا اندر کسی ڈر کی وجہ سے سہم جاتا ہے۔'' دنوں سے وہ ان سے سامنا کرنے سے گریز کر رہی تھی اور وہ خود بھی بھاگ رہے تھے۔

لاھوت اسے بتا چکا تھا کہ وہ انہیں بتا چکا ہے پھر نہ بھی بتایا ہوتا تو یہاں تک پہنچ جانا ہی بہت ساری باتیں سمجھا دیتا تھا، وہ چادر لے آئی، دونوں ان کے پیچھے پیچھے نکل گئے۔

☆☆☆

''یہ کچھ ڈھونڈ رہے ہیں امرت۔'' لاھوت اور وہ ان سے فاصلے پر کھڑے تھے۔

''یہ بہت کچھ ڈھونڈ رہے ہیں لاھوت، تم ان سے ملو امرت ان کی بے قراری کو قرار آئے گا، ان کی بے قراری اس وقت میں نہیں ہوں لاھوت، میں ان معاملات میں مخل نہیں ہونا چاہتی۔''

فنکار اپنے دادا کی مزار کی اوٹ میں سر نیہوڑائے بیٹھا تھا۔

''یہ شاید اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے آئے ہیں۔'' لاھوت دروازے سے باہر تھا، امرت کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

''یہ بکھرا اجڑا ویران دل والا مایوس شخص جو اپنی زندگی کی آخری امید ڈھونڈ رہا ہے، یہ میرا باپ ہے، امرت انہیں تسلی دو نا۔''

''نہیں لاھوت، یہ وقت میری دی گئی تسلی کا نہیں ہے۔''

کوئی فقیر صحن سے اٹھ کر اس طرف آیا تھا۔

لاھوت نے کہا ''امرت یہاں سے ہٹ جاؤ'' وہ دونوں صحن میں اک کونے میں کھڑے تھے۔

حویلی کی عورتوں کا یوں نکلنا یہاں خواب سمجھا جاتا تھا، پہلے باقاعدہ طور پہ پردہ کروایا جاتا تھا۔

''اور پھر بیبیاں تشریف لاتیں، رسومات اور اصولوں میں صدا کا بندھا ہوا بیچارہ انسان۔''
اس وقت امرت کا لگا تھا لاھوت کو اس کا یہاں کھڑا ہونا کھٹک رہا ہے، حالانکہ بے دھیانی میں لایا تو خود ہی تھا۔

یہ رات کا پہلا پہر تھا اور فقیر، مسجاور مسافر خانوں میں ٹھہرے لوگ جاگتے تھے، فقیر قوالی کہتا تھا، یا قصیدہ پڑھتا تھا یا مناجات اور اس کے بعد فجر تک اللہ والوں کے پاس اللہ کا ذکر ہوتا تھا۔
جو زندہ اور مردہ دونوں دلوں کے سکون کا سامان ہے، امرت ایک کونے میں مسافروں کی طرح چھپ کر بیٹھ گئی، جیسے بچپن میں کرتی تھی، لاھوت اجنبی بن کر احاطے میں بیٹھا تھا، قوالی کے بعد مناجات اور پھر ذکر خدائے کریم کی ہو گونجنے لگی تھی۔
''سب طاقتیں خدائے واحد کی ہیں۔'' وہ کونے میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔
اس فجر مسافر خانے میں نماز پڑھنے کے بعد اس نے نکلنے سے پہلے لاھوت کو کہا تھا کہ مجھے بلا لینا جب ضرورت پڑے۔
''اس نے کہا کب؟''
''کہنے لگی جب میرا باپ بیچارگی کی انتہا کر دے اور بڑے سائیں کا حجرہ یا مزار بسا دے، جب وہ اپنی تلاش کو ایک کونے میں سمیٹنے کی حرکت کرے گا (نہیں معلوم وہ غلطی ہوگی یا نہیں) اس دن میں ان سے پہلی بار کھل کر بات کروں گی۔'' وہ اس دن کے انتظار میں وہاں سے نکلی تھی اور اسے نکلتے وقت پتہ تھا کہ وہ وقت دور نہیں ہے، وقت نزدیک تھا۔

☆☆☆

یہ نواب شاہ کی طرف جاتی ہوئی سڑک پر بس اسٹاپ کے پاس کھڑی گاڑیوں کے بیچ میں سے آتا ہوا تیز رفتاری سے اس کی طرف دوڑتا کالی وردی والا پولیس آفیسر تھا، وہ اسے اپنی طرف دوڑتا دیکھ کر خود ہی رکی تھی، بھاگی نہیں، بھاگتے مجرم ہیں۔
اسے صرف حیرت تھی کہ آدمی اس کی طرف کیوں دوڑا آیا ہے، وہ رکی، وہ واقعی اس کی طرف آیا تھا، مگر آتے ہوئے اس کی اسپیڈ اس لئے سلو ہوئی کہ کچھ لمحوں کے لئے وہ خود حیران تھا کہ خاتون اسے دیکھ کر رکی کیوں ہے، حلیہ تو وہی جو بتایا گیا تھا۔
''میڈم، سادھنا بچی کے کیس میں آپ کو تھانے چلنا ہے۔''
''سادھنا! کہاں ہے وہ؟ کون سا کیس؟'' وہ جی بھر کر حیران تھی اور آدمی کا شک یقین میں بدل گیا۔
''میں آپ کو ہتھکڑی نہیں پہنانا چاہتا، آپ ساتھ چلیں میرے۔''
''مسئلہ کیا ہے؟''
''اچھی خاتون لگتی ہیں، کیسے کر لیا کام یہ۔''
''مجھ پہ کوئی الزام؟'' وہ حیران تھی، پولیس والا اور شرافت سے بات کر رہا تھا اس پہ پولیس والے کو زیادہ حیران ہونا چاہیے تھا۔
''آپ چلیں تھانے چل کر بات ہوگی۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' اسے خود سڑک پر تماشہ کرنا معیوب لگ رہا تھا، وہ اتنے اطمینان سے کھڑی تھی جیسے آدمی سے وہ گہری واقفیت رکھتی ہو۔

''تھانہ کہاں ہے؟ آپ میرے پیچھے آئیں، میں رکشہ پکڑتی ہوں، اگر اِدھر اُدھر ہو جاؤں تو فائرنگ کا حق آپ کو ہے۔''

عجیب خاتون تھی، وہ موٹر بائیک پر سوار ہوا، خاتون نے رکشہ پکڑا، سیدھا تھانے پہنچا، وہ اسے اندر لے آیا، آدمی نے سونا کو فون کروایا تھا۔

''آجاؤ تھانے تمہاری مجرم یہاں ہے۔''

اور دوسرا فون سب انسپکٹر کو تھا۔

''سر وہ خاتون موجود ہے جس کو آپ نے بہت عزت سے لانے کو کہا تھا۔'' وہ کاروائی اس کے سامنے کر رہا تھا اور امر کلہ کے لئے یہ لمحہ ایک حیران کن لمحہ تھا، مگر وہ صبر سے بیٹھی تھی، تو ایک اور امتحان اب کس طرح کا رہتا ہے، اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

تھوڑی دیر میں سونا آ گئی تھی اور اس پر چلا رہی تھی۔

''دیکھو سونا ایک لمحے کے لئے بیٹھو میری بات سنو، میرا یقین کرو مجھے سادھنا کی گمشدگی کا کچھ پتہ نہیں میں تو اتنا عرصہ اپنے کاموں میں گم رہی۔'' مگر وہ مسلسل چلا رہی تھی۔

''اسے کہو بتا دے میری بیٹی کو کہاں چھپا کر رکھا ہے، کس لالچ میں چھپا رکھا ہے۔''

اسی وقت سب انسپکٹر آیا تھا۔

''آپ ہی ہیں؟'' وہ مسکرایا۔

''کیسی ہیں آپ؟'' سپاہی حیران تھا۔

''سر یہ وہی ہے جنہوں نے اس خاتون کی بیٹی کو اغواء کروایا ہے۔''

''اچھا واقعی؟'' امر کلہ نے سپاہی کو تعجب سے دیکھ کر کہا۔

''جی ہاں واقعی، اس پر سزا ہوتی ہے۔''

''سر نے اگر نشانیاں نہ سمجھائی ہوتیں تو میں آپ کو ایسے نہ لے کر آتا۔''

''رفیق مجھے بات کرنے دو۔''

''بیٹی میں آپ کو کبیر احمد کے حوالے سے جانتا ہوں ان کے ساتھ دیکھا تھا، پہلی بار انہوں نے کہا یہ میری بیٹی ہے بہن ہے، دوسری بار پروفیسر غفور نے کہا کہ اس قسم کی لڑکی جہاں نظر آئے اسے عزت سے لانا اور کہنا تمہیں کہاں جانا ہے، مگر اس سے پہلے میں آپ کو بتاؤں، آپ کی خودکشی کی خبر کے بارے میں بھی جانتا ہوں۔'' یہ جملہ انہوں نے آہستگی سے کہا تھا، سونا پھر سے فریادی کی طرح چلائی۔

''چپ خاتون انہیں بولنے دو۔''

''میں کیا صفائی پیش کروں اب، مجھے خود سادھنا کی گمشدگی کا دکھ ہو رہا ہے، کہیں تو ایک رپورٹ میں بھی لکھوا لوں اور وہ رپورٹ میں بھی یقیناً سونا تم پر ہی لکھواؤں گی کیونکہ اس کے گھر سے بھاگنے کی ذمہ داری میں کم تم زیادہ ہو۔''

''مگر یقین کرو ایک ماں ہونے کے ناطے تمہارا دل جیسے اس کے لئے تڑپتا ہوگا، تمہارے احساس بھی سمجھتی ہوں۔''

''چلو یہ وعدہ رہا پکا والا کہ جب کبھی سادھنا مجھے نظر آئی میں اسے تمہارے پاس لاؤں گی، تم دل مت چھوٹا کرو سونا۔''

''آپ کو ہم کہاں چھوڑ دیں؟'' سپاہی کو سب انسپکٹر کا اشارہ تھا۔

''مجھے کہیں چھوڑنے کی ضرورت نہیں، میں اپنا پتہ اور نمبر چھوڑے جا رہی ہوں، شک اب بھی موجود ہو تو رابطہ کر لیجئے گا۔'' وہ انسپکٹر کا شکریہ ادا کر کے نکل آئی، سادھنا کی فکر باقی تھی۔

☆☆☆

''تو تم تیار ہو گئیں امرت؟'' عدنان دروازے سے جھانکتے ہوئے بولا۔

''میری کیا تیاری ہو گی۔'' اس نے جلدی جلدی کچھ کپڑوں کے نیچے چھپا دیا تھا، وہ مشکوک ہو کر اندر آیا، بظاہر نارمل۔

''آج تمہارا خواب پورا ہونے جا رہا ہے، مجھے یقین ہے امرت تمہیں جگہ پسند آئے گی، بہت اچھی جگہ پہ مل گیا اسٹور اور اسٹاف کا تم نے کیا سوچا؟'' وہ اس کے سامنے آ کھڑا تھا الماری کا پٹ کھلا تھا، عدنان نے اسے بیگ لینے کے لئے کہا۔

وہ میز کی طرف آئی اور اس نے ڈھیر سارے بے ترتیب گھسیڑے ہوئے کپڑوں میں سے جھانکتا سرخ کپڑا جو خود اپنی چغلی کھا رہا تھا۔

''تمہاری الماری سے کوئی چیز باہر آنا چاہتی ہے۔'' یہ بچوں کی جادوئی فلم کا ایک جملہ تھا جو صورتحال پر فٹ بیٹھتا تھا، وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔

''تم نے کب سے اپنے بچے کے ساتھ بیٹھ کر فلمیں دیکھنا شروع کر دی ہیں۔''

''پوچھو کب سے دیکھنا بند کر دی ہیں، جب سے میرا چھوٹو نیند میں ڈرنے لگا ہے۔'' گٹھڑی باہر تھی اور اس کے ہاتھ میں تھی۔

''اسے کھولنا مت، عدنان پلیز مت کھولنا۔''

''کیوں؟ اس میں ایسا کیا راز ہے۔'' اسے تو کھولنا ہی تھا، امرت کو یاد آیا منع کرنے پر تجسس بڑھتا ہے۔

''اچھا ٹھیک ہے کھول دو۔''

''اچھا، بہت شکریہ۔'' وہ کھول چکا تھا یہ اک چٹ تھی وہ بے ساختہ آگے بڑھی۔

''اسے یقیناً مت کھولنا عدنان پلیز۔'' اس نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی۔

''تم نے تعویذ کب سے لکھنا شروع کر دیا ہے۔''

''میں نے کوئی تعویذ نہیں لکھا۔'' وہ گھبرائی کیوں تھی۔

''تمہیں یہ کہنا چاہیے تھا کہ تم نے تعویذ لکھنا چھوڑ دیا ہے، مجھے یاد ہے تم اپنی سہیلی کے لئے کتنے نقش لکھتی تھی، کتنی پلیٹیں لکھتی تھیں اور تسبیاں پڑھتی تھیں۔''

''یہ بھی اسی کے لئے تھا۔''

''ہاں..... ٹھیک ہے اب مجھے دیے دو عدنان۔''

''اس میں ایسا کیا ہے امرت؟ یہ تجسس مجھے تب بھی تھا مگر مجھے اندازہ نہ تھا کہ میں کبھی اس پوزیشن میں آسکوں گا کہ تمہارے سامنے تمہارے کمرے میں کھڑا ہو کر تمہاری الماری کھول سکوں گا۔''

''بس بہت ہو گیا۔'' اس نے چٹ چھین لی اور پرس کی اندرونی پاکٹ میں دبالی، گٹھڑی کا کپڑا کسی بھی تجسس سے خالی الماری کے سامنے والے خانے میں ظاہر پڑا تھا، اس کی اہمیت گھٹ گئی تھی، وہ جیسے ہلکا پھلکا ہو کر ٹھنڈی سانسیں بھر رہا ہو، امرت نے بیگ کندھے سے لگایا، گلاسز پکڑے۔

''اب چلو، چلنا ہے یا نہیں۔''

''مجھے اگر چٹ کھولنی ہوتی تو میں کھول چکا ہوتا۔''

''چلو عنقریب تمہارے عجوبے بھی پہنچ جائیں گے۔''

''کون عجوبے؟ علی گوہر اور عمارہ، لاھوت۔'' وہ جانتی تھی۔

''اور کون بھلا؟''

''میں اگر بیچلر ہوتا تو تمہاری کزن بیچاری سے شادی کر لیتا، اس کی ماؤس کے حوالے نہ کرتا۔''

''شرم کرو عدنان۔'' وہ اسے ٹوکتی ہوئی باہر گئی۔

''تم ایک ساتھ اس طرح بات کرتے ہوئے اچھے لگتے ہو۔'' صنوبر امرت کے لئے ناشتہ لا رہی تھی، عدنان کر چکا تھا۔

''اب تم اور دیر کرانا مجھے۔'' وہ کوفت سے بیٹھ گیا۔

''بس تھوڑا سا تو چکھ لوں ذرا، ای کے ہاتھ کے پراٹھے تو چھوڑنا مشکل ہے۔''

وقار صاحت دھوپ سینکنے باہر لاؤنج کی کھڑکیاں کھولے اخبار دیکھ رہے تھے۔

سب کتنا اچھا لگ رہا تھا، اسی وقت لاھوت اور عمارہ ایک ساتھ اندر آئے تھے۔

''لو بلبل اور جگنو آ گئے۔'' ان کے سامنے عدنان کافی لحاظ کر لیا کرتا تھا۔

''تم نے آخر کیا سوچ کر اس کو مجھ سے شادی کروائی بولو؟'' لاھوت آتے ہی کھانا اور بولنا دونوں کام ایک ساتھ شروع کر دیتا تھا۔

''میں خود اس سے بیزار ہوں۔'' عمارہ کے چہرے پہ جھلاہٹ تھی۔

''خوشی خوشی گئی تھیں، شادی کو دو ہفتے ہوئے ہیں اور یہ عالم ہے، دو صدیوں کی دعا کیسے دوں۔'' وہ ناشتہ ختم کر چکی تھی اور اب لاھوت پر نظر تھی۔

''علی گوہر کی بہت کمی ہے امرت۔'' لاھوت کو محسوس ہوا۔

''شکر ہے تمہیں کسی کا احساس تو ہوتا ہے۔'' عمارہ کا یہی حال تھا۔

''عمارہ شادی کے بعد پچھتانے کے لئے کم از کم دو سال کی ضرورت ہوتی ہے دو ہفتوں میں یہ حال ہے، مت پوچھو امرت میں تو دوسرے دن بیزار تھا۔'' وہ اب چائے پی رہا تھا پوری کھا کر

اور اب چائے پی رہا تھا، عمارہ اسے گھور رہی تھی۔
''صبح سے میں نے بھی کچھ نہیں کھایا خالہ؟'' اس کی فریاد وہاں تھی جہاں درج ہوتی تھی۔
''میری جان تم یہ کیک لے لو۔''
''اوہ اسے کھاتے کھاتے ایک گھنٹہ لگے گا، گاڑی میں کھالوں گی۔'' لاھوت کو آدھا کپ وہیں چھوڑنا پڑا تھا، ایک چپس امرت کو اشارہ کر کے عمارہ سے لیتا ہوا لاھوت بھی ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا۔
''تم شادی کے بعد کچھ زیادہ پیٹو ہو گئے ہو لاھوت۔'' امرت اسے گھرکتی گاڑی تک آئی، عدنان ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔

☆☆☆

''جس کو بھی حقیقت سمجھا تھا وہ کئی لاشعور کی کیفیتیں نکلیں اور جس کو لاشعور کی حرکت سمجھتی رہی، درحقیقت وہی حقیقتیں تھیں۔'' امر کلہ نے پلٹتے ہوئے سکھی کی طرف ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ کر کہا تھا۔
اس کی ماں برق رفتاری سے اندر آئی تھی اور اتنی ہی بے ساختگی سے ایک زوردار تھپٹر امر کلہ کے منہ پر جڑ دیا، جتنی حیران امر کلہ تھی اس سے کہیں زیادہ وہ خود تھی۔
''تم نے اسے تھپٹر کیوں مارا؟'' سکھی حیران تھی اور دکھی بھی۔
امر کلہ کو تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا اس نے ایک بار اپنے دہکتے ہوئے گال کو چھو کر یقین کرنا چاہا کہ یہ تھپٹر سونا نے سادھنا کو مارا ہے یا اس کی ماں نے اسے۔
''تم نے اس کیوں مارا؟'' سکھی کا بس چلتا وہ الٹا جڑ دیتی اسے، یقیناً سوجڑتی اگر رشتے میں اس سے بڑی ہوتی یا عمر میں، لحاظ والے کو تو عمروں کا لحاظ ہی مار دیتا ہے۔
''میں نے اسے خواب میں دیکھا ہے۔'' وہ ہانپ رہی تھیں۔
''خواب میں دیکھا ہے اور اسے مارنے آئی ہو خواب میں کیا دیکھا ہے تم نے؟''
''اس نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے سکھی، یہ ماں کو بہکاوے دیتی ہے۔'' تھپٹر دوبارہ پڑا تو امر پیچھے ہٹی اور سکھی بیچ میں آ گئی۔
''ہوش میں تو ہو تم یہ کر کیا رہی ہو، خواب میں ایسا کیا ہوا ہے آخر؟''
''خواب میں، میں نے اسے جھوٹی کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔'' وہ جیسے آنکھوں سے انگارے اگل رہی تھیں۔
''پھر اسے سو مارو۔'' سکھی بیچ میں سے ہٹ گئی اور امر کلہ کی آنکھوں سے دو چار اشک ایک دوسرے کے پیچھے بے قرار ہو کر بہہ گئے۔
''اسے سو مارو، دو نہیں۔'' سکھی نے بات دہرائی، امر کلہ نے بے بسی سے اسے دیکھا، اس کی آنکھوں کے آگے جھلمل تھی پانیوں کی۔

☆☆☆

میز کے عین سامنے یہ بڑی سی کھڑکی تھی اور لوکیشن دیکھنے لائق یہ گاڑیوں انسانوں دوکانوں

دفتروں سے بھری ہوئی آباد پر رونق سڑک تھی، تو اس کا سالوں کا خواب پورا ہونے لگا تھا، آج پرچے کے لئے پہلا مواد موصول ہوا تھا، علی گوہر کاغذوں کے لفافے لے آیا تھا اور اس نے یہ ڈھیر میز پر الٹ دیا تھا۔

''تو کرو اب امرت بی بی اپنے سارے پورے شوق۔'' اس کا لہجہ لاکھ ہشاش سہی مگر چہرہ اپنی داستان خود سناتا تھا۔

''عمارہ کا فون آیا تھا؟'' اس نے اندازہ لگانا چاہا۔

''نہیں، اس کے پاس وقت ہے مگر کسی اور کے لئے۔''

''تمہیں اس کا شکوہ ہے گوہر؟''

''نہیں امرت شکوہ کیوں، اسے خوش دیکھ کر دل آباد ہو جاتا ہے۔''

''تو پھر کیا مسئلہ ہے؟''

''کوئی مسئلہ نہیں، میں بے مسائل فکر مند ہوتا ہوں یا پھر میرا چہرہ ہی ایسا ہے۔''

''کل تم نے بہت توجہ سے کام کیا تھا گوہر۔'' وہ کتابوں کے کارٹن اسٹور سے لا رہی تھی، یہ عدنان کے آنے کا وقت تھا، اس سے پہلے وہ اس سے کچھ الگوانا چاہتی تھی۔

گاؤں سے بہت دن بعد واپسی پر ریڈیو جانے کی تو اسے ہمت نہ ہوئی اور جاننے والے نے اپنی بک شاپ کہیں اور منتقل کر دی تھی۔

اس کی ماں صبح سے لوٹنے کے بعد کافی مطمئن تھی اسے شاید امرت پر یقین آ گیا تھا یہ امرت کا خیال تھا، وہ ماں کو عبادت میں مگن دیکھ کر کافی مطمئن ہوتی تھی، یا پھر گھر کے کام کاج میں، وہ تحمل سے جسے ماں کے لہجے میں محسوس کرنے کا اسے سالوں سے ارمان تھا، وہ اب کے بھی کبھار جھلکتا تھا۔

فنکار گاؤں کا ہو کر رہ گیا تھا۔

عمارہ اور لاھوت کا نکاح بھی شاید آسمانوں پر لکھا ہوا تھا سو چالیسویں کے فوراً بعد ایسی صورتحال بن گئی تھی۔

''عمارہ نے خود کہا کہ امرت میں راضی ہوں، تم لاھوت سے بات کر لو۔''

بوڑھے ماں باپ کی پریشانیوں کو برداشت کرنے کی حد جیسے ختم تھی اور گوہر کی بگڑتی ہوئی حالت بکھرتی ہوئی پریشانی کا سبب بھی کبھار وہ خود کو بھی سمجھتی تھی۔

نکاح کے بعد بڑی حویلی میں رخصت ہو کر جاتے وقت وہ خوش تھی، لاھوت سیدھا سا نیک نیت انسان تھا، بس تنگ بہت کرتا تھا اسے، زیادہ تر شہر رہتا تھا دیر دیر سے لوٹتا تھا اور ساس کی تنہائی کی وجہ سے عمارہ کو گاؤں میں ہی رکنا ہوتا تھا۔

وہ دونوں سیٹ تھے، کبھی شکایت کبھی شرارت، عدنان نے پرچے کے لئے امرت کو اچھی خاصی رقم قرضے پر دی تھی، مگر اس نے دل ہی دل میں سوچا تھا اگر پرچہ نہ چل سکا، سرمایہ ڈوب گیا تو وہ امرت سے ایک پائی بھی واپس نہیں لے گا، مگر امرت نے بھی سوچ کر رکھا تھا کہ اسے آہستہ آہستہ رقم کیسے لوٹانی ہے۔

اس نے سنا تھا حنان کی شادی ہو گئی ہے، اسے دلی طور پہ سکون محسوس ہوا تھا کہ چلو کوئی اپنی زندگی میں سیٹ ہوا۔

اپنا سوچتے ہوئے اسے اس سے کوئی بھی ہمدردی نہیں ہونی چاہیے تھی مگر خود اس کا رویہ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے ایک دوبار فکر ہوئی تھی، کچھ لوگ دوسروں سے زیادہ خود کو نقصان پہنچاتے ہیں اپنی حرکتوں سے۔

اس کی بیوی اس نے دیکھی تھی وہ بھی اس کی طرح سونے پہ سہاگہ تھی ثریا نام تھا، کام کی تو بہت تیز تھی، خصوصاً زبان کے کام کی، اس نے پہلی ملاقات جو اتفاقیہ تھی اس میں جو ہر ملاحظہ کر لئے تھے، کسی کی تقریب ولیمہ کے گیسٹ پر اسے حنان لینے آیا تھا اور اسے دیکھ کر بوکھلا سا گیا تھا، وہ ایک ہمدردانہ مسکراہٹ دے کر عمارہ کی گھورتی ہوئی آنکھوں کے اثر میں گاڑی تک آئی اور پھر آدھے گھنٹے تک اس کی ڈانٹ کھاتی رہی تھی اور لاھوت ہنستا رہا تھا۔

آج بھی اتفاقی طور پہ اس کا سامنا حنان سے ہوا جب وہ گوہر کے ساتھ آ رہی تھی، گوہر تو خود میں کھویا تھا اور ابھی تک یہی حال تھا۔

''گوہر دو چیزیں انسان کے ساتھ سفر کرتی ہیں۔'' وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی، علی گوہر لفافے چاک کر رہا تھا۔

''خدا کی نظر اور اس کا رحم، دیکھو ایک صفت قہر کی بھی ہے مگر صرف دو، قہار اور جبار، پر پتہ ہے سب سے زیادہ رحیم کی صفت اثر انداز ہوتی ہے۔''

''تمہیں یہ کیوں لگتا ہے امرت کے خدا کے بارے میں تمہارے سوا ہر کسی کچھ غلط نظریات لاحق ہیں۔''

''ہر دفعہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کو کوئی معلم اعلیٰ ملے سمجھانے کے لئے۔'' امرت بھی اپنے نام کی ایک تھی۔

''تو تم معلمہ بن جاؤ، دیکھو امرت تم ان پرچوں ورچوں کے جھنجھٹ سے نکلو درس دینا شروع کر دو۔'' اس کے لہجے کی جھلاہٹ پہ وہ ہنس پڑی تھی۔

''تمہیں یاد ہے تم سے کسی نے کہا تھا کہ پہلے خود کو ڈھونڈو اور اگر یہ بھی یاد ہو گا کہ تم نے کہا تھا کہ میں نے خود کو بہت سی جگہوں پر کھویا ہے، کہاں کہاں سے ڈھونڈوں، کہاں تلاش کروں گا، سمیٹوں گا، بہت سی جگہوں پر خود کو کھویا ہے۔''

''تم وہ سب کیوں یاد دلا رہی ہو مجھے، کیوں بار بار وہ دھن بجا کر میرے احساسوں کو چھیڑ دیتی ہو امرت۔'' یہ شکوہ تھا مگر میٹھا، دھیما۔

''گوہر روحانیت اور اس کی ضرورتیں ہم سے الگ نہیں ہیں، ہم اپنی پوری فطرت کے ساتھ سفر کرتے ہیں، مجھے لگتا ہے کسی حادثے میں ٹھہر گئے ہو، تم کہیں رکے ہو، گوہر ہم سب کسی نہ کسی حادثے میں رکے ہوئے ہیں ٹھہرے ہوئے ہیں، ہم سفر نہیں کر پاتے ہم رکے ہوئے ہیں، میں تمہیں یہ نہیں کہہ رہی کہ وطن چھوڑ دو، میں کہہ رہی ہوں سلسلے کو آگے بڑھاؤ۔'' وہ لفافے چھوڑ چکا تھا۔

''تم نے اور امر کلہ نے بہت سفر کیا ہے۔''

''ہم سب نے بلکہ اور ہمارے ذہن و دل کہیں ایک جگہ کسی واقعے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔''
گوہر نے اس کی طرف بہت سنجیدگی سے دیکھا تھا اور کچھ کہنا چاہا تھا مگر اسی وقت دروازہ کھلا، ھالار بے ترتیب حالوں میں آگے آیا۔

''چاہتی کیا ہو تم آخر؟ مر جائے میرا باپ؟ جان سے جائے؟ یہی نا۔''

''تم ہر روز ایک نیا تماشہ لے کر کیوں آ جاتے ہو ھالی؟'' گوہر کو پہلا تماشہ ابھی یاد تھا۔
وہ امر کلہ اور اس کے بارے میں تھا اور یہ تماشا وہ باپ کا لیبل چسپاں کر کے کرنے آیا تھا زبان سے۔

''تم پیچھے ہٹ جاؤ، مجھے بات کرنے دو اس سے۔'' وہ گوہر سے مخاطب تھا۔

''اسے کہنے دو ابھی اس کے اندر میرے لئے بغض باقی ہے یہ بغض نہیں ہے سچ ہے، ایک کھرا سچ، میرا باپ، دیکھو امرت میرا باپ بہت برے حالوں سے اس کوٹھڑی میں پڑا ہوا ہے، اس کا ذمہ دار کون ہے کہ وہ میرے ساتھ نہیں آ رہا۔'' وہ میز پہ عاجزانہ جھک گیا تھا، دوسرے لمحے یہ پہلے والا ھالار تھا۔

''میں کیا کروں ھالار اس کے بارے میں؟''

''جاؤ، میرے باپ کو وہاں سے لاؤ۔''
وہ کہنا چاہتی تھی کہ میرا ابھی باپ ہے مگر نہیں کہہ سکی، کچھ رشتوں کا زبانی اقرار بہت مشکل ہوتا ہے۔

''ھالی میری بات سنو، میں نہیں جا سکتی، ابھی نہیں بہت کام ہے میرے سر پہ ابھی۔''

''تمہیں کاموں کی پڑی ہے اور ایک زندہ انسان مر رہا ہے۔'' وہ چلایا تھا۔

''وہ نہیں مریں گے بے فکر ہو جاؤ تم۔''

''کیوں؟ انہوں نے آب حیات پیا ہے اور وہ تم نے پلایا ہوگا۔'' اس کا چہرہ غصے سے سرخ تھا، وہ اپنی مجبوری کی خاطر پل پل بدل رہا تھا۔

''اپنے ذاتی مفاد کے لئے لوگوں کو اُلو کا پٹھا بنانا چھوڑ دو، خود جاؤ اور جا کر لے آؤ، میں کس رشتے اور کس منہ سے کس حق سے جا کر لے آؤں گی، مجھے تمہارے باپ نے کوئی ایسا حق نہیں دیا ہوا۔'' تمہارا باپ کہتے ہوئے اسے کتنی تکلیف ہوئی تھی یہ وہ خود ہی جانتی تھی، ھالار نے شکستگی سے اسے دیکھا تھا۔

''تم نے مجھے زندگی میں ہمیشہ مایوس کیا تھا، کیا ہے، مجھے تم سے کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے تھی۔'' اس نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا جس میں کئی کاغذات چھپے تھے وہ اسی میز پہ پھینک گیا، وہ اس کی غلطیاں اس کے منہ پہ مار گیا تھا، سیدھے سیدھے اس کے منہ پر مار گیا، اسے ہمت نہ تھی کہ وہ کاغذ چاک کرے اور دیکھے، وہ کیا دیکھتی، وہ دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔

''انسان کی کوتاہیاں غلطیاں بچپنا لاپرواہی میں کیا گیا کوئی بھی کام، اس کے سامنا کرتا ہے ایک دن اسے آئینے میں لا کھڑا کرتا ہے، یا پھر اس کے منہ پہ ایک طمانچہ مار دیتا ہے، اس لمحے میں

انسان کو عزت دار کہلوانے سے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔'' اس کا ڈوب مرنے کو جی چاہا تھا، گوہر نے کاغذوں کا ڈھیر اٹھایا۔

''اس میں کوئی مقدس نام ہو تو اسے نکال دو، باقیوں کو آگ لگانی ہے۔'' وہ لمحے میں جان گیا یہ کام امرت نہیں کر سکتی۔

''اسے میں پانی میں بہا دینا چاہتا ہوں امرت، تمہیں کوئی اعتراض ہے؟'' اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی تھا، وہ جو ایڈیٹر کی کرسی کے سامنے کھڑی ہو کر بولتی تھی، وہ جو کسی کی بات کے جواب میں اٹل ہوتی تھی، ابھی کیسی ڈھیر ہو گئی تھی، گوہر چند لمحے سوچتا رہا پھر جیب میں ڈال دیئے، بلکہ اڑس لئے کاغذ۔

''فکر مت کرنا میں پڑھوں گا نہیں، فرض کرو پڑھ بھی لئے تو تم سے کچھ نہیں کہوں گا، اگر کچھ کہہ دیا تو تم ایک طمانچہ میرے منہ پر مار دینا، پھر اس کے بعد تمہارے سامنے سر اٹھا کر جی نہ سکوں گا اور اگر زندہ رہا تو تمہارے سامنے نہیں آؤں گا، سامنے اگر آ بھی گیا تو سر اٹھا کر نہیں چل سکوں گا، ڈوب مرنے کا مقام ہو گا میرا اور امرت یقین جانو جس دن ڈوب مرنے کا مقام آیا اس دن لمحے کی دیر نہ کروں گا، ڈوب مر کے دکھاؤں گا۔''

''اسے مت پڑھنا گوہر، اگر یہ غلطی کر بیٹھے اگر اسے پڑھ لیا تو مجھ سے نہ پوچھنا، بس یہ پوچھنا کہ امرت کیا تمہیں ھالار سے واقعی محبت ہو گئی تھی۔''

وہ لمحہ نہیں تھا، حیرانی تھی یا بے یقینی یا پھر کوئی یقین کی سمجھ، مگر امرت کی آنکھوں میں پانی تھا۔

علی گوہر کو جب اپنی بے بسی پر رحم آ جاتا تھا یہ تو پھر امرت تھی، مطلب کہ دوست تھی۔

☆☆☆

اس نے کھڑکی سے جالے ہٹا دیئے تھے، وہ کوٹھی کے اندر جیسے بے سدھ پڑے سو رہے تھے، بالکل گہری نیند خراٹوں والی جو زندگی کا ثبوت دیتی تھی، مگر ایک ہلکی سی خراہٹ تھی، کوئی بھنبھناہٹ سی وہ جھک گئی کان کے قریب، ھالار دروازے کے باہر جیسے دم سادھے کھڑا تھا، اس نے جھک کر کان نزدیک کیا مگر اس سے بھی تیز آواز سنائی دی تھی، نیند بہت گہری تھی ان کی مگر ان کے اندر سے حالانکہ ہونٹ بھینچے ہوئے تھے، مگر اللہ ہو کے ورد کی آواز ان کے اندر سے آ رہی تھی، اس نے چونک کر ھالار کو دیکھا اور ھالار نے اسے یہ نفس کی ہو، نہیں نفی نفس کی ہے، وہ بوکھلائی، پھر سیدھی ہوئی، جز اور کل کے فلسفے کا سوال سر اٹھا کر ایک بار پھر سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔

(جاری ہے)

☆☆☆

سوتن اور سہیلی
عابی ناز

ریڈ کور والی خوبصورت نقش و نگار سے مزین ڈائری اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین بوس ہوئی، دعا کا پورا وجود اس وقت زلزلوں کی زد میں تھا، دل پاتال کی گہرائیوں میں ڈوب چکا تھا تو ذہن لامحدود خلاؤں میں گھوم رہا تھا، چند ساعتوں کے بعد اس کا سکتہ ٹوٹا تو اس نے بے یقینی سے ریڈ منقش ڈائری کو دیکھا جو اس کی عزیز از جان دوست حیا سبحانی کی تھی اور پھر اسے اٹھا کر اپنی گود میں رکھ دیا۔

''آخر میں اتنی لاعلم کیسے ہو سکتی ہوں؟'' ایک ہی سوال کی بازگشت دماغ کی وادیوں میں گردش کرنے لگی تو اس نے گھبرا کر ایک بار پھر ورق گردانی شروع کی۔

''میں حیا سبحانی اپنی دوستی پر محبت کو قربان کرتی ہوں، میں دعا بخاری کو اذہان علوی پر ترجیح دیتے ہوئے اپنی محبت کو اسی ڈائری کی قبر میں ہمیشہ کے لئے دفن کرتی ہوں۔'' الفاظ تھے یا کوئی سرسراتے ناگ؟ دعا نے ہاتھ میں پکڑا کشن ڈائری کے صفحات پر رکھ کر گویا اس تلخ حقیقت کی نفی کی اور سر صوفے کی پشت سے ٹکا کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

تھوڑی دیر بعد ماضی کا دھندلا عکس جو ذہن کے پردے پر جھلملایا تو دھیرے دھیرے سب کچھ صاف دکھائی دینے لگا۔

☆☆☆

''ارے یار وہ لڑکا کوئی عام لڑکا نہیں تھا شہزادہ تھا یا کوئی راج کمار، کسی سلطنت کا بادشاہ ہو جیسے یا پھر کسی فلم کا ہیرو، ارے ہاں یاد آیا وہ مووی ہے ناں ٹوائیلائیٹ اس کے ہیرو ایڈورڈ جیسا تھا وہ۔'' اس نے پھر سے اس کی قصیدہ گوئی شروع کی تو دعا نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے۔

''خدا کے لئے حیا چھوڑ بھی دو اپنے اس ایڈورڈ کا ٹاپک اور خیال جس کا تمہیں نام پتہ تک بھی معلوم نہیں، پچھلے تین گھنٹے سے ایک ہی شخص کی تعریف کر کر کے سر کھا چکی ہو تم میرا لیکن کیا فائدہ ہوا؟ اگر تمہیں اس کا کچھ نام پتہ معلوم ہوتا تو میں کچھ ہیلپ بھی کرتی تمہاری۔'' اس کی بات پر حیا کا سارا جوش جھاگ کی مانند بجھ گیا۔

''لیں یو آر رائٹ۔'' چند لمحے سوچنے کے بعد وہ پھر چہکی۔

''بٹ میڈم ہیلپ تو ابھی بھی کرنی پڑے گی تمہیں میری۔'' اس کی بات پر دعا نے استفہامیہ نظروں سے اسے گھورا تو حیاء نے مصنوعی باچھیں کھلائیں اور بولی۔

''صبح سونیا کے ولیمے کی تقریب ہے وہیں اس ایڈورڈ کا بائیو ڈیٹا بھی ملے گا اور بذات خود ایڈورڈ بھی بس تمہیں کل میرے ساتھ چلنا ہے اور ماما سے پرمیشن لینے کی ذمہ داری بھی آپ کی۔'' سارا بوجھ دعا کے ناتوان کندھوں پر لاد کر وہ خود ہاتھ جوڑنے لگی۔

''ایکسکیوزمی مس حیا سبحانی! یونو کل میرا ٹیسٹ ہے اور میں کہیں جانے والی نہیں۔'' ایک ہی جھٹکے میں وہ سارا نادیدہ بوجھ دھڑام سے زمین پر آ گرا۔

''ارے کیسی سیلفش دوست ہو تم یار؟ دوستی کا نہ سہی ہماری رشتہ داری کا ہی لحاظ کر لو، مجھ پر کڑا وقت آن پڑا ہے تو تم اتنا سا کام بھی نہیں کر سکتی میرا؟'' حیا ایموشنلی بلیک میلنگ پر اترتے ہوئے اسے شرم دلانے لگی اور پھر ایک لمبی بحث و تکرار کے بعد وہ دونوں ولیمے کی تقریب کی تیاریوں میں مصروف ہوئیں۔

حیا اور دعا نہ صرف خالہ زاد کزنز بلکہ بہت اچھی دوست بھی تھیں، دعا بچپن سے ہی اپنی پڑھائی کے سلسلے میں اسلام آباد خالہ کے ہاں

ٹھہری ہوئی تھی اور اسی عرصے میں ان دونوں کی مثالی دوستی باقی ہر رشتے کو مات دے گئی تھی ہر جگہ ہر وقت اور ہر میدان و امتحان میں وہ دونوں ایک دوسرے کی جان تھیں، دعا نے خالہ جانی سے ولیمے کی تقریب میں جانے کی اجازت طلب کی تو انہوں نے بخوشی انہیں ساتھ لے جانے پر آمادگی ظاہر کی وہ تو پہلے بھی یہی چاہتی تھیں، لیکن حیا اور دعا ہی ہر فنکشن یا پارٹی میں جانے سے انکار کر دیتی تھیں، انہیں خاندان والوں سے مراسم بڑھانے کے بجائے سٹڈی کمپٹیشن میں نمبر بڑھانے کی فکر زیادہ رہتی تھی مگر اس بار معاملہ کچھ اور ہی تھا۔

☆☆☆

''بس کر دے میری ماں، تیرا ایڈورڈ تو پتہ نہیں ملے گا یا نہیں لیکن میری چٹنی ضرور بن جائے گی ساڑھے چار انچ کی ہائی ہیل کے ساتھ اتنے بڑے ہال کے چکر لگا لگا کر ٹانگیں شل ہو چکی ہیں۔'' ٹیبل کے پاس رکھی چیئرز میں سے ریک پر وہ ہاتھ پیر چھوڑ کر ڈھے چکی تھی۔

''تو تجھے کس پاگل نے کہا تھا اتنی ہائی ہیل پہننے کو؟ تجھے پتہ تھا ناں کہ یہاں اس کو ڈھونڈنے کے لئے آئے ہیں ہم؟'' ایک تو اس ایڈورڈ کے نہ ملنے کا قلق اوپر سے دعا کی ازلی سستی حیا کو جھلاہٹ نے گھیر لیا۔

''او میڈم اس رانجھے بلکہ سوری اس ایڈورڈ کو ڈھونڈنے کے لئے ''ہم'' نہیں ''صرف تم'' آئی ہو میں تو بس اس کو دیکھ کر جج کروں گی کہ آیا وہ تمہارے لائق ہے بھی یا نہیں؟'' دعا کے صاف دامن بچا کر جھنڈی دکھانے پر حیا نے تلملاتے ہوئے اسے وران کیا۔

''دیکھ لوں گی میں تجھے بے وفا لڑکی۔''

''اجی فی الحال تو آپ اپنے ایڈورڈ کو دیکھیے، ہمیں دیکھنے کا شوق فارغ وقت میں پورا کر لیجئے گا پلیز۔'' دعا نے بڑے اطمینان کے ساتھ بتیسی دکھائی تو حیا کا پارہ اور بھی ہائی ہونے لگا مگر اس وقت دعا کی خبر لینے سے زیادہ اہم کام اس لڑکے کی تلاش تھی پورے ہال میں نظریں گھماتے ہوئے وہ زیر لب بڑبڑائی۔

''خیر اسے تو میں ڈھونڈ کے ہی رہوں گی چاہے کچھ بھی ہو جائے۔'' چند لمحے کے توقف کے بعد وہ ایک بار پھر اس کی کھوج میں پورے ہال کا دورہ کرنے کے لئے جا چکی تھی جبکہ پیچھے دعا یہ سوچنے پر مجبور ہوئی کہ آخر ایسا کیا تھا اس لڑکے میں جو حیا سبحانی جیسی خوبصورت اور باوقار لڑکی اس سے دوبارہ ملنے کو اتنی بے تاب ہوئی جا رہی تھی، شادی چونکہ ان کے ننھیال والوں میں تھی اس لئے دعا کی پوری فیملی نے بھی شرکت کی، ولیمے کی تقریب اختتام پذیر ہو چکی تھی لیکن انہیں وہ لڑکا ملنا تھا نہ ملا، حیا کی بے چینی و اضطراب کے ساتھ ساتھ دعا کا شوق اور تجسس بھی دھرے کا دھرا رہ گیا۔

☆☆☆

اگلے چند ماہ میں دعا ایم ایس سی کے فائنل ایگزامز کے بعد فیصل آباد اپنی فیملی کے پاس لوٹ آئی، مگر ان دونوں کا ٹیلی فونک رابطہ ہر لمحہ اس طرح بحال رہا گویا میلوں کی دوری نے ان کے رشتے اور رابطے پر رتی برابر بھی اثر نہ کیا ہو، اسی دوران دعا کے لئے ماما اور خالہ جانی کے توسط سے ان کے ننھیال والوں میں سے ایک لڑکا پسند کر لیا گیا تھا اور بات بھی پکی ہو گئی تھی لیکن باقاعدہ منگنی کی رسم دعا کے پاپا کی لندن سے واپسی پر ہی ہونی تھی جبکہ حیا کو ابھی تک اپنے اس ایڈورڈ کی تلاش تھی، جس سے دوبارہ ملاقات کی امید اور خواہش ابھی تک ماند نہ پڑی تھی۔

☆☆☆

''مائی ڈیئر بیلاتم مان کیوں نہیں لیتی کہ اب وہ ایڈورڈ تمہیں نہیں مل سکتا، آخر چھ سات ماہ کافی ہوتے ہیں کسی کی تلاش و بسیار کے لئے، میری مانو تو بھول جاؤ اسے اور میری طرح تم بھی چپ چاپ کسی ''شریف'' لڑکے کے ساتھ منگنی کر والو۔'' ہر بار کی طرح دعا نے اس بار بھی اس سمجھانے اور چھیڑنے کی ذمہ داری نبھائی۔

''تمہاری طرح بنا دیکھے بنا جانے شادی کروانے کے لئے تیار ہو جاؤں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، میں تو شادی اسی سے کروں گی جسے میں نے پسند کیا ہے اور اپنی پسند کو میں چھوڑنے والی نہیں ہوں۔'' حیا کا ہمیشہ کی طرح وہی پرعزم مگر ضدی لہجہ تھا، ہر دفعہ ان کے کانٹیکٹ پر اس کا ذکر اور پھر اپنے اپنے تبصرے اور نوک جھونک معمول کی بات تھی۔

''پسند ناپسند کو گولی مار دیار، مجھے تو اسی بات کی بے حد خوشی بھی ہے اور تسلی بھی کہ میں شادی کے بعد تمہارے شہر میں آ جاؤں گی تمہارے پاس۔'' دعا کی متوقع منگنی اسلام آباد میں ہی ہوئی تھی اور یہ بات اس کے لئے دلی خوشی کا باعث تھی۔

''ہاں میں تو جیسے تب تک یہیں بیٹھی رہوں گی ناں، تم شادی کروا کے اسلام آباد آ جاؤ گی تو کیا گارنٹی ہے کہ میں شادی کے بعد کسی اور جگہ نہیں جاؤں گی؟ کیا پتہ وہ ایڈورڈ کس ایریے میں رہتا ہے۔'' حیا نے پتے کی بات کہی تھی لیکن اس کا میسج پڑھ کر دعا یکدم اداس ہو گئی۔

''تو کیا ہم شادی کے بعد اس طرح نہیں رہیں گے۔'' اس نے مایوسی سے ٹائپ کر کے بھیجا۔

''رہ سکتے ہیں کیوں نہیں رہ سکتے میری جان، اگر ایڈورڈ مل گیا تو ہم دونوں اسی کے ساتھ شادی کروا لیں گی اور اگر وہ نہ ملا تو پھر تمہیں اپنے شوہر کا آدھا حصہ مجھے دینا پڑے گا، اس صورت میں ہمیں کوئی الگ نہیں کر سکے گا کبھی بھی۔'' حیا کا ریپلائی اور اینڈ پر ایک عدد کارٹون کی مزاحیہ پکچر موصول ہوئی تو دعا نے بے ساختہ قہقہے کے ساتھ اسے ہزاروں کوسنے سنا دیئے۔

☆☆☆

''دعا...... دعا......دعا...... دعا...... دعا۔''

کال پک کرتے ہی حیا کی چیخ سے مشابہہ آواز کان میں پڑی۔

''ارے کیا ہو گیا؟ کیوں میرے نام کا ورد کر رہی ہو پہلی بار لینا سیکھا ہے کیا؟'' دعا نے اس کی خوشی بھانپ لی تھی مگر اس کی ایک ہی تکرار پر مصنوعی خفگی سے لتاڑا۔

''بات ہی کچھ ایسی ہے یار، میں خوشی سے پاگل ہو رہی ہوں تم سنو گی تو شاکڈ رہ جاؤ گی۔'' حیا چلائی۔

''بھئی ہوا کیا ہے؟'' دعا نے حیرت سے دریافت کیا۔

''مجھے میرا وہ ایڈورڈ مل گیا دعا میں نے تمہیں کہا تھا ناں کہ میں اسے ضرور ڈھونڈ نکالوں گی، میری دعائیں قبول ہو گئیں، میں جیت گئی دعا، میری محبت سچی اور کامل تھی اسی لئے اللہ نے مجھے وہ عطا کر دیا جو میں چاہتی تھی وہ مجھے مل گیا۔'' دعا اندازہ کر سکتی تھی کہ اس وقت حیا کی حالت کیا ہو رہی ہو گی، اس کے لہجے کا جوش اور انداز بتا رہا تھا کہ اس کا انگ انگ خوشی سے جھوم رہا ہو گا۔

''ان بلیوایبل یار، کہاں ملا وہ تجھے اور کیسے؟'' دعا کے اندر بھی خوشی کی لہر پھوٹی تھی گویا۔

''پچھلے دنوں میں نے جو کمپیوٹر کلاسز شروع

کی ہیں ناں، اس نے بھی وہ کلاسز جوائن کی ہیں، آج پہلے دن آیا تھا وہ۔'' وہ دبے دبے پر جوش لہجے میں اسے پوری تفصیل سنانے لگی۔

''اچھا اب تو نام پتہ پوچھ لیا ناں تو نے اس کا؟ مبادا وہ پھر سے گم ہو جائے۔'' دعا نے شریر انداز میں اس چھیڑا۔

''اس کا نام جو بھی ہو میں تو اسے ایڈورڈ ہی بلاؤں گی اور رہی ایڈریس کی بات تو وہ بھی پوچھ لیں گے فی الحال تو اتنا ہی پتہ چل سکا ہے کہ وہ یہاں اسلام آباد میں ہی رہتا ہے۔'' ہنستے ہوئے اس نے اپنی بات مکمل کی تو دعا نے بے اختیار ہرہراہ کا نعرہ لگایا۔

،کل ہی بھائی تمہیں لینے کے لئے پہنچ جائے گا اور ہاں آتے ہوئے اپنے ہونے والے منگیتر موصوف کی تصویر بلکہ تصاویر لانا ہرگز مت بھولنا، آخر ہم بھی تو انہیں دیکھ کر جج کریں گے کہ وہ محترم بھی ہماری پیاری دوست کے قابل ہیں یا نہیں۔'' نان سٹاپ بولتی ہوئی حیا نے اس کوئی ہدایات دینے کے بعد خالہ جان سے بات کی اور ان سے دعا کے آنے کی بابت اجازت لے کر فون بند کر دیا۔

☆☆☆

''ازہان علوی، ازہان علوی نام ہے اس کا۔'' دعا نے وہاں پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد حیا کے اصرار پر اپنے متوقع منگیتر کی تصویر دکھاتے ہوئے نام بتایا تھا، اس کے تاثرات اور کیفیت وہ اس وقت تو سمجھ نہیں پائی تھی لیکن آج جب کہ وہ ریڈ کور والی منقش ڈائری اس کے سامنے موجود تھی تو ہر حقیقت آشکار ہو گئی تھی، آنسوؤں کی لڑیاں اس کے رخساروں پر بہہ رہی تھیں اور ماضی کی کڑیاں ملتی جا رہی تھیں۔

کیسے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ بنا کر اس دن حیا نہ خود کالج گئی اور نہ دعا کو اس ایڈورڈ سے ملوایا، جو در حقیقت دعا کا ہونے والا منگیتر ازہان علوی ہی تھا اور پھر آہستہ آہستہ سچ مچ اس کی حالت بگڑتی چلی گئی تھی دعا پورا ہفتہ وہاں رہی مگر اس کی طبیعت بحال نہ ہو سکی یہاں تک کہ نعیم بخاری (دعا کے پاپا) لندن سے واپس آ گئے اور یوں ازہان علوی اور دعا بخاری کو ایک دوجے کے نام کر دیا گیا اس روز کے بعد اس نے لاکھ بار حیا سے ایڈورڈ کو پوچھا مگر اس نے کہا کہ وہ کالج چھوڑ گیا ہے اور پھر چند دن بعد خود حیا نے بھی وہ کالج چھوڑ دیا۔

تب احساس کیوں نہیں ہو سکا مجھے؟ میں جو اس کی ہر بات بنا کہے بھی جان لیتی تھی اپنی منگنی کے روز اس کی نگاہوں کی حسرت اور چہرے کی اداسی و کرب کو اپنے بچھڑنے کا غم کیوں سمجھ بیٹھی تھی؟ اس نے آہستگی سے درد سے پھٹتے ہوئے سر کو صوفے کی پشت پر مارا۔

''نہیں یہ میری دوست نہیں ہو سکتی، وہ میرے ازہان کو چاہتی رہی اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی اور میں......'' جذبہ رقابت عود کر آیا تو اسے ہر اس لمحے میں اپنی بے وقوفی اور نادانی نظر آنے لگی کہ جب جب ازہان اور حیا کا سامنا ہوا تھا، نجانے کیوں یکدم کمرے میں حبس اور گھٹن کا احساس بڑھنے لگا تو اس نے لمبی لمبی سانسیں بھرتے ہوئے اپنے اندر کے غبار کو کم کرنا چاہا، اسی کوشش میں اس نے دوپٹہ اتار کر ایک طرف ڈال دیا اور خود پھر ڈائری کی طرف متوجہ ہوئی۔

''کل دعا کی مہندی کی رسم ہو گی اسی ایڈورڈ سوری ازہان علوی کے ساتھ جسے میں نے روح کی گہرائیوں سے چاہا تھا، جسے میں نے دعا کے لاکھ کہنے پر بھی نہیں بھلایا تھا، لیکن قسمت کا کھیل

ہے کہ آج اسی دعا بخاری کی خاطر میں اپنے ایڈورڈ کو بھولنا چاہ رہی ہوں۔''

اذہان علوی کبھی میرا تھا ہی نہیں، وہ صرف دعا کا تھا، ہے اور اسی کا رہے گا، میرا ایڈورڈ تو مجھ سے اسی روز بچھڑ گیا تھا جب میں نے دعا کے منگیتر کو دیکھا تھا، یہ سچ ہے کہ میں نے اس سے بے پناہ عشق کیا ہے مگر میرا عشق پاکیزہ جذبہ تھا، جواب دعا کے حوالے سے اور بھی محترم ہو گیا ہے، میں اعتراف کرتی ہوں کہ حیا سبحانی ان دونوں سے ہار گئی ہے، مگر میں پھر بھی خوش ہوں اور بے حد مطمئن بھی، کیونکہ جیت میری دوستی کی ہوئی ہے اور میری محبت کی، وہ سکون اور طمانیت مجھے اذہان علوی کو دعا سے چھین کر بھی نہیں مل سکتا تھا جو مجھے اس وقت میسر ہے، ان دونوں کی خوشی اور ان دونوں خاندانوں کی خوشی ہی دراصل میری خوشی بھی ہے اور خوش قسمتی بھی کہ اللہ نے مجھے اتنی بڑی آزمائش میں سرخرو کر دیا ہے۔

جیسے جیسے وہ ڈائری پڑھتی جا رہی تھی اندر کا غبار چھٹتا جا رہا تھا، اذہان کے ساتھ اس کی شادی اور ان دونوں کے ساتھ حیا کا نارمل اور دوستانہ رویہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ ان دونوں کے رشتے کو دل سے تسلیم کر چکی تھی اور یہ اس کے اس رویے کا ہی اثر تھا کہ شادی کے چھ ماہ بعد تک بھی دعا کو کبھی گمان بھی نہ گزرا تھا کہ اذہان ہی حیا کا ایڈورڈ تھا، اگر آج وہ حیا سے ملنے نہ آتی اور اس کی غیر موجودگی میں بوریت سے بچنے کی خاطر ریڈ کور کی وہ ڈائری نہ اٹھاتی، جو حیا شاید مارکیٹ جاتے ہوئے دراز میں رکھنا بھول گئی تھی تو وہ اس راز کو کبھی نہ جان سکتی، خالہ جانی پچھلے کئی دنوں سے اسے کالز کر رہی تھیں کہ وہ شادی کے لئے حیا کو راضی کرے، مگر اسے وقت ہی نہ مل پا رہا تھا، آج اذہان آفس جاتے ہوئے اسے ڈراپ کر گیا تھا لیکن حیا گھر پر نہیں تھی اور اس کی اتنی غیر موجودگی نے اسے بہت بڑی حقیقت سے آشنا کیا تھا، اس نے آہستگی سے اپنے آنسو صاف کیے اور پاس پڑا دوپٹہ اٹھا کر شانوں پر درست کیا۔

اس نے ڈائری کو اٹھایا اور سینے سے لگا لیا جس کی ہر تحریر نے ان تمام غلط فہمیوں کو دور کر دیا تھا جو لاشعوری طور پر اس کو حیا سے ہو گئی تھیں، وہ اس کی ایسی دوست تھی جس نے صحیح معنوں میں دوستی کا حق ادا کر دیا تھا، لیکن اب یہ حق دعا کو ادا کرنا تا، ایک ذمہ داری وہ تھی جو خالہ جانی نے اس پر حیا کو شادی کے لئے رضا مند کرنے کی سونپی تھی، ایک ذمہ داری وہ تھی جو حیا نے بہت عرصہ قبل اس پر ڈالی تھی ایڈورڈ سے ملنے کے بعد اس کے ماما پاپا کو اس رشتے کے لئے راضی کرنے کی اور ایک ذمہ داری وہ تھی جواب اس نے سچ جاننے کے بعد خود اپنے آپ پر عائد کی تھی جوان سب کو منانے کے بعد حیا کی شادی ایڈورڈ سے کروا کر اسے اس کا پیار لوٹانے کی تھی۔

بنا مجبوری کے اپنے آپ پر سوتن مسلط کرنا بلاشبہ بہت جانکاہ اور تکلیف دہ مرحلہ ہوتا ہے اور بالیقین بہت سی عورتوں کی نظر میں حماقت کا بھی لیکن اگر حیا سبحانی اپنا ایڈورڈ دعا کو سونپ سکتی ہے تو دعا بخاری اپنا شوہر اس کے ساتھ شیئر کر کے اس کا پیار واپس کیوں نہیں دلا سکتی؟

اس نے حیا کو ویٹنگ کا میسج ٹائپ کر کے بھیجا اور خود مسکراتے ہوئے اس کے پرجوش استقبال کی تیاری کے لئے چل دی، وہ جانتی تھی کہ سب کو اس رشتے کے لئے کیسے راضی کرنا ہے بدگمانی اور رقابت کے بادل گرج برس کر رخصت ہو چکے تھے اور چہار سو زندگی مسکرانے لگی تھی، جہاں روشن مستقبل ان کا منتظر تھا۔

☆☆☆

شرک کا عذاب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''جس شخص کو دوزخ میں سب سے ہلکا عذاب ہوگا اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا، اگر تیرے پاس اس وقت زمین بھر کا مال ہو تو اس کو دے کر تو اپنے آپ کو چھڑانا چاہے گا۔''
وہ کہے گا۔
''یقیناً۔''
اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔
''میں نے تو اس سے بہت ہی آسان بات تجھ سے چاہی تھی، جب تو آدم کی پشت میں تھا یعنی میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا تو نے نہ مانا اور شرک ہی پر اڑا رہا۔'' (بخاری شریف)

سارا حیدر، ساہیوال

تلاش

ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا۔
''میں نے چھ چیزوں کو چھ چیزوں پر چھپا رکھا ہے، لیکن لوگ انہیں غیر محل تلاش کرتے ہیں، اس لئے نہیں پاتے۔''
☆ عزت کو میں نے شب بے داری میں رکھا ہے، مگر لوگ سلاطین کے دربار میں تلاش کرتے ہیں۔
☆ راحت کو میں نے جنت میں چھپا رکھا ہے، لوگ اسے دنیا میں تلاش کرتے ہیں۔
☆ بلندی کو میں نے تواضع اور انکساری میں چھپا رکھا ہے، مگر لوگ اسے غرور میں تلاش کرتے ہیں۔
☆ دعا کی قبولیت کو میں نے لقمہ حلال میں چھپا رکھا ہے، لوگ اسے لقمہ حرام میں تلاش کرتے ہیں۔
☆ تونگری کو میں نے قناعت میں چھپا رکھا ہے، مگر لوگ اسے حرص میں تلاش کرتے ہیں۔
☆ علم کو میں نے سفر و بھوک میں رکھا ہے، مگر لوگ اسے شکم سیری اور کتابوں میں تلاش کرتے ہیں۔

ساجدہ احمد، ملتان

فطرت

ایک دفعہ ایک بزرگ کسی حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے، ایک بچھو بار بار حوض کی طرف جاتا تھا اور وہ بزرگ بار بار اس کا رخ بدل دیتے تھے، ان کے پاس بیٹھے ہوئے ایک مرید نے جب بار بار یہ ہی نظارہ دیکھا تو عرض کیا۔
''اے مرشد صاحب! آپ اس کو اس کے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے، یہ بار بار آپ کو ڈستا ہے اور آپ بار بار اس کے حق میں نیکی کرتے ہیں۔''
بزرگ نے فرمایا۔
''جب یہ کیڑا ہو کر اپنی فطرت سے باز نہیں آتا تو میں انسان ہو کر اپنی فطرت سے کیوں باز آؤں؟''

صفہ خورشید، لاہور

محبت

خلیل جبران کہتا ہے۔

آسمانوں سے ہماری محبت ہمارے دل پر اترتی ہے اور سب کچھ بدل کر رکھ دیتی ہے، ہمارے لئے ہر منظر، ہر موسم اور کیفیت کے معنی بدل دیتی ہے، ایک نیا احساس جگاتی ہے، پھول سے خوش رنگ، مشک اپنی خوشبو سے کچھ اور سوا، سبزہ اور بھی تر واہٹ بخش ہو جاتا ہے، ساون رت کی ٹھنڈی پون اور جھومتی گھٹا، جذبات میں آگ لگا دیتی ہے اور پھر بارش بالکل پاگل کر دیتی ہے، خوش گمانی کی حسین پریاں، ہمیں اپنی نرم گداز بانہوں میں سمیٹ لیتی ہیں اور کبھی ایک نظر عمر بھر کے لئے زندگی بن جائے، لیکن اس کے باوجود اسی کا نام محبت ہے، جہاں سے کائنات شروع ہوتی ہے۔

محبت ایک طلسم کدہ ہے جس میں اگر انسان پھنس جائے تو پھر ساری زندگی رہائی کے لئے تڑپتا ہے اور شہر دل کے موسم بھی عجیب ہوتے ہیں، کبھی تو برسوں نہیں بدلتے اور کبھی لمحوں میں دل کی دنیا بدل دیتے ہیں، محبت ایسی ہی ہوتی ہے امبر کی طرح دل پر چھا جاتی ہے۔

عابدہ حیدر، بہاول نگر

اداشناس

اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں ایک دفعہ مشہور ہو گیا کہ آپ دکن پر حملہ کرنے والے ہیں، اگرچہ آپ اس معاملہ کا ارادہ کر چکے تھے، مگر ابھی تک کسی سے اظہار نہیں کیا تھا، حتی کہ معتمد خاص سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا، مگر لوگوں میں اس کی شہرت عام ہو چکی تھی۔

سلطان عالمگیر حیران تھے کہ لوگوں میں یہ خبر کیسے پہنچ گئی، محکمہ خاص کو حکم دیا گیا کہ سراغ لگائیں کہ اس کی ابتدا کہاں سے ہوئی، کھوج لگتے لگتے پتا چلا کہ سب سے پہلے ملازم خاص کی زبان سے یہ بات سنی گئی، اس کو بلا کر پوچھا گیا۔

''کہ تم نے یہ بات کہاں سے سنی؟'' اس نے عرض کی۔

''جہاں پناہ! میری عمر اس خانوادہ کے قدموں میں گزری ہے، غلام اداشناس ہے، ایک صبح حضور کو وضو کروا رہا تھا کہ آپ نے ایک لمحہ توقف فرمایا، دکن کی جانب نگاہ ڈالی اور دست مبارک مونچھوں پر پھیرا، میں سمجھ گیا کہ دکن پر حملہ کرنے کا ارادہ ہے۔''

آصفہ نعیم، فورٹ عباس

دسمبر

دسمبر کی سرد ہواؤں کو
کون بتائے کہ اندر سلگتی ہوئی آگ کو
اس کی برف ہوتی شامیں ٹھنڈا نہیں کر سکتیں
ان کہر آلود راتوں کو کیا پتا کہ
دل کی چوکھٹ سیاہ ہو جانے کے بعد
پھر وہاں سورج نہیں نکلتا

فرینہ اسلم، میاں چنوں

باتوں سے خوشبو آئے

☆ بیٹیاں اور مردہ مچھلیاں اسٹور روم میں غیر معینہ مدت تک رکھنے کی چیزیں نہیں۔ (انگریزی مقولہ)

☆ جو بیٹیوں کا باپ ہے، وہ اک خاندان کا مالک ہے اور جس کے بیٹے ہیں اس کے لئے اجنبیوں کا مجمع انتظار کر رہا ہے۔ (چیکوسلواکیہ کی کہاوت)

☆ جس کی بیٹی کی شادی کسی اچھے آدمی سے ہوتی ہے تو اسے بیٹا مل جاتا ہے، ورنہ وہ بیٹی کو بھی کھو دیتا ہے۔ (کوالز)

☆ بیٹا اس وقت تک بیٹا رہتا ہے جب تک اس کی شادی نہ ہو، لیکن بیٹی تمام عمر کے لئے بیٹی ہوتی ہے۔ (فلر)

☆ بیٹی کی شادی میں سب سے دکھی ہنسی باپ کی

ہوتی ہے۔ (ہومر)
☆ نافرمان بیٹی ناقابل اصلاح بیوی ہوتی ہے۔ (فرینک لن)

مہین آفریدی، ایبٹ آباد

تین اشعار

کاش آزاد قبیلے کے سخن ور ہوتے
ہم محاذوں پہ نہ بکتے تو سکندر ہوتے
خود فریبی کے خرابوں میں رہے ہم ورنہ
اپنی اوقات میں رہتے تو قلندر ہوتے
موج کوثر کی قسم ہم تھے محبت کے ولی
خاک کے در پر نہ جھکتے تو سمندر ہوتے

راحیلہ فیصل، سرگودھا

موتی کی قیمت

ایک بدنام زمانہ شخص علم و دانش کی باتیں کر رہا تھا، لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا اور بولے۔
''بھلا اس کی باتیں کیوں کوئی سنے، یہ تو ایک نہایت برا اور بد قماش شخص ہے۔'' وہیں سقراط بھی موجود تھا، اس نے کہا۔
''لوگو! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ یہ شخص جو قیمتی باتیں کر رہا ہے، اسے غور سے سنو اور ذہن نشین کرلو، کیونکہ اس شخص کی حیثیت غوطہ خور جیسی ہے، غوطہ خور کے ذلیل ہونے سے موتی کی قیمت پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔''

آمنہ خان، راولپنڈی

خاص عنایتیں

اللہ نے اپنے بندوں پر تین خاص عنایات کیں۔
☆ گندم اور اناج میں کیڑے پیدا کر دیے، ورنہ لوگ اسے سونے، چاندی کی طرح ذخیرہ کر لیتے اور لوگ بھوکے مر جاتے۔
☆ موت کے بعد مردے کے جسم میں بدبو پیدا کردی، ورنہ کوئی اپنے پیاروں کو دفن نہ کرتا۔
☆ مصیبت کے بعد اہل خانہ کو صبر وسکون دیا، ورنہ ان کی زندگی کبھی خوش گوار نہ ہوتی۔
تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

صابرہ سلطانہ، کراچی

باتوں سے خوشبو آئے

☆ دکھ انسان کے مرنے کا نہیں ہوتا، بلکہ اپنائیت، محبت اور خلوص کے رشتوں کے ٹوٹ جانے کا ہوتا ہے۔
☆ کوئی گناہ لذت کے لئے مت کرنا، کیونکہ لذت ختم ہو جائے گی، گناہ باقی رہ جائے گا اور کوئی نیکی تکالیف کی وجہ سے مت چھوڑنا کیونکہ تکلیف ختم ہو جائے گی، نیکی باقی رہ جائے گی۔
☆ دوستی، بھروسا، دل، رشتہ، وعدہ، پیار، کبھی مت توڑنا، کیونکہ جب یہ ٹوٹ جاتے ہیں تو آواز نہیں آتی، لیکن درد بہت ہوتا ہے۔
☆ شرم کی کشش حسن سے زیادہ ہوتی ہے۔
☆ اپنے خیالات کو اپنا جیل خانہ نہ بناؤ۔
☆ تاریخ کو یاد رکھنے کی بجائے، تاریخ بنانے کی فکر کرنا چاہیے۔
☆ ناامید شخص ہر اچھا موقع گنوا دیتا ہے اور پر امید شخص پریشانی میں بھی موقع تلاش کر لیتا ہے۔
☆ بے بسی اتنا اداس نہیں کرتی، جتنا بے بسی کا احساس اداسی کر دیتا ہے۔

حنا شاہین، حیدرآباد

بوڑھا سال

یاد ہے میں کیا تھا اب جانے کیا ہو گیا
آئینے میں شکل دیکھے اک زمانہ ہو گیا
ختم ہوئی ڈائری گرتے ہوئے پتے ریاض
آ گیا ماہ دسمبر سال بوڑھا ہو گیا

سدرہ خانم، ملتان

☆☆☆

صائمہ محمود

آمنہ خان: کی ڈائری سے ابن انشاء کی نظم

چل انشا اپنے گاؤں میں
یہاں الجھے الجھے روپ بہت
پر اصلی کم بہروپ بہت
اس پیڑ کے نیچے کیا رکنا
جہاں سائے کم دھوپ بہت
چل انشاء اپنے گاؤں میں!
بیٹھیں گے سکھ کی چھاؤں میں
کیوں تیری آنکھ سوالی ہے
یہاں ہر اک بات نرالی ہے
اس دیس بسیرا مت کرنا
یہاں مفلس ہونا گالی ہے
چل انشا اپنے گاؤں میں
جہاں سچے رشتے یاروں کے
جہاں وعدے پکے پیاروں کے
جہاں سجدہ کرے وفا پاؤں میں
چل انشا اپنے گاؤں میں

صابرہ سلطانہ: کی ڈائری سے ایک غزل

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پہ جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے یہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا
یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

حنا شاہین: کی ڈائری سے ایک خوبصورت نظم

''اسے کہنا''

اسے کہنا دسمبر آ گیا ہے
دسمبر کے گزرتے ہی برس اک اور ماضی کے
گپھا...... میں ڈوب جائے گا
مگر جو خون..... سو جائے گا جسموں میں نہ جاگے
گا
اسے کہنا ہوائیں سرد ہیں اور زندگی کے
کہرے دیواروں میں لرزاں ہیں
اسے کہنا شگوفے ٹہنیوں میں سو گئے ہیں
اور ان پر برف کی چادر بچھی ہوئی ہے
اسے کہنا اگر سورج نہ نکلے گا
تو برف کیسے پگھلے گی
اسے کہنا کہ لوٹ آئے

سدرہ خانم: کی ڈائری سے ایک غزل

دل میں نہ ہو جرأت تو محبت نہیں ملتی
خیرات میں اتنی بڑی دولت نہیں ملتی
کچھ لوگ یوں ہی شہر میں ہم سے بھی خفا ہیں
ہر ایک سے اپنی بھی طبیعت نہیں ملتی
دیکھا تھا جسے میں نے کوئی اور تھا شاید
وہ کون ہے جس سے تری صورت نہیں ملتی
ہنستے ہوئے چہروں سے ہے بازار کی زینت
رونے کی یہاں ویسے بھی فرصت نہیں ملتی
نکلا کرو یہ شمع لئے گھر سے بھی باہر
تنہائی سجانے کو مصیبت نہیں ملتی

آسیہ فرید: کی ڈائری سے ایک غزل

تیرے سینے میں دل اپنا سجا کر کیا کریں گے ہم
تمہیں اپنا بنا کر مسکرا کر کیا کریں گے ہم
کسی ویران بستی میں اگر تنہا ہمیں چھوڑا
نشیمن پھر محبت کا بنا کر کیا کریں گے ہم
جگر میں درد باقی ہے ابھی جب چوٹ کھائی تھی
نئے دکھ اور نئے صدمے اٹھا کر کیا کریں گے ہم
ہمارے درد پر ہمدرد یاروں کو ہوئی خوشیاں
کسی کے درد پر خوشیاں منا کر کیا کریں گے ہم
ہر اک شب اشک بہتے ہیں مگر سنوری نہیں قسمت
تمہاری یاد میں آنسو بہا کر کیا کریں گے ہم
بڑا بے کار ہے جیون ہوا نہ پیار کے قابل
تمہارے واسطے جیون لٹا کر کیا کریں گے ہم
ہر اک چہرہ کسی کے حال کی تصویر ہوتا ہے
برے حالات کے قصے سنا کر کیا کریں گے ہم
میرے ہمدم بڑی ہی سنگدل دنیا ہے کچھ سوچو
تمہیں ہنسنے کی عادت ہے رلا کر کیا کریں گے ہم

مریم انصاری: کی ڈائری سے خوبصورت غزل

راہ عشق میں سفینوں کو جلایا نہیں کرتے
یوں ہی انمول خزینوں کو لٹایا نہیں کرتے
سجدہ ہے اس مسجود و معبود کے لائق
ہر اک کے آگے جبینوں کو جھکایا نہیں کرتے
جانے کس روپ میں رب مل جائے
در پہ آئے گداؤں کو ٹھکرایا نہیں کرتے
پردہ داروں میں لازم ہے پردہ داری
سر بستہ راز سر محفل لایا نہیں کرتے
لگی رہتی ہے در پہ جانے کیوں آنکھیں
جانے والے کبھی لوٹ کے آیا نہیں کرتے
گرد سی جم گئی ہے ہر اک شجر پہ
کسی کے صبر کو یوں آزمایا نہیں کرتے
سنگدل محبوب کہتے پھرتے ہیں گلی گلی
ٹوٹی ہوئی کرچیاں دیواروں پہ سجایا نہیں کرتے

عزہ فیصل: کی ڈائری سے خوبصورت نظم

''ہاں ابھی نہیں''

جذبے زنجیر نہیں ہوتے، سائے تو اسیر نہیں ہوتے
جو منظر ہے، پس منظر ہے، وہ کیوں تصویر نہیں ہوتے
جتنے بھی خیال گزار لیں وہ کیوں تحریر نہیں ہوتے
اب خواب سراب سے لگتے ہیں
دن رات عذاب سے لگتے ہیں
کہیں جلتے بجھتے سائے سے
کہیں ان دیکھے ہمسائے سے
آنگن بازار میں گلیوں میں سب موت کا کھیل اٹھا لائے
کوئی کسی کی فرد جرم لکھے، کوئی کسی کی جیل اٹھا لائے
اک خوف بچھا ہے رستوں میں
بارود چھپا ہے بستوں میں
اب زہر ہے رات کی رانی میں
کہیں آگ لگی ہے پانی میں
تم کہتے ہو تمہیں آن ملے
تمہیں کیسے آن ملے آخر
جو کچھ تھا بے ترتیب ہوا
اس گھر کا حال عجیب ہوا

نور انور: کی ڈائری سے ایک خوبصورت نظم

''کیا اچھا کیا برا''

ٹھہرو!
کچھ پل بھلا کر ان پرانی باتوں کو
جو دوری کا سبب تھیں
دسمبر کی دھوپ میں بیٹھ کر
مل جل کے باتیں خوب کریں
کیا اچھا کیا برا
جنوری کی دہلیز پر
کچھ رنگ زیست کے بکھیریں
فروری میں ان رنگوں کو یکجا ہم کریں
مارچ اپریل میں پرکیف ہواؤں اور بہاروں سے
صبح وشام ہم کریں
مئی جون کی جھلستی اور لو دیتی گرمی کو
امن وسلامتی کے پنکھوں سے کچھ سرد ہم کریں

کیا اچھا کیا برا
اس بات کو بھول کر
جولائی اگست میں محبت کے گیت الاپ کر
ساون کی بھیگی رتوں کا
مسرور و مگن ہو کر استقبال ہم کریں
ستمبر اکتوبر کی خوش کن شاموں کو
اک دوجے کے سنگ خوشنما ہم کریں
اف ہائے اور سی سی میں خوش گزراں ہم کریں
نوز! کیا اچھا کیا برا؟ چھوڑو ان رسمی باتوں کو
آؤ اپنی چاہت کا اقرار ہم کریں
آؤ اپنی چاہت کا اقرار جم جم کے ہم کریں
کہیں سہانے پل دسمبر کے بیت نہ جائیں

فاریہ سلیم: کی ڈائری سے ایک نظم
''آسمان کا فیصلہ''
ہاتھوں پہ
کتابوں پہ
درختوں پہ
کسی کا نام لکھنے سے
کوئی اپنا نہیں ہوتا
نام سے نام جوڑنا
اتنا آسان نہیں ہوتا
آسمان کا فیصلہ ہے یہ
زمین پر نہیں ہوتا

سارا حیدر: کی ڈائری سے ایک غزل
اب کس سے کہیں اور کون سنے جو حال تمہارے بعد ہوا
اس دل کی جھیل سی آنکھوں میں اک خواب بہت برباد ہوا
یہ ہجر ہوا بھی دشمن ہے اس نام کے سارے رنگوں کی
وہ نام جو میرے ہونٹوں پر خوشبو کی طرح آباد ہوا
اس شہر کے کتنے چہرے تھے کچھ یاد نہیں سب بھول گئے
اک شخص کتابوں جیسا تھا وہ شخص زبانی یاد ہوا
وہ اپنے گاؤں کی گلیاں تھیں دل جن میں ناچتا گاتا تھا
اب اس سے فرق نہیں پڑتا ناشاد ہوا یا شاد ہوا
بے نام ستائش رہتی تھی ان گہری سانولی آنکھوں میں
ایسا تو کبھی سوچا بھی نہ تھا دل اب جتنا بے داد ہوا

ساجدہ احمد: کی ڈائری سے ایک نظم
تنہائی ہو، بادل ہو، برسات ہو
اور تم آؤ
کبھی یوں بھی تو ہو
دریا کا ساحل ہو
پورے چاند کی رات ہو
اور تم ہو
کبھی یوں بھی تو ہو
کوئی نہ میرے ساتھ ہو، اور تم آؤ
کبھی یوں بھی تو ہو
بادل ایسا ٹوٹ کر برسے
میرے دل کی طرح ملنے کو
تمہارا دل بھی ترسے اور تم آؤ
کبھی یوں بھی تو ہو
بادل ہو، برسات ہو اور تم آؤ
کبھی یوں بھی تو ہو
آج شہر میں پاگل دل کو
تیری دید کی آس رہی
موت کی گم صم تنہائی
آج بھی میرے پاس رہی
آج بھی شام اداس رہی

صفہ خورشید: کی ڈائری سے ایک نظم
کوئی شعر کہوں
یا دنیا کے کسی موضوع پر
میں کوئی نیا مضمون لکھوں
یا کوئی انوکھی بات سنوں
کوئی بات جو سننے والی ہو
کوئی فقرہ جو دلچسپ لگے
یا کوئی خیال
اچھوتا سا
یا کہیں ملے کوئی فقرہ
جو حیران کر دے
کوئی لمحہ جو دل کو چھو جائے
میں اپنے ذہن کے گوشوں میں ☆☆☆☆

سارا حیدر ---- ساہیوال

س: ع غ جی کیا کررہے ہیں؟

ج: تم کیا کررہی ہو۔

س: لو یہ کیا بات ہوئی الٹا ہم سے سوال؟

ج: چلو بتا ہی دیتے ہیں کیا یاد کروگی۔

س: اب بتا بھی دیں؟

ج: مجھے بے صبرے لوگ پسند نہیں ہیں صبر سے کام لو۔

س: آپ عیدالاضحیٰ پر کیا پسند کرتے ہیں؟

ج: سب کچھ پسند ہے آپ مرضی جو بھیج دیں۔

س: ہم تو حلوہ پوریاں بنائیں گے کیسے بھیجوں مشکل ہو جائے گی۔

ج: ویسے ہی تمہاری نیت نہیں ہے بہانے نہ بناؤ۔

س: ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں؟

ج: میں خود آجاؤں گا کھا بھی لوں گا اور مل بھی لوں گا۔

ساجدہ احمد ---- ملتان

س: ہوں دیکھیں ع غ جی آپ تو حد سے بڑھ گئے، آپ کو انگلی پکڑائی آپ ہاتھ پکڑنے لگے۔

ج: توبہ توبہ ہوش کے ناخن لو میں بھلا تمہارا ہاتھ کیوں پکڑنے لگا میرے لئے کوئی کمی ہے۔

س: دل میں بسنے والوں سے ماہانہ کرایہ وصول کرنا ہو تو کیا کرنا چاہیے؟

ج: اسے دل کے ساتھ اپنی آنکھوں میں بھی بسا لیں۔

س: آپ کو پتہ ہے کہ آپ کے الٹے پلٹے جوابات پڑھ کر اب حنا کے قارئین کیا سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں؟

ج: کیا غضب کے جواب دیتا ہے یہ بندہ۔

س: چلیں آج جلدی سے اپنی فیورٹ ڈش اور مشروب کا نام بتا دیں؟

ج: پی جی ایام کی تلخی کو ہنس کے ناصر۔

س: آپس کی بات ہے، آپ وہی عین غین ہیں ناں جو تین سال پہلے......؟

ج: ہاں ہاں وہی ہوں جس نے تمہیں قرض خواہوں سے بچایا تھا۔

س: میرا دل آج کل بے حد اداس ہے، اگر میرے سوالوں کے سیدھے منہ جواب نہ دیئے تو میں......؟ آگے آپ خود سمجھدار ہیں؟

ج: پہلے یہ بتاؤ دل اداس کیوں ہے اور وہ بھی آج کل۔

صفہ خورشید ---- لاہور

س: وقت طوفان کب اٹھاتا ہے؟

ج: جب تم کسی گرلز کالج کے باہر کھڑے ہو اور ''گرل'' کا بھائی آجائے۔

س: کیا وقت کے ساتھ چلنا ضروری ہے؟

ج: بہت ضروری ہے ورنہ۔

س: سکون کی تلاش؟

ج: اپنے اندر تلاش کرو۔

س: کیا دنیا میں صرف غم ہی غم ہیں؟

ج: کون کہتا ہے۔

س: زندگی میں سکون کب ملتا ہے؟
ج: جب بیوی میکے ہو۔
س: آپ اتنی زیادہ ذہین کیوں ہیں؟
ج: یہی بات کل امان اللہ سے بھی کہہ رہے تھے۔

عابدہ حیدر ---- بہاول نگر

س: اب کیا ہوگا؟
ج: وہی جو ہم چاہتے ہیں۔
س: جدائی کی رات بہت طویل اور کربناک کیوں ہوتی ہے؟
ج: اکیلے میں ڈر جو لگتا ہے۔
س: وفا کی راہ میں آج میں اکیلی ہوں؟
ج: نئیں سی لانی بے قدراں نال یاری۔
س: کیا گئے ہوئے لمحات واپس آسکتے ہیں؟
ج: گیا وقت پھر کب ہاتھ آتا ہے۔
س: کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ ہمارے آس پاس کوئی نہ ہو؟
ج: تاکہ گزری ہوئی باتوں پر کبھی خوش کبھی رنجیدہ ہو سکیں۔
س: کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتے ہیں کتنے پیارے؟
ج: دل آنے کے ڈھنگ ہیں۔

آصفہ نعیم ---- فورٹ عباس

س: آپ کو پھول اچھے لگتے ہیں یا کلیاں؟
ج: کلیاں کیوں کہ انہیں ابھی کھلنا ہوتا ہے۔
س: آپ کو بھینس کے آگے بین بجانا کیسا لگتا ہے؟
ج: مجھے تو چین کی صرف بنسری بجانی آتی ہے۔
س: سلجھی ہوئی حسینوں اور الجھی ہوئی حسینوں میں کیا فرق ہے؟
ج: جو ایک سمجھدار انسان اور ایک ناسمجھ انسان میں ہے۔
س: انسان جیتے جی کب مرتا ہے؟
ج: جب اس کی عقل کام نہ کرے۔
س: عورت زندگی میں سب سے زیادہ کس بات کی تمنا کرتی ہے؟
ج: نئے ماڈل کی کار، وسیع و عریض بنگلہ اور دولت مند شوہر۔
س: اگر میں تمہاری بند آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر پوچھوں کہ بوجھو تو؟
ج: بوجھ لیں گے۔

فرینہ اسلم ---- میاں چنوں

س: ہم تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں کئی دنوں سے؟
ج: اندھے کو ندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی۔
س: ایک ڈال پر طوطا بیٹھا، ایک ڈال پر مینا غ جی کیا کہنا؟
ج: دونوں کو صحیح جگہوں پر رہنا چاہیے۔
س: اگر خواب صرف خواب ہی رہیں تو؟
ج: خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں۔
س: کنوارے شادی کرنا چاہتے ہیں اور شادی شدہ اپنی جان کو روتے ہیں؟
ج: شادی بور کے لڈو ہیں جس نے کھائے وہ بھی پچھتائے جس نے نہیں کھائے وہ بھی پچھتائے۔
س: عورت اپنی عمر اور مرد اپنی آمدنی کیوں چھپاتے ہیں؟
ج: یہی چیز تو فساد کی جڑ ہے۔
س: لوگ کہتے ہیں عشق خلل ہے دماغ کا؟
ج: تبھی تو عاشقوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

مہین آفریدی ---- ایبٹ آباد

س: یہ زندگی تیرے بغیر کیسے کٹ گئی؟
ج: جیسے اب تک کٹی ہے۔

☆☆☆

انداز بیاں اور......

پچھلے دنوں ''ہیلمٹ'' کی طرح ''پلاسٹک کے لفافوں'' کے سلسلے میں بھی شور اٹھا تھا، لوگوں کا خیال تھا کہ آلودگی کے ذمہ دار یہ پلاسٹک کے لفافے ہیں جو شاید حکومتی اقدامات کے بعد اب کبھی دکھائی نہ دیں، اس انڈسٹری سے وابستہ لوگوں نے تو متبادل کاروبار کی تلاش بھی شروع کر دی تھی، ''ہفتہ صفائی'' بھی منایا جائے گا۔

مگر پھر کیا ہوا، پلاسٹک کے لفافے بنتے گئے، بنتے رہیں گے، بلکہ اب تو کسی پلاسٹک کے برتن میں سالن ڈال کر کھاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ ہو سکتا ہے جو پلاسٹک اس جنم میں سالن ڈالنے والے برتن کی صورت میں سامنے ہے، پہلے جنم میں کہیں چپل کی شکل میں نہ رہ چکا ہو۔

آسیہ فرید، خانیوال

بے چارگی

''تمہاری یہ جرأت کہ تم میرے ڈیڈی کو فضول اور بے ہودہ انسان کہہ رہے ہو؟'' لڑکی نے اپنے بوائے فرینڈ پر برہم ہوتے ہوئے کہا۔

''میں ان سے تمہارا رشتہ مانگنے گیا، میں نے کہہ دیا کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اس پر وہ بولے کہ کوئی بات نہیں، تدفین کا خرچ میں اٹھالوں گا۔''

مریم انصاری، سکھر

نقصان

ہوٹل میں جنید صاحب کو ان کے دوست فیاض صاحب نے اداس، غم زدہ اور منہ لٹکائے بیٹھے دیکھا تو ہمدردانہ انداز میں سبب پوچھا، جنید صاحب بولے۔

''دو ماہ پہلے میرے ایک خالو کا انتقال ہوا، ان کی کوئی اولاد نہیں تھی، انہوں نے ترکے میں میرے لئے چھ لاکھ روپے چھوڑے۔''

''تو اس میں اداس ہونے کی کیا بات ہے؟ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔'' فیاض صاحب نے کہا۔

''پچھلے ماہ میرے ایک چچا مر گئے تھے، انہوں نے میرے لئے دس لاکھ روپے چھوڑے۔'' جنید صاحب نے گویا ان سنی کرتے ہوئے بتایا۔

''تو پھر آخر آپ منہ لٹکائے کیوں بیٹھے ہیں؟'' فیاض صاحب نے حیرت سے ایک بار پھر پوچھا۔

''بھئی...... یہ پورا مہینہ ختم ہونے کو آرہا ہے، ابھی تک کہیں سے مزید کوئی خبر نہیں آئی۔'' جنید صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

عزہ فیصل، قصور

صحیح طریقہ

ایک صاحب اپنی گاڑی کے پاس بیٹھے آرام سے سگریٹ پی رہے تھے جبکہ ان کی بیگم پسینے میں شرابور گاڑی کی سروس میں مصروف تھیں، اتنے میں ان کا ایک دوست ادھر آیا اور اس نے جب یہ منظر دیکھا تو ان صاحب کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔

''تم یہ کام کس طرح اپنی بیوی سے کرانے

میں کامیاب ہوئے ہو؟''

ان صاحب نے لاپرواہی سے منہ سے دھویں کا مرغولہ چھوڑتے ہوئے جواب دیا۔

''معمولی سی بات ہے، ایک دن میں نے بیگم سے کہا کہ جب میں گاڑی کی سروس کرتا ہوں تو میرا وزن ایک پونڈ کم ہو جاتا ہے، بس اسی دن سے بیگم نے یہ کام اپنے ذمے لے رکھا ہے۔''

نورانور، فیصل آباد

کم ظرفی

مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی ریل میں سفر کر رہے تھے، دوران سفر ٹکٹ چیکر نے ان سے ٹکٹ مانگا تو بیدی صاحب نے اپنی جیبیں ٹٹولیں، مگر ٹکٹ کا پتا نہ تھا۔

ٹکٹ چیکر بیدی صاحب کو پہچانتا تھا، کہنے لگا۔

''مجھے آپ پر بھروسا ہے، آپ نے یقیناً خریدا ہوگا۔''

بیدی صاحب پریشانی سے بولے۔

''بھائی! بات آپ کے بھروسے کی نہیں، مسئلہ تو سفر کا ہے، اگر ٹکٹ نہ ملا تو یہ کس طرح معلوم ہوگا کہ مجھے کہاں اترنا ہے۔''

فاریہ سلیم، شرقپور

مشورہ

دلہن رخصت ہو رہی تھی، خواتین آنسو بہا رہی تھیں، تیز آواز میں ریکارڈ بج رہا تھا۔

''چھوڑ بابل کا گھر، موہے پی کے نگر، آج جانا پڑا۔'' مہمانوں میں ایک لڑکی ایسی بھی تھی، جو رونے کی بجائے کونے میں کھڑی دانت پیس رہی تھی۔

''کیا بات ہے، تم یہاں کیوں کھڑی ہو؟'' اس کی سہیلی نے پوچھا۔

''تمہیں ریما کی رخصتی کا دکھ نہیں ہو رہا؟''

''دکھ کرے میری جوتی، ریما نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے، ایسا سلوک تو بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں کر سکتا۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''وہ مجھے ایک ہی مشورہ دیتی تھی کہ عامر سے جتنی ترش روی سے پیش آؤ گی، وہ تم سے اتنی ہی محبت کرے گا۔''

''یہ عامر کون ہے؟'' سہیلی نے پوچھا۔

''وہ جو سہرا باندھے ریما کا بازو پکڑے ہوئے پھولوں سے آراستہ کار کی طرف جا رہا ہے۔'' لڑکی نے افسردگی سے کہا۔

سارا حیدر، ساہیوال

ہیڈنگ

فوجی کمانڈر ایک سارجنٹ کے ساتھ نئے بھرتی ہونے والوں کے سامنے پہنچا، اس نے تعارفی تقریر شروع کی، چند تعارفی کلمات کے بعد وہ بالوں کی حجامت کے موضوع پر آیا۔

''بالوں کے معاملے میں آپ بالکل آزاد ہیں۔'' لمبے لمبے بالوں والوں نے اطمینان کی سانس لی، کمانڈر نے کہا۔

''آپ لوگ اپنی پسند کے بال رکھ سکتے ہیں، مگر ان کی لمبائی میرے بالوں سے زیادہ۔'' اس نے اپنے سر سے ٹوپی اٹھا کر اپنی سولجر کٹ حجامت دکھائی۔

''اور سارجنٹ کے بالوں سے کم نہ ہو۔'' سارجنٹ نے بھی اپنی ٹوپی اٹھائی، وہ گنجا تھا۔

ساجدہ احمد، ملتان

دوراندیش

ایک نوجوان نے اپنے دوست سے پوچھا۔

''تم نے اس کمپنی میں نوکری کیوں نہیں کی، جہاں تم انٹرویو میں کامیاب ہو گئے تھے؟''

''مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہاں میرا کوئی

مستقبل نہیں ہے۔'' دوست نے جواب دیا۔
''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' نوجوان نے حیرت سے پوچھا۔
''کمپنی کے مالک کی بیٹی پہلے سے شادی شدہ تھی۔'' دوست نے جواب دیا۔

صفیہ خورشید، لاہور

مداخلت

بچہ ماں سے۔
''امی جان! آپ نے فرمایا تھا نا کہ انسان کو امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے؟''
''ہاں کہا تھا۔'' ماں نے جواب دیا۔
''آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ خدا کے کاموں میں دخل نہیں دینا چاہیے۔''
''لیکن بات کیا ہے تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' ماں نے زچ ہو کر پوچھا۔
''بات صرف یہ ہے کہ میں امتحان میں فیل ہو گیا ہوں۔'' بچے نے معصومیت سے جواب دیا۔

عابدہ حیدر، بہاول نگر

خوف

بارش ہوئی تو ایک شخص نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
''اب ہر طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آئے گی اور چند دنوں میں زمین کے اندر دبی اشیاء باہر نکل آئیں گی۔''
''یا اللہ خیر۔'' دوسرے نے بدحواس ہو کر کہا۔
''میری تین بیویاں زمین میں دبی ہوئی ہیں۔''

آصفہ نعیم، فورٹ عباس

احسان مند

دعوت میں ایک ڈاکٹر کی ملاقات ایک نوجوان لڑکی سے ہوئی لڑکی مسکرا کر کہنے لگی۔
''ڈاکٹر صاحب! آپ کے علاج سے جو فائدہ مجھے پہنچا ہے میں اس کے لئے زندگی بھر آپ کی احسان مند رہوں گی۔''
ڈاکٹر نے خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر حیرت انگیز لہجے میں کہا۔
''مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے میں نے کبھی آپ کا علاج نہیں کیا۔''
''جی ہاں۔'' لڑکی نے جواب دیا۔
''دراصل میرے چچا آپ کے زیر علاج تھے اور آج میں ان کی جائیداد کی تنہا وارث ہوں۔''

فرینہ اسلم، میاں چنوں

ارادہ

ایک لڑکی نے اپنی سہیلی سے کہا۔
''میں طے کر چکی ہوں کہ جب تک میری عمر بیس سال نہیں ہو جائے گی میں اس وقت تک شادی نہیں کروں گی۔'' سہیلی نے کہا۔
''میں بھی طے کر چکی ہوں کہ جب تک میری شادی نہیں ہو جاتی مین اس وقت تک ہرگز بیس سال کی نہیں ہوں گی۔''

مہین آفریدی، ایبٹ آباد

دور اندیشی

''مجھ سے شادی کر لو۔'' نوجوان لڑکے نے خوشامدانہ انداز میں ایک حسن فتنہ پرور سے کہا۔
''میرے والد کی تین کروڑ کی جائیداد ہے، ان کی عمر ننانوے سال ہو چکی ہے، زیادہ سے زیادہ سال چھ مہینے زندہ رہیں گے، میں ان کی واحد اولاد ہوں، والد کے انتقال کے بعد ساری دولت مجھے ملے گی۔''
ایک ہی ہفتے میں حسن فتنہ پرور نوجوان لڑکے کی امی بن گئی۔

راحیلہ فیصل، سرگودھا

☆☆☆

بیاض

تسنیم طاہر

عابدہ حیدر ---- بہاول نگر
مہکے سدا بہار کی صورت تیرا وجود
تو مسکرائے شام کی رعنائیوں کے ساتھ
خوشیاں تیرے نصیب کا حصہ رہیں سدا
وابستہ تیرا نام رہے شہنائیوں کے ساتھ

....

انتقاماً سمجھ کو وہ درس وفا دے جائے گا
زخم دے کر اک درد آشنا دے جائے گا
کس قدر نادم ہوا ہوں میں برا کہہ کر اسے
کیا خبر تھی جاتے جاتے وہ دعا دے جائے گا

....

ہم بھی کیا لوگ ہیں خوشبو کی روایت سے الگ
خود پر ظاہر نہ ہوئے تجھ کو چھپانے کے لئے
آصفہ نعیم ---- فورٹ عباس
دل میں تھی ویرانی ہم بھی تھے خاموش بہت
تم آئے تو جان گئے ہم موسم کتنا پیارا ہے
باتوں باتوں میں آؤ اس شخص کی بات کریں
جس کی خاطر اب دنیا کا ہر دکھ ہمیں گوارا ہے

....

ہنسے تو آنکھ سے آنسو رواں ہمارے ہوئے
کہ ہم پہ دوست بہت مہرباں ہمارے ہوئے
بہت سے زخم ہی ایسے جوان کے نام کے ہیں
بہت سے قرض سر دوستاں ہمارے

....

نہ دید ہے نہ سخن اب نہ حرف ہے نہ پیام
کوئی بھی حیلہ تسکیں نہیں اور آس بہت ہے
امید یار نظر کا مزاج درد کا رنگ
تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اداس بہت ہے
فرینہ اسلم ---- میاں چنوں

ہر بار کی طرح تیرا یہ بے وفا سا وعدہ
معلوم ہے کہ جھوٹا مگر اعتبار لازم

....

میری بھیگتی پلکوں کے جو خواب ہیں ٹوٹے
تو تیری یادوں کے سب گلاب ہیں سوکھے
نیند میری پلکوں سے دور ہو گئی
جب سے تیرے سارے خواب ہیں روٹھے

....

آئینے میں غبار اتر آیا
عکس ٹکرا رہے ہیں پتھر سے
میں تھکن اوڑھ کے کدھر جاؤں
آسماں ہٹ گیا ہے میرے سر سے
مہین آفریدی ---- ایبٹ آباد
آنکھوں میں بھر کے سادہ محبت کی ڈوریاں
مٹھی میں بند کرکے دل و جاں کی چوریاں
دھرتی کو لوٹتی ہیں تبسم کی اوٹ سے
چالاک کس قدر ہیں یہ گاؤں کی گوریاں

....

ٹھہر جا آبلہ پا دن ذرا کچھ اور ڈھلنے دے
سلگتی ریت پہ چلنا بڑا دشوار ہوتا ہے
جدائی کی رتوں نے ہی نہیں مارا مجھے
کسی کی یاد کا آسیب بھی خونخوار ہوتا ہے

....

اس شبنم وفا کو جو دل کی شکست پر
اک پل کو آکے رو گئی میں ڈھونڈتا پھرا
بے مہر آسمان کے تلے رسم دوستی
کسی دل میں جا کے سو گئی میں ڈھونڈتا پھرا
راحیلہ فیصل ---- سرگودھا
اس اذیت سے کسی طور رہائی تو ملے

اس کے لکھے ہوئے خطوط آج جلا ڈالتے ہیں
روگ تم دل کو لگا لیتے ہو اور لوگ بشیر
ربط کتھنا بھی ہو دو دن میں بھلا ڈالتے ہیں

....

ہم جو روئے تو انہیں کہنا پڑا
اس طرح کرتی ہے برسات سفر

....

تھی میری تباہی میں کچھ درختوں کی بھی سازش
ورنہ یہ اجڑنے کا موسم تو نہیں تھا

آمنہ خان ---- راولپنڈی

محبت تو ازل سے ہے محبت تا ابد ہو گی
اسے میں عصر حاضر کا عقیدہ کہہ نہیں سکتا
کتاب زندگی میں ہے رقم باب محبت بھی
مگر کتنی ہیں سطریں خط کشیدہ کہہ نہیں سکتا

....

کچھ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پہ گزر گئی
دنیا تو لطف لے گی میرے واقعات میں
میرا تو جرم تذکرہ عام ہے مگر
کچھ دھجیاں ہیں میری زلیخا کے ہاتھ میں

....

ہر اک بار یہ سوچ کے دل بھر آیا ہے
اتنی عمر میں کیا کھویا کیا پایا ہے

صابرہ سلطانہ ---- کراچی

اب تو ٹوٹی کشتی بھی آگ سے بچاتے ہیں
ہاں کبھی تھا نام اپنا بخت آزماؤں میں
صرف اس تکبر میں اس نے مجھ کو جیتا ہے
ذکر نہ ہو اس کا بھی کل کو نارساؤں میں

....

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

....

اپنی اپنی انا کے قیدی تھے
ہمارے بیچ کوئی دوسرا نہ تھا

حنا شاہین ---- حیدرآباد

وہ تعلق توڑ کر مہربانی کر گیا
ربط جو فانی تھا اس کو غیر فانی کر گیا
میں سمجھا تھا کہ مل کر داستان پوری ہوتی
وہ تو بچھڑ کر پھر بڑی لمبی کہانی کر گیا

....

تیرے گرد ہے میری دعاؤں کا دائرہ
میں تیری عافیت کی مبارک لکیر ہوں

....

چکانے ہیں وہ قرضے سطح پر ہیں کہیں زیر زمیں ہیں
ابھی اس خاکداں میں تم بھی زندہ ہو مرے ہم بھی نہیں ہیں
ابھی میداں میں ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہیں ہار کیسی
ابھی تو کھیل کا آغاز ہے تم بھی یہیں ہم بھی یہیں ہیں

سدرہ خانم ---- ملتان

ایک مہینے بعد ملا تو نام بھی میرا بھول گیا
جس نے چلتے وقت کہا تھا یاد بہت تم آؤ گی

....

مل گئی جو محبت یاراں غنیمت جانیے
پھر نہیں آتے پلٹ کر جب چلے جاتے ہیں دن
وقت اس کے ساتھ کچھ محسوس ہوتا ہی نہیں
جانے کس پل میں نہ جانے کب گزر جاتے ہیں دن

....

شہر طلب کرے اگر تم سے علاج تیرگی
صاحب اختیار ہو آگ لگا دیا کرو

آسیہ فرید ---- خانیوال

زندگی گزر جائے گی بہر صورت
تو کوئی شرط زندگی تو نہیں

....

ہم اپنے آپ میں یوں گم ہوئے ہیں عرصے سے
ہمیں تو جیسے کسی کا بھی انتظار نہیں
کسی کو ٹوٹ کے چاہیں کہ چاہ کر ٹوٹیں
ہمارے پاس تو اتنا بھی اختیار نہیں

....

یہ پھیلی ہوئی رات ڈھلے یا نہ ڈھلے
یہ یورش حالات ٹلے یا نہ ٹلے

روشن کر چراغ دہر و کعبہ
پہ شمع خرابات جلے نہ جلے

مریم انصاری ---- سکھر

میں نے چھپایا ہے گلے مل کے بچھڑنے کا عذاب
میرے معبود کسی کو یہ سزا مت دینا

....

وہ یوں ملا ہے کہ جیسے کبھی ملا ہی نہ تھا
ہماری ذات پہ جس کی عنایتیں تھیں بہت
ہمیں خود اپنے ہی یاروں نے کر دیا رسوا
کہ بات کچھ بھی نہ تھی اور وضاحتیں تھیں بہت

....

ایک میٹھا درد بھی دل میں کبھی پیدا ہوا
کیا اکیلے میں کسی دن آپ نے سوچا ہمیں؟
تو سمندر ہے ہماری پیاس کی کچھ لاج رکھ
یوں نہ اک دو گھونٹ پانی کے لئے ترسا ہمیں

عزہ فیصل ---- قصور

وہ جو اپنی جاں سے گزر گئے انہیں کیا خبر ہے کہ شہر میں
کسی جاں نثار کا ذکر کیا کوئی سوگوار بھی اب نہیں

....

خاک اڑاتی نہ تھی اس طرح تو ہوا اس کو کیا ہو گیا
دیکھو آواز دیتا ہے اک سانحہ شہر والو سنو
عمر بھر کا سفر جس کا حاصل ہے اک لمحہ مختصر
کس نے کیا کھو دیا کس نے کیا پا لیا شہر والو سنو

....

میری آنکھوں میں آنسو پگھلتا رہا چاند جلتا رہا
تیری یادوں کا سورج نکلتا رہا چاند جلتا رہا
یہ دسمبر کہ جس میں کڑی دھوپ بھی میٹھی لگنے لگی
تم نہیں تو دسمبر سلگتا رہا چاند جلتا رہا

نورانور ---- فیصل آباد

نیند سے خواب میں اتر جائے
آدمی خامشی سے مر جائے
اک طرف آگ اک طرف پانی
آدمی جائے تو کدھر جائے

....

دوستوں کے ہجوم میں ناصر
میرے اندر کا شخص تنہا ہے

....

ان تپے ہوئے شہروں کی فضا کچھ کہتی ہے
کبھی تم بھی سنو یہ دھرتی کیا کچھ کہتی ہے
کبھی بھور بھئے کبھی شام ڈھلے کبھی رات گئے
ہر آن بدلتی رت کی ہوا کچھ کہتی ہے

فاریہ سلیم ---- شرقپور

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو اس نے مروت کو کیا ہوا
امید وار وعدہ دیدار مر چلے
آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا

....

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی
یہ حسن و عشق تو دھوکا ہے سب مگر پھر بھی
ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگزر پھر بھی

....

سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمر رائیگاں ہے وہی رائیگاں نہیں
ہوتا ہے راز عشق و محبت انہیں سے فاش
آنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں

سارا حیدر ---- ساہیوال

جہاں بدلا مگر آداب میخانہ نہیں بدلے
کبھی اے گردش دوراں ادھر بھی آ گئی ہوتی
مقام عاشقی دنیا نے سمجھا ہی نہیں ورنہ
جہاں تک تیرا غم ہوتا وہیں تک زندگی ہوتی

....

کوئی صورت نہیں ہے زندگی سے بچ نکلنے کی
غم و آلام کے ماروں کو بھی مرنے نہیں دیتی
مجھے معلوم ہے وعدہ نبھانا سخت مشکل ہے
مری کم ہمتی انکار بھی کرنے نہیں دیتی

☆☆☆

حیدر رضا ---- جھنگ

اس کو کچھ تو بنا دیا ہے
ہم نے تھوڑا سا دھیان دے کر

....

خاک اڑتی ہے رات بھر مجھ میں
کون پھرتا ہے دربدر مجھ میں
مجھ کو مجھ میں جگہ نہیں ملتی
وہ ہے موجود اس قدر مجھ میں

....

مجھ کو تہذیب کے برزخ کا بنایا وارث
یہ الزام بھی میرے اجداد کے سر جائے گا
فاعزہ عبدالمنان ---- کراچی

خلقت نہیں ہے ساتھ تو پھر بخت بھی نہیں
کچھ دن ہی رہے گا تو یہ تخت بھی نہیں
مایوس ہو کے دیکھ رہے ہیں خلا میں گھر
اتنی تو یہ زمین مگر سخت بھی نہیں

....

تھک گیا ہے دل وحشی مرا فریاد سے بھی
جی بہلتا نہیں اے دوست تیری یاد سے بھی
اے ہوا کیا ہے جو اب نظم چمن اور ہوا
صید سے بھی ہیں مراسم ترے صیاد سے بھی

....

میرے حق میں مخالف میں کبھی کچھ کہا تو ہوگا
مجھے چھوڑ جانے والا مجھے سوچتا تو ہو گا
یہ اداس اداس پھرنا یہ کسی سے بھی نہ ملنا
ہے یونہی نہیں یہ سب کچھ کوئی سانحہ تو ہو گا
عقیقہ منیر ---- سیالکوٹ

نہیں اس میں کوئی منطق ہے یقین کی بات ساری
کہ جہاں رکھا ہے پاؤں وہاں راستہ تو ہو گا
کوئی درمیاں نہیں تھا کوئی درمیاں نہیں ہے
تو پھر ایسی قربتوں میں کہیں رابطہ تو ہو گا

....

کہا نہ تھا اسے مت ضبط کرنا
وہ آنسو اب سمندر ہو گیا نا!

....

یہ دکھ نہیں ہے کہ وہ سمجھا نہیں مرے فن کو
مخالفت کا سلیقہ نہیں تھا دشمن کو
میں کس مقام سے بولوں میں کس سے بات کروں
کہ خواہشات کا کاسہ ملا ہے اس تن کو
صائمہ سلیم ---- گجرات

اگرچہ تجھ سے بہت اختلاف بھی نہ ہوا
مگر یہ دل تری جانب سے صاف بھی نہ ہوا
تعلقات کے برزخ میں ہی رکھا مجھ کو
وہ میرے حق میں نہ تھا اور خلاف بھی نہ ہوا

....

نہ جانے کون سا فقرہ کہاں رقم ہو جائے
دلوں کا حال بھی اب کون کس سے کہتا ہے
میرے بدن کو نمی کھا گئی ہے اشکوں کی
بھری بہار میں کیسا مکان ڈھلتا ہے

....

لب خاموش چشم خشک کیا سمجھائیں گے تجھ کو
جو بارش دل میں ہوتی ہے جو دریا دل میں بہتا ہے
نازیہ جمال ---- چکوال

وہ اک سایا جو تحفے میں دیا تھا اس کو خوابوں نے
وہی اب اس کا آنچل ہے وہی اب اس کا گہنا ہے
لکھا تھا ریت پر اک دوسرے کا نام کیوں ہم نے
نتیجے میں جو صدمہ ہے وہ ہم دونوں کو سہنا ہے

....

سنتا ہوں اب کسی سے وفا کر رہا ہے وہ
اے زندگی خوشی سے کہیں مر نہ جاؤں میں
اک شب بھی وصل کی نہ مرا ساتھ دے سکی
عہد فراق آ کہ تجھے آزماؤں میں

....

اپنا ہی تھا قصور کہ طوفانوں میں گھر گئے
اک موج تھی کہ جس کو کنارا سمجھ لیا
سمن رضا ---- چیچہ وطنی

کبھی سائباں نہ تھا بہم کبھی کہکشاں تھی قدم قدم
کبھی مکاں کبھی لامکاں مری آدھی عمر گزر گئی

....

بیچ در بیچ سلسلے دل کے
تجھے تیری تجھے کس کی تلاش

....

سکون ملتا ہے رونے سے دل کو بھی آذر
شدید ہو کبھی موسم تو بارشیں مانگوں
فائزہ عبدالمنان ---- کراچی

گفتگو کرنے کا کچھ اس میں ہنر ایسا تھا
وہ میری بات کا مفہوم بدل دیتا تھا

....

جنون میں ہوش کے سب سلسلے بھی ساتھ رکھتا ہے
وفا کرتا ہے لیکن فاصلے بھی ساتھ رکھتا ہے
کوئی آب و ہوا تو راس آئے گی کبھی اس کو
محبت کی ساری منطقیں بھی ساتھ رکھتا ہے

....

دھیان رکھنا ہر اک آہٹ پر
محبتوں میں میری بد حواسیاں نہ گئیں
عتیقہ منیر ---- سیالکوٹ

اسے کہو بہت نامراد شے ہے جنوں
اسے کہو کہ مجھے ہے بہت جنوں اس کا

....

خواہشوں کی محرومیاں مت پوچھ میرے ہم نفس
کہ میری نس نس میں خوابوں کا زہر اترا ہے

....

ہم ہی کریں کوئی صورت انہیں بلانے کی
سنا ہے ان کو تو عادت ہے بھول جانے کی
جفا کے ذکر پہ تم کیوں سنبھل کے بیٹھ گئے
تمہاری بات نہیں بات ہے زمانے کی
صائمہ سلیم ---- گجرات

پانی پہ بھی ریت تڑپی چنی گئی
بنتی رہی ہے دکھ کا کبھی عنوان محبت
ہم نے پڑھے ہیں اتنے فسانے کہ بس
لگتا ہے ہر فسانے کی ہے جان محبت

....

رشتوں کو توڑنے میں ذرا احتیاط کرنا
رخ اپنا موڑنے میں ذرا احتیاط کرنا
ایسا نہ ہو کہ ایک دن پچھتاؤ ہر گھڑی
تم مجھ کو چھوڑنے میں ذرا احتیاط کرنا

....

اپنا آنچل سنبھال کر چلنا
چھیڑ خانی ہوا کی عادت ہے
نازیہ جمال ---- چکوال

دل کو تمہاری یاد کے آنسو عزیز تھے
دنیا کا کوئی درد سمونے نہیں دیا
ناصر یوں اس کی یاد چلی ہاتھ تھام کر
میلے میں اس جہاں کو کھونے نہیں دیا

....

جو لگ چکی ہے گرہ دل میں کھل نہیں سکتی
تو لاکھ ملتا رہے ہم سے دوستوں کی طرح

....

مختصر لفظوں میں ہے اب یہ مزاج زندگی
رابطہ سب سے ہے مگر واسطہ نہیں
سمن رضا ---- چیچہ وطنی

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لا دوا نہ تھے

....

وہ ریت کرکے میرے خواب کی زمینوں کو
میرے وجود میں دریا تلاش کرتا ہے
گنوا کے مجھ کو کسی عہد خوش گمانی میں
وہ شاید اب کوئی مجھ سا تلاش کرتا ہے

....

تم نے گم کر دیا تھا دانستہ
اب بھرے شہر میں مجھے ڈھونڈو

☆☆☆

حنا کا دسترخوان

افراح طارق

چائنیز سوپ

اشیاء

چکن ثابت پیس	ایک عدد
گھی	آدھا کپ
دودھ	ایک کپ
پانی	حسب ضرورت
سویا ساس	دو کھانے کے چمچ
شلغم	ایک عدد
ٹینڈا	ایک عدد
پیاز سبز	چار عدد
ادرک	ایک پیس
لہسن	آدھی پوتھی
پیاز خشک	ایک عدد
سبز دھنیا	چند پتے
سیاہ مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	آدھا چائے کا چمچہ
میدہ	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب

ثابت مرغی کے چار ٹکڑے لے لیں، اسے دو لیٹر پانی میں ڈال کر پکائیں، اس میں ایک عدد خشک پیاز، چار ٹکڑے کر کے ڈال دیں؛ ثابت لہسن، ادرک کا ایک ٹکڑا، نمک اور سیاہ مرچ شامل کر دیں، اس کے ساتھ شلغم چار ٹکڑے کر کے ڈال دیں اور ایک گھنٹہ تک ان سب کو ابالیں، سوپ تیار ہو جائے تو گوشت کو نکال کر ایک ایک انچ چوڑے ٹکڑے کر لیں، سوپ میں شامل تمام اشیاء کو گرینڈ کر کے پیسٹ بنا لیں اور سوپ کو چھان کر ایک بڑی ساس پین میں ڈال دیں اور دوبارہ دھیمی آنچ پر رکھ دیں، ٹینڈے کے اوپر سبز چھلکا اتار کر اندر سے گودا بھی نکال دیں اور اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں، سبز پیاز کو بھی ایک ایک انچ برابر کاٹ لیں، گھی میں میدہ ڈال کر سرخ کریں، اس میں سبز پیاز، ٹینڈا اور گوشت کے سلائس ڈال کر فرائی کریں، ساتھ ہی سویا ساس بھی ملا دیں، سوپ ڈال کر چند منٹ تک تمام اشیاء کو ابال لیں، ابلتے ہوئے سوپ میں گرینڈ کیا ہوا آمیزہ بھی ملا دیں، سوپ تیار ہو جائے تو سبز دھنیا کاٹ کر چھڑک دیں اور نوش فرمائیں۔

پوٹیٹو سوپ

اشیاء

یخنی	آٹھ پیالی
آلو	ایک پاؤ
پیاز	دو عدد
لہسن	چھ پوتھی
ادرک	ایک ٹکڑا
نمک	آدھا کھانے کا چمچہ
سیاہ مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
گھی	آدھا کپ
میدہ	ایک کھانے کا چمچہ
سلاد کے پتے	آدھا کپ
دودھ	ایک پیالی
ڈبل روٹی	دو سلائس

ترکیب

یخنی میں ایک عدد پیاز، لہسن، ادرک، نمک، مرچ اور ڈبل روٹی کے سلائس ڈال کر آدھا گھنٹہ تک ہلکی آنچ پر پکائیں، جب چھ پیالی پانی رہ جائے تو میدہ بھون کر ڈال دیں، پانچ منٹ بعد دودھ بھی ملا دیں، آلو کو ابال کر پیس کر پیسٹ بنالیں، یخنی میں اس پیسٹ کو ملا کر مکسچر میں مکس کریں اور دوبارہ چولہے پر اس آمیزے کو چند منٹ ابالیں، سوپ تیار ہو جائے تو سلاد کے پتے ملا کر پیش کریں۔

گرین پیس سوپ

اشیاء

مٹر تازہ دانے	ایک پیالی
یخنی کے لئے ہڈی	ایک کلو
گاجر	ایک عدد
شلغم	ایک عدد
پیاز	دو عدد
ادرک	ایک ٹکڑا
لہسن	چوتھی
آلو	ایک عدد
سبز دھنیا	چند پتے
میدہ	ایک کھانے کا چمچہ
گھی	آدھا کپ
پانی	دو لیٹر
دودھ	آدھا کپ
سیاہ مرچ، نمک	آدھا چائے کا چمچہ
سفید زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
دارچینی	ایک ٹکڑا

ترکیب

مٹروں کے دانے ابال کر پیس لیں، میدہ اور دودھ کو الگ رکھ دیں، گوشت کی ہڈی کے ساتھ پیاز، ادرک، لہسن، دارچینی، نمک، مرچ، آلو، شلغم اور سبز دھنیا کاٹ کر ڈال دیں اور دو لیٹر پانی ملا کر پکائیں، دو گھنٹے بعد یخنی کو چھان لیں، ایک عدد پیاز کو گھی میں سرخ کریں اور اس میں دودھ اور میدے والا آمیزہ ڈال دیں، آخر میں پسے ہوئے مٹر ڈال کر مزید پندرہ منٹ تک پکائیں۔

چائنیز سوپ

اشیاء

چکن	آدھا کلو
کارن فلور	چار کھانے کے چمچ
پیاز باریک کٹی ہوئی	ایک عدد
انڈے صرف سفیدی	دو عدد
کالی مرچ پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ
اجینوموتو	ایک کھانے کا چمچہ
ہری مرچ	دو عدد
سویا ساس	حسب ذائقہ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب

چکن کے پیس اچھی طرح دھولیں، ایک ساس پین میں چکن، باریک کٹی ہوئی پیاز، سیاہ مرچ، نمک اور پانی ڈال کر یخنی تیار کریں، گوشت گل جائے تو یخنی چھان کر الگ نکال لیں، ابلی ہوئی بوٹیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرلیں، ایک پیالی پانی میں کارن فلور کا آمیزہ اور چھوٹے چھوٹے گوشت کے ٹکڑے ڈال کر دھیمی آنچ پر چند منٹ تک پکائیں، جب سوپ آپ کی پسند کے مطابق گاڑھا ہو جائے تو انڈے کی سفیدی ملا دیں اور چمچہ سے سوپ میں خوب اچھی طرح مکس کریں، لیجئے سوپ تیار ہے۔

چلی ساس بنانے کی ترکیب

اشیاء

سرخ مرچ پسی ہوئی	دو کھانے کے چمچ
سرکہ	دو کھانے کے چمچ

نمک	ایک چائے کا چمچ
چینی	ایک کھانے کا چمچ

ترکیب

سرخ مرچ کے پاؤڈر کو تھوڑے سے پانی اور سرکہ میں گاڑھا گھول کر اس میں چینی اور نمک ملا دیں اور ساس تیار کر لیں۔

چکن کارن سوپ

اشیاء

چکن (گوشت)	آدھا کلو
پیاز	ایک عدد
لہسن پسا ہوا	پانچ جوے
ادرک	آدھا کھانے کا چمچ
سرکہ	ایک کھانے کا چمچ
انڈے	دو عدد
مکئی کے دانے پسے ہوئے	ایک پیالی
کارن فلور	دو کھانے کے چمچ
سیاہ مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
چینی	ڈھائی چائے کا چمچ
کوکنگ آئل	دو کھانے کے چمچ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب

ساس پین میں دس کپ پانی ڈالیں اس میں چکن کی بوٹیاں، پیاز، لہسن، ادرک اور نمک ڈال کر چکن کو ابالیں یہاں تک کہ پانی چار کپ رہ جائے گوشت اور یخنی کو الگ الگ کر لیں اور گوشت کے ریشے بنالیں، ساس پین میں کوکنگ آئل ڈال کر گرم کریں اور مکئی کے پسے ہوئے دانے ڈال کر بھونیں پھر پانی ڈال کر کچھ دیر ان کو گلائیں مکئی کے دانے نرم پڑ جائیں تو یخنی، چینی، کالی مرچ اور گوشت کے ریشے ڈال کر دھیمی آنچ پر آدھا گھنٹہ تک پکائیں، کارن فلور کو ہلکا سا بھون کر شامل کر دیں، سوپ گاڑھا ہونے لگے تو انڈوں کی سفیدی پھینٹ کر ملا دیں، بہترین مزے دار سوپ تیار ہوگا۔

چکن کارن سوپ اور چلی ساس

اشیاء

چکن ابلا ہوا	آدھا کلو
یخنی	چار پیالی
مکئی کا دلیہ	آدھی پیالی
پیاز باریک کتر لیں	ایک عدد
لہسن	آدھا چائے کا چمچ
ادرک	آدھا چائے کا چمچ
سرکہ	ایک کھانے کا چمچ
سویا سوس	ایک کھانے کا چمچ
پانی	چار کپ
مسٹرڈ پاؤڈر رائی	ایک چائے کا چمچ
کوکنگ آئل	دو کھانے کے چمچ
نمک	حسب ذائقہ
چلی ساس	حسب ضرورت

ترکیب

گوشت جو آپ ابال چکی ہیں اور اس کی یخنی الگ کر چکی ہیں اس کے ریشے کر لیں کوکنگ آئل کو ساس پین میں گرم کریں اور اس میں باریک کترا ہوا پیاز مل لیں، خیال رکھیں کہ پیاز سرخ نہ ہونے پائے، اب اس میں مکئی کا دلیہ ڈال کر بھونیں ساتھ ہی لہسن، ادرک، سویا سوس، مسٹرڈ پاؤڈر، سرکہ اور نمک ڈال کر یخنی بھی ملا دیں اور پکنے دیں، پکتے ہوئے سوپ میں گوشت کے ریشے ڈال کر سوپ کو پیالوں میں انڈیل لیں اور چلی ساس شامل کر کے نوش کریں۔

چکن وٹماٹو سوپ

اشیاء

چکن	آدھا کلو
پیاز باریک کٹی ہوئی	ایک عدد

گاجر کش کی ہوئی	ایک عدد
ٹماٹر	آدھا کلو
مکھن	ایک کپ
لہسن پسا ہوا	ایک جوا
ادرک پسا ہوا	ایک چمچہ
ہری مرچ	دو عدد
اجوائن	ایک چٹکی
نمک، کالی مرچ	حسب ذائقہ
سفید زیرہ	حسب ذائقہ

ترکیب

سوس پین میں مکھن کو گرم کریں اور اس میں باریک کٹی ہوئی پیاز ڈال دیں جب پیاز تھوڑی سی سبز ہو جائے تو چکن ڈال کر فرائی کریں چکن ہلکا سا فرائی ہو جائے تو کش کی ہوئی گاجر، لہسن اور پسا ہوا ادرک ڈال کر مزید فرائی کریں سبزیاں اور گوشت فرائی ہو جائے تو ٹماٹر ڈال کر ڈیڑھ لیٹر پانی ڈال کر دھیمی آنچ پر سوپ تیار ہونے دیں سوپ گاڑھا ہونے لگے تو اجوائن، نمک، سیاہ مرچ اور سفید زیرہ ڈال کر سبز مرچ کٹی ہوئی (بیج نکال کر) شامل کریں اور گرم گرم سوپ نوش فرمائیں۔

ویجی ٹیبل گرین سوپ

اشیاء

یخنی	دو کپ
پالک کتری ہوئی	آدھا کپ
کھیرا باریک کٹا ہوا	ایک عدد
سلاد کتری ہوئی	آدھا کپ
ٹماٹر گودا	دو عدد
سویا سوس	ایک چائے کا چمچ
سیاہ مرچ ثابت موٹی کوٹ لیں	چھ عدد
نمک	حسب ذائقہ
گرم مسالا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ

ترکیب

تمام سبزیوں کو دو پیالی پانی ڈال کر ابلنے کے لئے رکھ دیں سبزیاں ابل جائیں اور پانی ایک پیالی رہ جائے تو یخنی ملا دیں ساتھ ہی ساتھ نمک اور سیاہ مرچ موٹی موٹی کٹی ہوئی شامل کر دیں، آپ کی پسند کے مطابق سوپ گاڑھا ہو جائے تو سویا سوس بھی ملا کر گرم مسالا چھڑکیں اور پیش کریں۔

لذیذ چائنیز سوپ

اشیاء

یخنی	چار پیالی
انڈا	ایک عدد
سویا سوس	دو کھانے کے چمچ
انگور کی بیل کے خشک پتے (پاؤڈر بنا لیں)	چار چائے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
سیاہ مرچ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچ

ترکیب

ابلتی ہوئی یخنی میں سیاہ مرچ اور نمک حسب ذائقہ ملا دیں، انڈے کو اس قدر پھینٹیں کہ اس کا جھاگ ابھر آئے اب اسے کھولتی ہوئی یخنی میں دھار باندھ کر آہستہ آہستہ ملا دیں اور سیٹ ہونے دیں پھر چمچہ سے ہلائیں سوپ کے پیالے میں تیار شدہ سوپ انڈیلیں اس میں سویا ساس ملائیں اور انگور کے پتوں کا پاؤڈر ڈال کر نوش فرمائیں۔

☆☆☆

کس قیامت کے یہ نامے

فوزیہ شفیق

السلام علیکم!

بہت سی خوشیوں، کامیابیوں، ناکامیوں اور آرزو کو اپنے دامن میں سمیٹے ایک اور سال اپنے اختتام کی طرف رواں دواں ہے۔

سوچنے بیٹھیں تو ابھی کل کی بات تھی کہ دو ہزار پندرہ کا آغاز ہوا تھا اور آج سال کا آخری مہینہ دسمبر آ پہنچا۔

ابھی تو بہت سے کام ادھورے پڑے ہیں جو کہ کرنے تھے ابھی تو ناراض دوستوں کو منانا تھا، کچھ کے لاڈ اٹھانے تھے اور بہت سے پیاروں کے مان بھرے شکوں کو مٹانا تھا، ابھی تو کچھ بچھڑے جان نثاروں کو ڈھونڈ کر عمر رفتہ کو آواز دینی تھی، آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں اس ہفتے نہیں اگلے ہفتے ابھی بہت وقت پڑا ہے، کرلیں گے، یہی کرتے کرتے تین سو پینسٹھ دن گزر گئے۔

ابھی تو سامنے کی دیوار پر لگے ان گزرتے بارہ ماہ کے اعداد شمار بتانے والے کلینڈر کی تازگی بھی ماند نہیں پڑی کہ سال کے اختتام کا گھنٹہ بج گیا، یوں لگتا ہے وقت کو جیسے پر لگ گئے ہوں، تیزی سے گزرتا یہ وقت ہی انسان کی سب سے قیمتی متاع ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ حضرت انسان اس قیمتی متاع سے ہی سب سے زیادہ غافل ہے، جبکہ ہم یہ جانتے بھی ہیں کہ اس کے لئے ایک دن جواب دہ ہونا پڑے گا، کہ ہم نے وقت کن کاموں میں صرف کیا۔

خوب سے خوب تر کی تلاش انسان کو دوڑائے رکھتی ہے اور اس تگ و دو میں انسان یہ بھول جاتا ہے کہ اس کے ہاتھ کیا پھسلتا جارہا ہے، زندگی کتنی بھی طویل کیوں نہ ہو، پیچھے مڑ کر دیکھو تو خواب لگتی ہے، اس بھاگتی دوڑتی زندگی میں کچھ بھی مستقل نہیں ہاں یہ طے ہے اختتام اٹل ہے اور مہلت جو دی ہے اس کا حساب کتاب بھی ایک بامقصد زندگی اور اچھے اعمال ہی روشنی ہے، ورنہ انسان تو خسارے میں ہی ہے۔

آیئے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کریں کہ وہ ہمیں بامقصد اور صالح زندگی گزارنے کی توفیق عطا کرے آمین یارب العالمین۔

اپنا بہت سا خیال رکھیئے گا اور ان کا بھی جو آپ کا خیال رکھتے ہیں، جو آپ سے محبت کرتے ہیں۔

چلیں اب آپ کے خطوط کی محفل میں چلتے ہیں حسب عادت درود شریف، کلمہ طیبہ اور استغفار کا ورد کرتے ہوئے۔

یہ پہلا خط ہمیں چیچہ وطنی سے آمنہ سیماب کا موصول ہوا ہے وہ لکھتی ہیں۔

نومبر کا شمارہ سات تاریخ کو خوبصورت سرورق سے سجا ملا، مہرین سید نے اپنی سحر انگیز شخصیت کی بدولت ٹائٹل کو چار چاند لگا دیئے، ''کچھ باتیں ہماریاں'' میں سردار صاحب نے وقت کی ضرورت کے مطابق بہت اچھی باتیں کی، حمد و نعت اور پیارے نبی کی پیاری باتیں حنا کا بہترین سلسلہ ہے یقیناً جس کام کے شروع میں اللہ کا نام لیا جائے وہ بہترین ہوتا ہے، انشاء

جی ''کچھ حسب حال'' کے ساتھ موجود تھے، باخدا ان کا لکھا ہوا ایک ایک لفظ موجودہ حالات کی عکاسی کر رہا تھا، ''ایک دن حنا کے ساتھ'' میں مبشرہ انصاری صاحبہ کی روداد سنی، معذرت کے ساتھ نہ جانے کیوں وہ کچھ کچھ خود پسند سی لگیں، خیر آگے بڑھے ''پربت کے اس پار کہیں'' پہنچے اس امید کے ساتھ کہ شاید نایاب جیلانی اپنی مخصوص انداز تحریر کے ساتھ مل جائے، مگر نہ جی وہی سفر نامے کا انداز، کہانی پڑھتے وقت کوئی مزہ نہیں آیا یہ میں ہی نہیں اور بہت سے لوگ بھی کہتے ہیں۔

پلیز نایاب جی کچھ نیا پن اور اپنا مخصوص انداز لائیں ناول میں، ام ایمان کا ناول ''اندھیرے چھٹ گئے'' بے حد پسند آیا، ام ایمان مبارک باد قبول کریں، حنا میں ہم آپ کی مزید تحریروں کے منتظر رہیں گے، اب بات ہو جائے فاطمہ خان کے ناول ''ہارے بھی تو بازی مات نہیں'' فاطمہ خان کا نام اس سے پہلے دیکھنے کو نہیں ملا، اگر یہ ان کی پہلی تحریر تھی تو بے حد اچھی تھی، اگرچہ ناول میں کہیں کہیں تحریر گرفت سے باہر تھی مگر اس کے باوجود دلچسپی برقرار رہی، لیکن کیا تھا کہ مصنفہ ریحام کو اگر زندہ رہنے دیتی اور حسن کی زندگی میں خوشیاں بکھیر دیتیں، ہما راؤ کے ناولٹ کا آخری حصہ پسند آیا، اس ناولٹ کا اینڈ ہما نے ویسا ہی کیا جیسا ہما راؤ کا انداز تھا یعنی ہپی ہپی، ونڈر فل ہما آپ کی مزید تحریروں کا انتظار رہے گا۔

سدرۃ المنتہیٰ کے ناول ''اک جہاں اور ہے'' میں پہنچے، پڑھتے ہوئے نظر اس مراسلے پر پڑی جس میں سدرۃ المنتہیٰ کے والد صاحب کے انتقال کی خبر تھی، بے حد افسوس ہوا دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ سدرۃ المنتہیٰ کے والد کو جنت میں اعلیٰ مقام دے اور سدرۃ کے گھر والوں کو صبر جمیل عطا کرے بلاشبہ والدین ایسی نعمت ہیں جس کا نعم البدل کوئی بھی نہیں، سویرا فلک کا ناولٹ ''تمہاری وفا ہی کافی ہے'' کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکا، افسانوں میں رمشا احمد کا افسانہ ''یہ دل کے رشتے'' اس ماہ کی بہترین تحریر تھی جبکہ کنول ریاض کا افسانہ ''اک عام سی کہانی'' پڑھ کر ایک مرتبہ دل کانپ کر رہ گیا، مصنفہ نے بالکل سچ لکھا ہے کہ لوگ بیٹے کے لئے دعا کرتے اور اصرار کرتے ہیں جیسے یہ بہو کے بس میں ہو، اسی لئے تو بزرگوں کا کہا کہ اولاد کے لئے جب بھی دعا مانگو اس کی صحت و سلامتی اور مکمل اعضاء کے ساتھ دنیا میں آنے کی مانگو، ثمین کرن کا افسانہ ''کمبل'' بھی بہترین تھا۔

نورین شاہد کی تحریر ''ہلکی سی مسکراہٹ'' پڑھ کر بے حد مزہ آیا، حنا اصغر کا افسانہ بھی پسند آیا، مستقل سلسلے بھی بہترین تھے، حاصل مطالعہ میں قارئین کے بہترین ذوق کا آئینہ دار تھا جبکہ میری ڈائری اور بیاض میں انتخاب بہتر تن تھا، رنگ حنا نے ہمیشہ کی طرح مسکراہٹوں کے پھول بکھیرے، انعم طارق حنا کے دستر خوان میں اپنے بہترین سگھڑاپے کا مظاہرہ کیا، کس قیامت کے یہ نامے میں ہمیشہ کی طرح فوزیہ آپی مسکراتی ہوئی سب کو ویلکم کہتی ملیں، خطوط کے صفحات اگرچہ کم ہوتے ہیں مگر جتنے بھی ہوں مزہ آتا ہے اس سلسلے کو پڑھ کر۔

آمنہ سیماب خوش آمدید دل و جان سے اس محفل میں، نومبر کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ آپ سب دوستوں کی یہ محبتیں ہی ہمارا حوصلہ بڑھاتی ہیں اور ہم حنا کو مزید بہتر بنانے کی کوششوں میں لگ جاتے ہیں، آپ کی تعریف و تنقید اس سطور کے ذریعے مصنفین کو پہنچائی جا

رہی ہیں، اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیے گا، ہم آئندہ بھی آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے شکریہ۔

رابعہ انور: سرگودھا سے آئیں ہیں وہ اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کر رہی ہیں۔

فوزیہ آپی میں ایک عرصے سے حنا کی قاری ہوں اکثر سوچتی تھی کہ میں بھی نامے کی اس محفل میں شرکت کروں مگر بس سوچ کر رہ جاتی تھی، اس مرتبہ مجھے سدرۃ المنتہیٰ کے والد صاحب کی وفات کی خبر نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا، یقین کریں سدرۃ المنتہیٰ آپ کے والد کے بارے میں پڑھ کر مجھے بے حد افسوس ہوا آپ میری پسندیدہ مصنفہ ہیں، آپ کا دکھ مجھے اپنا دکھ محسوس ہوا میں آپ کے لئے بہت زیادہ دعا گو ہوں کہ اللہ پاک آپ کو دکھ کے ان لمحوں میں ہمت اور صبر عطا کرے، اللہ کی رضا کے سامنے ہم سب سر تسلیم خم ہیں اللہ پاک انکل کو جنت میں بہترین جگہ عطا کرے آمین۔

اب آپی حنا کی تحریروں کے مطلق بھی بات کر لوں اس ماہ یعنی نومبر کے شمارے کی بہترین تحریر فاطمہ خان کا مکمل ناول ''ہارے بھی تو بازی مات نہیں'' تھا، بہت خوب فاطمہ آپ نے بے حد اچھی تحریر لکھی آخر میں آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے ریحام کی موت پر، ساری کہانی آرمی والوں کی محبت میں ڈوب کر لکھی گئی تھی، یقیناً فاطمہ خان حنا میں اچھا اضافہ ہیں، ام ایمان کا مکمل ناول بھی بہترین تھا بس اس کا عنوان کچھ خاص نہیں تھا ورنہ اس کی اسٹوری بہترین تھی، سویرا فلک اور ہماراؤ کا ناولٹ بھی پسند آیا، جبکہ افسانے بھی اچھے تھے سلسلے وار ناولوں میں سدرۃ المنتہیٰ کے ناول کی تو کیا ہی بات ہے ایک ایک لفظ دل میں اتر تا ہے، جبکہ نایاب جیلانی بھی بہترین لکھ رہی ہیں، مستقل سلسلے سبھی بہترین تھے، آپی حنا کی مصنفین میں طیبہ ہاشمی، عقیلہ ہاشمی، صائمہ محبوب، مناہل بٹ، شمع جبیں وغیرہ کدھر غائب ہیں ایک عرصہ ہو گیا ان نے حنا میں حاضری نہیں لگائی۔

رابعہ انور خوش آمدید ڈیئر آپ نے اتنا عرصہ کیوں سوچتی رہی شرکت کے لئے، جبکہ ہم بار بار کہتے ہیں کہ یہ آپ سب کا اپنا ماہنامہ ہے اس میں آپ سب بلا جھجک چلے آیا کریں، آپ کے جذبات سدرۃ المنتہیٰ تک ان سطور کے ذریعے پہنچائے جا رہے ہیں، حنا کو پسند کرنے کا شکریہ اپنی رائے اور محبتوں سے حنا کو نوازتی رہیے گا ہم منتظر رہیں گے شکریہ۔

عابد محمود: ایک عرصے بعد اس محفل میں شرکت کے لئے آئے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

نومبر کا شمارہ عمدہ سرورق کے ساتھ سجا ملا انکل سردار محمود کی باتیں ہمارے لئے لمحہ فکریہ ہیں کاش ہم لوگ ان باتوں پر عمل کر سکیں، حمد و نعت اور پیارے نبی کی باتیں پڑھ کر روحانی پاکیزگی حاصل ہوئی، ایک دن حنا کے ساتھ میں مبشرہ انصاری سے ملاقات خوب رہی۔

طویل تحریروں میں ''پربت کے اس پار کہیں'' نایاب جیلانی، ''اک جہان اور ہے'' سدرۃ المنتہیٰ، ''ہارے بھی تو بازی مات نہیں'' فاطمہ خان، ''بچھڑنا بھی ضروری تھا'' ہماراؤ بے حد پسند آئیں ان کے رائٹرز کو مبارکباد پیش کرتا ہوں، معروف رائٹر سدرۃ المنتہیٰ کے والد فیاض احمد شاہ کی ناگہانی موت پر انتہائی دکھ ہوا اللہ سائیں مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں رکھے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔

کالم کس قیامت کے یہ ناموں میں آپی فوزیہ نے ٹھیک ہی تو کہا ہے کہ نفرت اور تعصب

کی آندھی نے انسانی قدروں کو پامال کر دیا ہے، کاش لوگ آپس میں اخوت، رواداری اور محبتوں کو فروغ دیں تو معاشرے کی ناہمواریاں ختم ہو جائیں۔

بھائی عابد محمود خوش آمدید ایک طویل وقفے کے بعد آپ نے اس محفل کو رونق بخشی، حنا کو پسند کرنے کا شکریہ آپ کی رائے مصنفین کو پہنچائی جا رہی ہے، شکریہ قبول کریں ان کی طرف سے بھی، مستقل سلسلوں میں آپ کا انتخاب دیر سے موصول ہونے کی وجہ سے شائع نہیں ہو سکا انشاء اللہ اگلے ماہ شائع کریں گے، اپنی قیمتی رائے سے آگاہ کرتے رہا کریں شکریہ۔

فرزانہ علی بیگ اپنے مختصر سے تبصرہ کے ساتھ حاضر ہوئیں ہیں وہ لکھتی ہیں۔

ماہ نومبر کا شمارہ ملا سرورق بہت ہی پیارا تھا، مگر نومبر کے حنا میں آپ نے کوئی تحریر نہ لگا کر اس قدر مایوسی ہوئی کہ کیا بتاؤں، مگر پھر یہ سوچا کہ مایوسی گناہ ہے اور پھر حنا میں اپنی تحریروں کے ساتھ حاضر ہیں باقی تمام سلسلے بھی لاجواب تھے، پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں ایمان افروز تھیں، انشاء نامہ کچھ حسب حال لاجواب تھا افسانوں میں ہلکی سی مسکراہٹ محبت ایک روشن دیا اچھے تھے، سلسلے وار ناول ''پربت کے اس پار کہیں'' اچھا لگا، ناولٹ ''تمہاری وفا ہی کافی ہے'' اچھا تھا، سارہ حیدر کا اشعار بہت اچھا تھا، حاصل مطالعہ میں عالیہ بٹ کی تحریر بہت پسند آئی، عین غین کی محفل میں آسیہ فرید کا سوال اچھا رہا پورا شمارہ قابل تعریف تھا، اس کے ساتھ ہی اجازت دیں۔

فرزانہ بیگ خوش آمدید، ہمیں افسوس ہے کہ نومبر کے شمارے میں آپ کو اپنی کوئی تحریر نظر نہ آئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی مستقل سلسلوں کے لئے آپ کی تحریریں دیر سے موصول ہونے کی وجہ سے رہ جاتی ہیں، لیکن ہم ضائع نہیں کرتے، انشاء اللہ اگلے ماہ شائع کریں گے، حنا کے لئے پسندیدگی کے لئے شکریہ۔

سیدہ فاطمہ عروج: کی ای میل ملتان سے موصول ہوئی ہے وہ لکھتی ہیں۔

پہلی مرتبہ کسی ماہنامے میں اپنی رائے کا اظہار کر رہی ہوں، ماہنامہ حنا کا شمار لاہور سے شائع ہونے والے ماہناموں میں سے بہترین ہے، نومبر کے شمارے میں سبھی مصنفین کی تحریریں پسند آئیں۔

حنا کی خاص بات اس کی ای میل سروس ہے جس میں جب بھی میل کرو فوراً ریپلائی ملتا ہے اس کے علاوہ حنا میں شرکت کرنے کے لئے اگر کچھ پوچھا جائے تو بے اچھی رہنمائی کی جاتی ہے، دعا گو ہوں کہ اللہ پاک حنا کو مزید کامیابیوں سے نوازے آمین۔

سیدہ فاطمہ عروج خوش آمدید، ماہنامہ حنا کو پسند کرنے کا شکریہ، آئندہ ہم آپ کی تفصیلی رائے کے منتظر رہیں گے شکریہ۔

☆☆☆

(نوٹ)

نومبر کے شمارے میں پیاری بہن سدرۃ المنتہٰی کے والد فیاض احمد شاہ صاحب کی وفات کی خبر شائع ہوئی، بہت سی بہنوں نے ہمیں فون ای میل اور خطوط کے ذریعے سدرۃ المنتہٰی سے دکھ اور افسوس کا اظہار کیا، صفحات کی کمی کی بناء پر ہم سب کے مراسلے شائع نہیں کر سکے لیکن ان کے جذبات ہم سدرۃ المنتہٰی تک ان صفحات کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔